مقالاتِ حجۃ الاسلام

مجموعہ تالیفات

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ

جلد ۱۷

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(0322-6180738, 061-4519240)

مقالاتِ
حجۃ الاسلام
جلد 17

مجموعہ تالیفات

سیدنا الامام الکبیر آیۃ من آیات اللہ قاسم العلوم والخیرات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ

۱۲۴۸ھ تا ۱۲۹۷ھ

بانی دارالعلوم دیوبند

مرتب

قاری محمد اسحاق

(مدیر ماہنامہ "محاسن اسلام" ملتان)

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان 0322-6180738

مقالاتِ حجۃ الاسلام جلد 17

تاریخ اشاعت..................ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ
ناشر..................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..................ساؤتھ پنجاب پرنٹنگ پریس، ملتان
بائنڈنگ..................ابوذر بک بائنڈنگ.....ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کا کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور	دارالاشاعت.........اُردو بازار.........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.........اردو بازار.....لاہور	قرآن محل.....کمیٹی چوک.....راولپنڈی
مکتبہ رحمانیہ.........اُردو بازار .... لاہور	مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار......پشاور
اسلامی کتاب گھر.....خیابان سرسید.....راولپنڈی	مکتبہ اسلامیہ.....امین پور بازار.....فیصل آباد
اسلامک بک کمپنی.....امین پور بازار.....فیصل آباد	ممتاز کتب خانہ.....قصہ خوانی بازار.....پشاور
مکتبہ رشیدیہ.....سرکی روڈ.....کوئٹہ	مکتبہ ماجدیہ.....سرکی روڈ.....کوئٹہ
مکتبۃ الشیخ.....بہادر آباد.....کراچی	مکتبہ عمر فاروق.....شاہ فیصل کالونی.....کراچی
والی کتاب گھر...گوجرانوالہ...مکتبہ علمیہ...اکوڑہ خٹک	مکتبہ نعمانیہ...گوجرانوالہ...اسلامی کتاب گھر...ایبٹ آباد

الامام محمد قاسم النانوتوی ریسرچ لائبریری مردان: 0341-9164891

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

اِجمالی فہرست

1	جمالِ قاسمی	5
2	آخری مکتوب	30
3	چند اہم تاریخی مکتوبات	34
4	مکتوبات قاسمی عکس	53
5	چند اہم مضامین	114
6	سند حدیث	142
7	حجۃ الاسلام رحمہ اللہ کی عالمی خدمات	155
8	نگارشاتِ اکابر سے چند مضامین	213
9	چند ملفوظات وواقعات از حکیم الامت رحمہ اللہ	309
10	چند واقعات از حکیم الاسلام رحمہ اللہ	347
11	حجۃ الاسلام بحیثیت محدث وفقیہ	371
12	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی وجودی فکر	380
13	انگریزی تالیف سے چند صفحات (از ڈاکٹر عاطف سہیل صدیقی)	390

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم
صل على محمد وعلى آل محمد
كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
إنك حميد مجيد

اللهم
بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
إنك حميد مجيد

جمالِ قاسمی

اضافہ عنوانات

مولانا مدثر جمال تونسوی

حرف ابتداء

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کا نام نامی دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے ہر شخص جانتا ہوگا لیکن آپ کی علمی خصوصیات سے غالباً تمام علماء بھی واقعی طور پر باخبر نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکیمانہ ذہن اور عمیق علم عطا فرمایا تھا۔ آپ کے علمی مقام پر ایک غیر جانبدار اور نہایت ثقہ عالم حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی گولڑوی قدس سرہٗ کا شہادت سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اور تبصرہ ہو۔ جب حضرت پیر صاحب سے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سوال کیا گیا تو پیر صاحب کا جواب تھا:

''وہ حضرتِ حق کی صفتِ علم کے مظہرِ اَتم تھے''۔

(حکایات مہر و وفا، سید نفیس الحسینی)

''جمالِ قاسمی'' حضرت قدس سرہٗ کے دو خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے مولانا جمال الدین دہلوی کے نام تحریر کیے تھے۔ پہلے خط کا موضوع مسئلہ ''وحدت الوجود'' ہے۔ جبکہ دوسرے خط کا موضوع مسئلہ ''سماعِ اَموات'' ہے۔

اور اسی کے ضمن میں حیات انبیاء علیہم السلام پر بھی گفتگو فرمائی ہے۔ مولانا کے یہ

دونوں خطوط علم وحکمت کا خزینہ ہیں آپ نے ان موضوعات پر بھی اپنے خاص علمی انداز سے بحث فرمائی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع، پُر مغز اور تسلی بخش ہے۔ ان خطوط کے ملاحظہ سے درج بالا دونوں مسائل میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا اپنا مسلک و مزاج بھی پوری صراحت سے آشکارا ہو رہا ہے جو مطالعہ کنندگان پر خود واضح ہو جائے گا تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ حضرت حجۃ الاسلام قدس سرہٗ کے یہ دونوں خطوط آپ کی وفات کے بعد خود مرسل الیہ مولانا جمال الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کئے اور خود ہی اس کا نام ''جمالِ قاسمی'' تجویز کیا۔ بندہ نے اصل کتاب کو جوں کا توں رکھ کر صرف عنوانات کا اضافہ کیا ہے اور مسلسل عبارت کو پیراگرافوں میں تقسیم کردیا ہے کیونکہ مسلسل مضمون کے سمجھنے اور اسے قابو کرنے میں خاصی دُشواری ہوتی ہے۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کی چند ادق کتابوں کو چھوڑ کر دیگر کتب ایسی نہیں جو تھوڑی بہت محنت اور لگن سے ''قابل فہم'' نہ ہوں۔ منطق وفلسفہ کی مشکل و پیچیدہ کتب کے حل پر جتنی توجہ دی جاتی ہے اگر اتنی توجہ حضرت قدس سرہٗ کی کتب کی تفہیم و تعلیم پر صرف کی جائے تو اس کے بہت اچھے اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئیں گے اور اس سے حضرت قدس سرہٗ کے مآثر علمیہ و معارف حکمیہ کا احیاء بھی ہوگا جو ہم سب منتسبین دیوبند پر قرض ہے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے اس سلسلے میں اپنی محنت کا آغاز کردیا ہے، جس کا ایک مرحلہ ''تصانیف قاسمیہ'' کی جدید و اعلیٰ پیمانے پر ترویج و اشاعت کا اہتمام کرنا بھی ہے، آپ کی خدمت میں پیش کردہ کتاب ''جمال قاسمی'' مع اضافہ عنوانات، اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شامل حال رہی تو ان شاء اللہ حضرت قدس سرہٗ کی دیگر تالیفات بھی جدید پیرائے میں پیش کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ

واللہ الموفق للاتمام التکمیل مدثر جمال تونسوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ الذی اھتدی والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد المصطفیٰ و علیٰ آلہٖ و اصحابہ المجتبیٰ.

اس کے بعد اخلاص آئین فقیر مسکین محمد جمال الدین دہلوی علوی تجاوز اللّٰہ تعالیٰ عن ذنوبہ الجلی والخفی عرض کرتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مخلص محب بزرگ مشفق برگزیدہ مولوی حافظ حاجی محمد قاسم صاحب صدیقی نانوتوی حنفی چشتی مرحوم زمانہ کے امامِ حدیث ہونے کے سوا تصوف میں صوفی صافی، فقیر کے نام کے جو خطوط اُن کے لکھے ہوئے تھے ان کی موجودگی کے استغنائی سے بے احتیاطی نے تلف کردیئے اور جو فقیر کی معرفت اکثر خطوط گئے اسی وجہ سے نقل نہ ہوئے۔

آخر سو رسائل ہندسہ، ہیئت فلاحت طبیعی، جبر و مقابلہ، جرثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی۔ بار بار تقریباً مہینے بھر تک مولوی صاحب اصرار کئے گئے کہ ہر رسالہ کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگایئے کیوں کہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں، فقیر نے اس سبب سے کہ یادگار ضرور کم از کم سو جزو سے بڑھ جاوے گی تو بوجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جاوے گی قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی اس باعث یہ کام ناتمام رہا۔ مدت کے بعد ان کے امراض کی ترقی کی حالت میں وحدۃ الوجود اور سماعِ اموات کا اثبات جس کے اظہار سے بھجوائے:

حیف باشد ایں سخن در گوش عام   طوطیا در چشم نابینا کہ کرد

عوام سے چھپایا کرتے تھے بمشکل خطوط کے ذریعہ سے قلم کو رخصت دے کر لکھوا ہی لیا اور آخر عمر کی اس آخری تحریر کی کسی کو خبر نہ ہوئی ۱۲۹۰ھ میں فقیر نے اُن کے شاگرد مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی مدرس دیوبند وغیرہ کو اشاعت کی اُمید پر نقل دے دی وعدہ وفا نہ ہوا بہت انتظار کے بعد فقیر نے اپنے رسالہ جمال العارفین کے آخر میں اس کے چھپوانے کا وعدہ کرلیا تھا، سو بفضلہٖ تعالیٰ اب اسے پورا کرتا ہوں، اس کی تاریخ ''آفتاب'' ضیاء ۱۲۹۵ھ'' اور ''جمال قاسمی'' سے اسے نامزد کر کے اپنے خاتمہ بالخیر کی استدعا کرتا ہوں، گو ایسے مضامین اور ایسوں کی لڑی کے قابل اپنے آپ کو نہیں جانتا مگر آخر پتے پھولوں کے اور سوت موتیوں اور مصری کے کوزوں کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ رہتے ہیں۔ عجب نہیں کہ ایسوں کے نام کے ساتھ نام رہنے سے یہ نامہ سیاہ بھی ہمیشگی کے ساتھ مستحق ہو جاوے اور اتحاد قدیم کی وجہ سے المرء مع من احبّ کا مورد بن جائے۔

پہلا مکتوب

مخدوم و مطاعِ نیازمندان، حامیٔ دین، سلالۂ خاندانِ نبوت

جناب مولوی سید محمد جمال الدین شاہ صاحب مدظلکم!

یہ آپ کا نیازمند محمد قاسم سلام مسنون عرض کرتا ہے، اور یہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی اوّل اس تحریر کے باعث ہوئے، آپ ہی کو نقل کرانے کے لئے عرض کرتا ہوں۔

وحدت الوجود کا عوام وخواص کے ہاں مطلب

مخدوم من! لفظِ وحدۃ الوجود یوں تو ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ پَر اس ایک لفظ کو دیکھا تو باعتبارِ مذاق اور نیز باعتبارِ فہم کہیں اس لفظ کے کچھ معنی ہیں، کہیں کچھ معنی ہیں۔ اہلِ حال اور جو اُن کے کلام کو بے سوچے سمجھے تصدیق کرتے ہیں، وہ تو وحدۃ الوجود بولتے ہیں اور وحدتِ موجودات مراد لیتے ہیں اور جو لوگ الفاظ سے موافق ہدایت دلالت وضعی، معانی تک پہنچتے ہیں اُن کے یہ معنی کب پسند

آئیں گے۔ وہ تو وحدتِ وجود سے وحدتِ صفتِ وجود ہی مراد لیں گے۔ وحدتِ موجودات یعنی موصوفات بالوجود ہرگز اس لفظ سے نہیں سمجھ سکتے۔

وحدتِ موجودات حال اور وحدتِ وجود حقیقت الحال

جب یہ بات ذہن نشین خدام والا مقام ہو چکی تو اب اس نیاز مند کی بھی سُنئے۔ وحدت موجودات تو حال ہے اور وحدۃ وجود حقیقۃ الحال، اوّل فقط شہود اور مشاہدہ حالی سے متعلق ہے واقعیت سے اُس کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لئے اس وحدۃ وجود کو اگر وحدۃ شہود کہئے تو بجا ہے، اور وحدۃ وجود بمعنی اتحادِ صفتِ وجود اَمر واقعی خارجی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ تو اُن لوگوں کا کام ہے جو مغلوب الحال نہیں، حال اُن پر غالب نہیں اور اس لئے اُن کو ''ابن الحال'' نہیں کہہ سکتے، خطاب ''ابوالحال'' اُن کو مناسب ہے۔ پَر براہِ استدلال ہم سے خستہ حال بھی اس مضمون تک پہنچ سکتے ہیں۔

صفات کا پھیلاؤ اور اِتصاف کی دو قسمیں

اس نارسائی پر اتنی رسائی تو ہم سے گناہ گاروں کو بھی حاصل ہے کہ تمام صفات کا پھیلاؤ عالم میں بطورِ عروض ہے۔ شرح اس معما کی یہ ہے کہ اتصاف کی کل دو صورتیں ہیں۔

قسمِ اوّل، صفت خانہ زاد ہو

ایک تو یہ کہ صفت اپنے موصوف سے صادر ہو اور اُس کا موصوف اس کے حق میں ''مصدر'' ہو یعنی صفتِ مذکورہ موصوفِ مذکور کے حق میں عطاءِ غیر نہ ہو بلکہ ''خانہ زاد'' ہو۔ مثلاً جیسے مظاہرِ حرارتِ آتش اور نورِ آفتاب، آتش اور آفتاب کے حق میں صفتِ خانہ زاد اور اُنہیں سے صادر نظر آتے ہیں۔

عالم اسباب میں کوئی سبب ایسا نظر نہیں آتا جو آفتاب اور آتش کے حق میں اسی طرح واسطۂ حصولِ نور و حرارت ہو جیسے آفتاب و آتش، زمین و آبِ گرم وغیرہما کے حق میں واسطہ حصولِ نور و حرارت ہو جاتے ہیں۔

قسم دوم، صفت خانہ زاد نہ ہو

دوسری یہ صورت ہے کہ صفت اپنے موصوف پر خارج سے آکر واقع ہوئی ہو، وہ صفت اس موصوف کے حق میں صفتِ خانہ زاد نہ ہو بلکہ عطاءِ غیر ہو۔ اِس قسم کو عرض کہیے تو بجا ہے اوراس وقوع صفت کو عروض کہیے تو زیبا ہے۔

مصدرِ صفت ایک ہی ہوتا ہے

اور میں نے جو یہ عرض کیا تھا کہ صفات کا پھیلاؤ عروض سے ہوتا ہے اُس عروض سے یہی عروض مراد تھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مصدرِ صفت تو ایک ہی ہوتا ہے اور اُسی کو موصوف بالذات اور موصوفِ اوّل اور موصوفِ حقیقی بھی کہنا چاہیے۔ اگر اُس کی وحدت ضروری نہ ہو تو خدا کی وحدانیت بھی ضروری نہیں ہو سکتی۔

خدا کسے کہتے ہیں؟

مطلب یہ کہ خدا اُس ذات پاک کو کہتے ہیں کہ خود مصدرِ وجود ہو اور سوا اُس کے اوروں کا وجود اُس کی عطاء ہو، اُس سے صادر ہوکر اوروں پر واقع ہوا ہو۔ سو اگر مصدرِ وصف کی وحدۃ بحیثیت مصدریت ضروری نہ ہوا کرے اور مقتضائے ذات مصدر وحدت نہ ہو تو خدا کی وحدانیت بھی ذاتی اور ضروری نہ ہوگی۔ اگر ہوگی تو کسی علت خارجہ کے باعث یہ وحدت اور وحدانیت ہوگی اور ظاہر ہے کہ جو وصف کسی علت خارجہ کے باعث ہوا کرتا ہے۔ وہ وصف موصوف کے حق میں وصفِ ذاتی بمعنی مقتضائے ذات نہیں ہوتا ورنہ علت خارجہ کی ضرورت ہی کیوں ہوتی۔

وصف عرضی معرضِ زوال میں رہتا ہے

بلکہ ایسا وصف بسا اوقات معرضِ زوال میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرارتِ آبِ گرم جو علت خارجہ یعنی آتش کی بدولت اور نورِ زمین جو علت خارجہ یعنی آفتاب کی بدولت حاصل ہوتا ہے اکثر زائل ہو جاتا ہے۔ غرض قیامِ وصف ایسی صورت میں تا

قیامِ علت خارجہ ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ مصدرِ وصف اور موصوف حقیقی وہ علت خارجہ ہوتی ہے۔ سو وحدانیت مصدر وجود یعنی ذات پاک باری تعالیٰ اگر مقتضائے ذاتِ باری نہ ہو تو پھر یہ وحدانیت کسی اور علت کا فیض ہوگا اور وہی موصوف حقیقی، یا یہ وحدت ہوگی خدا کی وحدانیت حقیقی اور ذاتی نہ ہوگی۔

ایک وصف کے لئے متعدد مصدر نہیں ہو سکتے

علاوہ بریں ایک وصف کے لئے متعدد مصدر بمعنی مذکور ہو سکیں تو اُن کا تعدد ایک حرفِ غلط ہو جائے۔ آخر اس قدر تو بدیہی ہے کہ جب صدور مانا تو اوّل صادر کو مصدر میں ماننا پڑے گا پھر جب ایک صادر ہے اور دو مصدر ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ دونوں وصف صادر کے لئے ایسے ہیں جیسا پانی کا منبع پانی کے لئے یعنی وہ دونوں فقط گذرگاہِ وصف مذکور ہیں، وصف مذکور کہیں اور سے آتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے نکل کر باہر چلا جاتا ہے، اس صورت میں تو وہ دونوں مصدر حقیقی نہ ہوئے کیوں کہ اس صورت میں وصف مذکور اُن کے حق میں ''عطاءِ غیر'' ہوا ''خانہ زاد'' نہ ہوا، اور یہ کہنا پڑے گا کہ اُن دونوں میں تعدد حقیقی نہیں بلکہ جیسا شی واحد کسی کے حساب سے یمین اور کسی کے حساب سے یسار ہو جاتی ہے یہاں بھی تعددِ اعتباری ہے جو باوجود وحدتِ صادریت تعدد ہے۔

وصف صادر واحد ہوگا تو مصدر بھی واحد ہوگا

الحاصل بشرطِ عقل سلیم یہ بات ضروری التسلیم ہے کہ وصفِ صادر واحد ہوگا تو مصدر بھی واحد ہوگا۔

صدور کو خلق پر قیاس کرنا غلط ہے

ہاں خلقِ متعدد، واحدِ حقیقی سے اسی طرح متصور ہے جیسے آفتاب سے موافق اشکال مختلفہ روشن دانوں اور صحن خانوں کی دھوپ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سو

''صدور'' کو ''خلق'' پر قیاس کرنا اپنی غلطی ہے۔ صدور میں اُسی شئی کا وجود ہوتا ہے جو صادر ہوتی ہے اور وقتِ صدور فقط اُس کا ظہور ہوتا ہے اور غیروں کو عطاء کرنا اُس پر موقوف ہوتا ہے اور خلق یعنی پیدا کرنے میں اوّل عدم ہوتا ہے اُس کے بعد وجود کی نوبت آتی ہے ورنہ پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ باقی مثال درکار ہو تو نور آفتاب تو آفتاب سے صادر ہے اسی لئے اوّل آفتاب میں تسلیم کرنا ضرور ہے اور اشکالِ مذکورہ کو آفتاب سے صادر نہیں کہہ سکتے ورنہ اوّل آفتاب میں اُن سب کا ہونا ضرور تھا، ہاں آفتاب کے باعث اشکالِ مذکورہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کی کثرت کی کیا صورت ہے؟

رہی یہ بات کہ اگر یہی بات ہے، تو پھر تکثر صفات باری کی کیا صورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صفات باری سب باہم مترتب ہیں، مساوی المراتب نہیں۔ چنانچہ وجود پر تمام صفات کا توقف بدیہی ہے، اِدھر علم پر اِرادہ کا تعلق موقوف اور قدرۃ و تکوین کا تعلق اِرادہ پر موقوف، اور ظاہر ہے یہ توقف اُسی ترتیب کا ثمرہ ہے۔ اگر باہم ترتب وجودی نہیں تو اس توقف کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں اگر یوں کہئے کہ جو صفات موقوف علیہا ہیں وہ مصدر ہیں اور جو صفات اُن پر موقوف ہیں وہ اُن سے صادر ہیں تو البتہ یہ توقف بھی ضروری ہوگا یعنی جب ایک صفت دوسری صفت کے حق میں ایسی طرح علت وجود ہوئی جیسے جسم سطح کے حق میں تو جیسے سطح کا تعلق کسی چیز کے ساتھ بے تعلق جسم ممکن نہیں ایسے ہی تعلقِ صفتِ معلولہ بے تعلق اُس صفت کے جو علت ہے ممکن نہ ہوگا۔ سو ہم علت اُسی کو کہتے ہیں کہ جو مصدر ہو۔ بالجملہ صفات باہم مترتب ہیں اور اسی لئے ایک دوسرے کے حق میں مصدر ہے، پَر ذات باری خود بے واسطہ مصدر صفت واحدہ وجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات خانہ زاد ہیں

یہ صفت (وجود) بے واسطہ اور سوا اُس کے اور صفات بواسطہ بطورِ مذکور اللہ

تعالیٰ کے حق میں خانہ زاد ہیں اور سوا اُس کے اور جہاں کہیں یہ صفات جلوہ اَفروز ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطاء ہے۔

صفت واحد اور موصوفات کثیر ہو سکتے ہیں، ایک مثال

بالجملہ مصدر وصف تو ایک ہی ہوتا ہے پَر معروض کثیر، اُنہیں کی کثرت صفات کے پھیلاؤ کے حق میں علت ہے۔ اور اس وجہ سے صفات میں وحدۃ ہے اور موصوفات میں تعدد اور کثرت۔ اور اس کی ظاہر مثال جس سے وحدت صفت اور کثرت موصوفات عیاں ہو جائے کشتی کی چال میں سے نکل سکتی ہے۔ یعنی کشتی اگر متحرک ہو تو بالبداہۃ کشتی اور چیز ہے، اور کشتی نشین اور چیز، پھر اُن میں سے بھی میں اور ہوں اور تم اور، زید اور ہے اور عمرو اور، مگر بایں ہمہ یہ بدیہی ہے کہ حرکت ایک ہے۔

غرض صفت ایک ہے اور موصوفات متعدد۔ اتنی بات ہے کہ صفت حرکت ایک طرف حقیقی ہے اور دوسری طرف مجازی، ایک طرف سے صادر ہے اور دوسری طرف وہی واقع۔ یہی وجہ ہے کہ کشتی نشین حرکت، سکون، سرعت، بطوء جہت حرکت، استقامت واستدارت، حرکت وقت و زمان حرکت میں اُس (کشتی) کے تابع ہیں اگر اُس طرف سے یہ وقوع اور یہ عطاء نہ ہوتی تو یہ اتباع بھی نہ ہوتا، استقلال ہوتا۔ سو یہی صورت وجود اور صفات باقیہ میں سمجھ لیجئے۔

صفت وجود واحد اور موجودات متعدد

اس تقریر مختصر سے وحدت وجود بمعنی وحدت صفت وجود بھی واضح ہو گئی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیسے باوجود وحدتِ حرکت متحرک جدا جدا ہیں، کشتی جدا، اور کشتی نشین جدا اور پھر کشتی نشین بھی باہم ایک نہیں جدا جدا ہیں، ایسے ہی واجب الوجود جدا ہے اور ممکن الوجود جدا، اور پھر اُن میں سے بھی میں اور ہوں اور تم اور۔ اور یہ نہ کہیے تو کیا کہیے تمام ہدایتیں غلط ہو جائیں۔

غلبہ محبت میں وحدت شہود بعید نہیں

ہاں اگر غلبہ محبت خداوندی میں اگر یہ سب کارخانہ ایک نظر آئے تو دُور نہیں، یرقان کے وقت تمام رنگ، ہم رنگ نظر آتے ہیں اور سبز سرخ عینک لگا لیجئے تو سب رنگ ایک رنگ ہو جاتے ہیں۔ وجہ اس وحدت شہود کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ قوت باصرہ اجزائے صفراوی اور عینک مذکور میں کو ہو کر نکلتی ہے اور اس لئے اُن کا رنگ قوت باصرہ پر عارض ہو جاتا ہے۔ سو اگر کسی کی محبت تہ دل میں ہو تو اس کی قوت درّاکہ بھی جب کسی چیز پر واقع ہوگی تو لاجرم اس کی قوت درّاکہ کو اس کے محبوب میں سے اسی طرح گذارا ہوگا جیسے قوت باصرہ کو اجزائے صفراوی اور عینک میں کو گذر ہوتا ہے۔ غرض جو چیز تہ دل میں ہوگی وہ بالضرور بہ نسبت قوت ادراکیہ اوروں سے ورے ہوگی اور اس لئے اوروں کی راہ میں واقع ہوگی، اور وقت گذار قوت ادراکیہ اُس محبوب کی شکل جو تہ دل میں ہے قوت ادراکیہ پر عارض ہو جائے گی، اور اس لئے جس چیز پر قوت ادراکیہ واقع ہوگی اُس محبوب کی شکل اُس چیز میں نظر آئے گی۔ مگر ایسی محبت اور کسی محبوب کے ساتھ ممکن ہو کہ نہ ہو۔ پَر خدا کے ساتھ ضرور ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ میں تمام وجوہ محبت کامل طور سے موجود ہیں

اوّل تو جتنی وجوہ محبت ہیں سب اُس میں موجود۔ جمال، کمال، احسان، قرابت۔ مگر قرابت کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ بوسیلۂ توالد وتناسل رشتہ وپیوند ہے۔

نحن اقرب اليه......کا مطلب

بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدلالت ''نحن اقرب اليه من حبل الوريد'' اُس کو قرب حاصل ہے۔ سو جب یہ قرب انتساب جو بوجہ توسط وجود وسبب پیدائش ماں باپ کو اور بنی نوع سے زیادہ حاصل ہے اور سوا اُن کے اور اقرباء کو اُن کے واسطے سے بالواسطہ یہ قرب حاصل ہے۔ اور اس وجہ سے باہم علاقہ محبت ضرور ہے تو وہ قرب جو خدا کو حاصل ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ موجب محبت ہوگا۔

ماں باپ اور اللہ تعالیٰ کے قرب وتوسط میں فرق

کیوں کہ ماں باپ کا توسط تو مثل توسط رنگریز جو کپڑوں کے رنگنے کے وقت ہوتا ہے عادی ہے ضروری نہیں۔ اگر کپڑا ہوا کے باعث خم نیل میں گر جائے تب بھی وہی بات ہے۔ ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی وہی بات تھی جو اور آدمیوں میں ہوتی ہے، اور خدا کا توسط ایسا ہے جیسا خود رنگ کا توسط سفید کپڑے کے رنگین ہونے میں۔ الغرض یہ توسط علت حقیقی ہے جس کو اصطلاحِ اہل معقول میں واسطہ فی العروض کہتے ہیں اور وہ توسط علت مجازی ہے جس کو اُن کی اصطلاح میں واسطہ فی الثبوت کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علت اور اس کے معلول میں ایسا قرب ہوتا ہے جو نور میں اور دُھوپ میں اور جسم میں اور سطح میں۔ جیسے نور اور دھوپ، اور جسم اور سطح میں بوجہ شدتِ قرب اور کمال اتصال کسی اور چیز کی بیچ میں گنجائش نہیں ہوتی ایسے ہی وجود باری اور موجودات ممکنہ میں بوجہ کمال قرب کچھ فاصلہ نہیں ہوتا بلکہ جیسے بایں وجہ کہ دھوپ اور سطح ایک انتہا نور وجسم ہے اور اس وجہ سے اس دونوں (دھوپ اور سطح) کا تعقل اُن دونوں (نور اور جسم) کے تعقل پر موقوف ہے یعنی پہلے اُن (نور اور جسم) کا تعقل ہولے جب کہیں ان (دھوپ اور سطح) کا تعقل ہو۔

ایسے حقائق ممکنہ موجودہ ایک انتہاء وجود ہیں اور اس وجہ سے اُن (حقائق ممکنہ موجودہ) کا تعقل اور تصور اُس (وجود حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ) کے تعقل پر موقوف، اس کے اَوّل اُس کا تعقل اور تصور ہولے جب کہیں ان کا تعقل اور تصور ہو۔ مگر جب یہ ہے تو پھر اگر فرض کرو دھوپ کو عقل عنایت ہو اور وہ اپنے تعقل کے درپے ہو تو اُس کے لئے بھی اَوّل نور کے تعقل کی ضرورت ہوگی، پھر اس کے بعد اپنا تعقل نصیب ہوگا۔ اور اس وجہ سے یہ کہنا پڑے گا کہ راہ علم وتعقل وتصور میں نور مذکور دھوپ سے بہ نسبت دھوپ قریب ہے کیوں کہ اَوّل آتا ہے، اور دھوپ بہ نسبت نور اپنے آپ سے دُور۔ ایسے ہی بوجہٗ مذکور، وجود باری حقائق ممکنہ سے بہ نسبت حقائق ممکنہ نزدیک ہے۔ اور اس لئے

اگر یوں کہئے کہ "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" تو بجا ہے۔

قُربِ والدین موجب محبت ہے تو قربِ الٰہی موجبِ محبت کیوں نہ ہوگا؟

غرض یہ قُرب اس قُرب سے جو والدین کو نصیب ہوا ہے کہیں بڑھ کر جب وہ قرب موجب محبت ہے تو یہ قرب بدرجہ اولیٰ موجب محبت ہوگا۔ الحاصل تمام وجوہِ محبت خدا میں موجود اور پھر ہر وجہ بوجہ اتم۔ اوروں میں اوّل تو تمام وجوہ موجود نہیں اور جو کچھ ہے تو بوجہ اتم نہیں۔ اس لئے اگر نوبت تعلق محبت خدا کے ساتھ آئے تو نہایت شدید ہوگی۔

اور پھر بوجہ قرب مذکور حجاب کی کوئی صورت نہیں۔ ایسے ہی حقائق ممکنہ موجودہ فی الخارج اور وجود باری میں حجاب کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے یہ بھی احتمال نہیں کہ کسی طرح اس محبت پر نظروں سے ٹل جائے پھر اس صورت میں اگر بوجہ غلبہ محبت اس قسم کی بات سرزد ہو جائے جس کی طرف یہ شعر مشیر ہے:

سمایا ہے تو میری نظروں کے آگے　　جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

تو کیا عجب ہے؟

غلبہ محبت میں ایسے الفاظ صادر ہونے پر گرفت کرنا کس کو زیبا ہے اور کس کو نہیں؟

اس پر گرفت اُنہیں کو زیب دیتی ہے جو غلبہ حال یعنی محبت سے آگے نکل گئے ہیں اور حال اور محبت پر غالب آگئے ہیں۔ ہم سے بے مغزوں کو یہ طعن و تشنیع جو کٹھ مُلّا کیا کرتے ہیں زیبا نہیں۔ خطا ہے مگر ہمارے صواب سے بہتر ہے:

ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

وحدت وجود اَمرِ واقعی ہے

الحاصل وحدت موجودات ایک اَمرِ مشہور ہے اَمرِ واقع نہیں، پَر وحدت وجود اَمرِ واقعی ہے۔ ورنہ مثل خدا ہر موجود خدا ہو یعنی جب صفتِ وجودِ ممکنات کو فیض خدا نہ سمجھئے اور اُس (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے صدور اور اُن (ممکنات) کی طرف وقوع نہ مانئے تو ہر ایک

اپنے اپنے وجود میں مستقل ہوگا اور ہر ایک غنی اور مثل خدا، خدا سے مستغنی، چنانچہ ظاہر ہے۔ طبیعت تھک گئی ہے یہ آپ ہی کا لحاظ تھا جو اس ناتوانی میں کچھ اُوپر چار وَرق بعد ظہر کل لکھے تھے اور باقی آج لکھے۔ پسند آنے کی یوں تو اُمید نہیں کہ میں ایک تو کم فہم، دوسرے خستہ جان اور ادھر آپ کی نظروں میں بڑے بڑے کاملوں کے کلام۔ اس لئے یہ استدعا ہے کہ تعمیل ارشاد تو ہو چکی اب اس نامۂ سیاہ کو بعد ملاحظہ آپ واپس فرما دیں۔ اگر بعجہ حسن اخلاق یا حسن ظن رکھنا ہی مدنظر ہو تو جہاں میں نے آپ کی خاطر اس ناتوانی میں سخت جانی کی ہے آپ میری خاطر نقل کی تکلیف اُٹھائیں اور بعد نقل عنایت فرمائیں۔

العبد محمد قاسم

(دوم ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ ہجری روز سہ شنبہ)

دوسرا مکتوب

مخدوم و مخدوم زادۂ آفاق
جناب مولوی سید محمد جمال الدین شاہ صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ!

یہ آپ کا نیاز مند محمد قاسم اوّل سلام مسنون عرض کرتا ہے اور پھر یہ عرض کرتا ہے، چند روز ہوئے آپ کا عنایت نامہ میری سرفرازی کا باعث ہوا، اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس تقصیر تاخیر جواب کا عذر عرض کرتا ہوں۔

ان شاء اللہ تعالیٰ تا مقدور فی الفور جواب نامہ عرض کرتا ہوں۔ جوابِ سوال بن پڑتا یا نہ بن پڑتا پر کیا کروں اُن دنوں یہ خستہ جان مبتلائے بلا تھا، داڑھ کے درد نے ایسا بے تاب و توان کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں۔ اُس کے بعد ناتوانی نے کچھ نہ ہونے دیا۔ وہ کچھ کم ہوئی تھی تو کچھ کچھ اعضاء شکنی اور خفیف سا بخار دم ساز رہنے لگا، ہمت تو آج بھی جواب دیتی ہے مگر کب تک یہ انتظار کی جائے کہ طاقت آئے اور

نقاہت جائے اور میں جواب لکھوں۔ اپنی معلومات ہی کتنی ہے جس کے واسطے اتنا انتظار کیا جائے اور آپ سے انتظار کرائیے جو کچھ ہے ابھی عرض کئے دیتا ہوں۔

سماعِ اموات سے متعلق چند تنبیہات

سماعِ اموات کے قصے میں اوّل تو یہ معروض ہے کہ یہ اَمرِ قدیم سے مختلف فیہ ہے، دوسرے ضروریاتِ دینی اور عقائد ضروریہ میں سے نہیں۔ اس کی تنقیح قرار واقعی تو بعد مرگ ہی معلوم ہوگی۔ اگر بعد مرگ ہم نے اوروں کا سلام و پیام سُن لیا تو سماع نہیں، تو عدمِ سماع متحقق ہو جائے گا۔ علاوہ بریں طرفین میں بڑے بڑے اکابر، اگر ایک طرف میں بالکل ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو بُرا سمجھنا پڑے گا۔ اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔ جب یہ بات گوش گذارِ خدام ہو چکی تو اب آگے سنئے۔

استماعِ اموات ممکن ہے

اپنے خیالِ نارسا کے موافق سمعِ اموات، حدِ اِسماع سے تو پرے ہے، پَر استماعِ اموات ممکن ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے تو **انک لا تسمع الموتٰی** فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اس کے سلام اہل قبور مسنون کر دیا۔ اگر استماع ممکن نہیں تو پھر یہ بے ہودہ حرکت یعنی سلام اہل قبور ملحدوں کی زبان درازی کیلئے کافی ہے۔

اِجمال کی تفصیل

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کبھی آواز میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ بے تکلف ہر صاحبِ سمع اُس کو سُن لیتا ہے اس صورت میں تو سمعِ سامعین حدِ اسماع میں ہوتا ہے اور کبھی بوجہ ضعف آوازِ متکلم سننے والوں کو سر جُھکانے اور کان لگانے کی ضرورت پڑتی ہے اِس صورت میں اصل میں تو سمعِ سامعین حدِ اسماع سے خارج ہوتا ہے پر بعد سر

جھکانے اور کان لگانے کے حد اسماع میں آجاتا ہے۔

اِس لئے اس کو استماع کہیے اور نفی اسماع کی جائے تو بجا ہے کیوں کہ بوجہ ضعف آواز عدم اسماع تو ظاہر ہے مگر سامعین کی طرف سے اہتمام ہو تو اُن کی طرف سے اخذ اور فعل ہوا، اور ظاہر ہے کہ استماع میں بہ نسبت سماع ایک مضمون اخذ ہوتا ہے۔

چنانچہ خواص ابواب کے جاننے والے اور محاورات عرب کے پہچاننے والے ان فرقوں کو خوب جانتے ہیں۔

رُوح کی حیات اور صفات حیات ذاتی ہیں

یہ مقدمہ تو معروض ہو چکا۔ اب آگے چلئے رُوح کی حیات اور صفاتِ حیات یعنی وہ صفات جو حیات پر موقوف ہیں مثل سمع و بصر، اصلی اور ذاتی ہیں یعنی یہ صفات رُوح سے صادر ہوتی ہیں اور عالم اسباب میں اس کے حق میں خانہ زاد ہیں، اور جسم کی حیات اور صفات مذکورہ عرضی ہیں یعنی عطائے رُوح ہیں، رُوح سے صادر ہو کر اُس پر واقع ہوتی ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ حیات جو تمام صفات رُوحانی کی اصل ہے تمام جسم کو محیط ہوتی ہے اور قوت باصرہ اور قوت سامعہ وغیرہ قویٰ خاصہ اعضائے مخصوصہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ مگر ہر چہ باداباد، جو کچھ ہے وہ فیض رُوحانی ہے۔ یہی وجہ ہے جب تک تعلق رُوحانی ہے جب ہی تک حیات جسمانی اور صفات رُوحانی کی بھی جسم میں جلوہ گری ہے ورنہ جیسے قبل تعلق کچھ نہ تھا ایسے ہی بعد انفکاک تعلق بھی کچھ نہیں رہتا۔

تعلق قائم ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد کا فرق

البتہ قبل حدوث تعلق اور بعد انفکاک تعلق میں اتنا فرق ہوتا ہے جیسے قبل محبت اور بعد فراق میں ہوتا ہے یعنی قبل تعلقِ محبت محبوب سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور جب تعلق محبت ہو چکا تو پھر بعد فراق ہر دم محبوب کا دھیان رہتا ہے اور اس لئے اس وقت جتنی محبوب کی خبر ہوتی رہے گی اُتنی قبل تعلقِ محبت ہرگز نہ ہوتی۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ

اب بطور استماع مذکور ادھر سے تلقی اور اخذ رہتا ہے۔

تعلق محبت اور تعلق رُوح میں تشابہ کی وجہ

وجہ اس تشابہ کی تو اسی سے ظاہر ہے کہ رُوح اصل میں ایک عالم علوی کا نور پاک اور جسم اس عالم سفلی کی ایک مشت خاک اور ظاہر ہے کہ: چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ پھر جو موت یعنی فراق جسم خاکی نا گوار ہے تو وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ بوجہ کمال انقیاد و کمال انتفاع طول صحبت رُوح کو جسم خاکی سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمال انقیاد تو اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ رُوح کے اشاروں پر کام کرتا ہے اور بے سوچے سمجھے اطاعت میں سر گرم رہتا ہے اور کمال انتفاع اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ تمام قویٰ رُوحانی بواسطہ اعضائے جسمانی کام کرتے ہیں وہ نہ ہوں تو یہ سب بے کار ہیں، باقی طول صحبت تو خود ظاہر ہے اور اگر طول صحبت بعضے افراد میں نہ ہو تو وہی دو وجہ کافی ہیں۔ اس صورت میں بعد فراق توجہ الی الجسم ضروری ہے اور اس لئے اس کے احوال کی تلقی بقدر امکان قریب الوقوع۔

سماع کا ذریعہ اور سبب کیا ہے؟

جب یہ مقدمہ بھی ذہن نشین ہو چکا تو اصل مطلب سنئے۔ حسب تحقیق اہل عقل سماع احیاء بذریعہ ہوا ہے اور کیوں نہ ہو کوئی دیوار اور چھت اگر بیچ میں حائل ہو جاتی ہے تو بسا اوقات باوجود قرب آواز نہیں پہنچتی اور یوں (یعنی بغیر حائل) دُور دُور تک جاتی ہے پھر جدھر کی ہوا ہوتی ہے اُدھر زیادہ جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ واسطہ وصول آواز متکلم اور موصلِ آواز یہ ہوا ہے مگر چونکہ بظاہر کیفیت وصول یہ ہوتی ہے کہ آواز جو از قسم کیف ہے بمجرد صدور ہوا میں آ جاتی ہے اور جیسے پانی میں ڈھیلا مارنے سے چاروں طرف لہریں اُٹھتی ہوئی چلی جاتی ہیں ایسے ہی بمجرد صدور آواز ہوا میں وہ کیفیت آ کر چاروں طرف کو پھیل جاتی ہے اور اس وجہ سے گوش سامع تک پہنچ

جاتی ہے۔اس لئے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہوا کی یہ لچک کیفیت آواز کو یوں اُڑاتی پھرتی ہے۔اگر یہ لچک ہوا میں نہ ہوتی تو یہ پرواز آواز بھی یوں نہ ہوا کرتی۔

ہوا کی طرح آب وخاک بھی اپنی لچک کے موافق آواز پہنچا سکتے ہیں

مگر یہ ٹھہری تو پھر یہ بھی یقینی ہے کہ آب وخاک بھی اپنی اپنی لچک کے موافق آواز کو پہنچا سکتے ہیں کیوں کہ ان دونوں میں بھی یہ لچک موجود ہے بہت نہیں تھوڑی ہی سہی۔ پانی کا حال تو خود ظاہر ہے، رہی یہ خاک اُس کی لچک درختوں کے نکلنے اور کھونٹوں کے گاڑنے سے آشکارا ہے۔

اگر زمین میں قدر قلیل مضمون سیلان یعنی وہ لچک نہیں ہے تو موٹی موٹی جڑوں اور بڑے بڑے کھونٹوں کی گنجائش کی پھر کیا صورت ہے۔اس لئے یہ ضرور ہے کہ یہ دونوں چیزیں بھی آواز کو تھوڑا بہت پہنچایا کریں۔ادھر اس خیال کو اپنے ادراک کے مطابق پایا بگھیوں کی کھڑ کھڑ کی آواز زمین میں خود محسوس ہوتی ہے۔ یہ احساس بالبداہت اس پر شاہد ہے کہ زمین بھی واسطہ ایصالِ آواز ہے البتہ وہ بات نہیں جو ہوا میں نظر آتی ہے۔القصہ زمین بھی آواز کو پہنچاتی ہے مگر بہت کم۔

موت کے بعد رُوح کا جسم سے تعلق

ادھر بعد مرگ رُوح کو جسم خاکی سے بہت کم علاقہ رہ گیا اور جو کچھ تھا بھی تو جسم مذکور کی شکل وصورت کے بگڑ جانے نے اُس کو اور بھی گھٹا دیا یعنی بعد مرگ وہ علاقہ تسلط تو باقی نہ رہا یہی وجہ ہے کہ بعد مرگ جسم واعضاءِ جسمانی سے روح کچھ کام نہیں لے سکتی۔البتہ علاقہ محبت باقی تھا سو شکل وصورت کے بگڑ جانے نے جو سبب عظیم نفرت ہے اُس محبت کو اور بھی کم کر دیا کیوں کہ نفرت ہوئی تو وہ رغبت کہاں جو محبت کو لازم ہے۔الغرض اِدھر تو رُوح کو جسم سے وہ تعلق ضعیف ہو گیا جو سرمایۂ اِبصار واِسماع تھا اُدھر واسطۂ ایصال بعد دفن آب، خاک ہے جس میں خفیف سی لچک اور قلیل سا

سیلان ہے اس لئے خواہ مخواہ یہی کہنا پڑے گا کہ حد قوت اسماع متکلم سے قوت سامعہ اموات جو بالفعل فقط رُوح کے ساتھ قائم ہے اور جسم سے چنداں تعلق نہیں بَری ہے۔

یہ خفیف تعلق بھی کافی ہے، اسی لئے سلام مسنون ہوا

پَر بایں ہمہ تعلق بھی موجود ہے گوضعیف ہے اور واسطۂ وصولِ آواز میں سیلان اور لچک بھی موجود ہے گوخفیف ہے اس لئے اگر اُدھر سے باوجہ توجہ واقتراب جو محبت مذکورہ کولازم ہے تلقی آواز یعنی استماع ہو تو بعید نہیں اس لئے مناسب یوں ہے کہ قبرستان میں گذرے تو سلام سے دریغ نہ کرے اور بن پڑے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے ورنہ سخت بے مروّتی ہے جو یوں آنکھیں چرائے چلا جاوے۔

اس بارے میں عوام کو کیا تعلیم دی جائے؟

مگر چونکہ محتاج اور مستغنی محتاج الیہ کا پکارنا جدا جدا ہوتا ہے اور عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور متصرف یعنی غنی محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس عُل سے نفع دینی تو کچھ متصور نہیں البتہ قوت مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے اس لئے یوں مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارت قبور تعلیم لیا جائے اور اس سے زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے ورنہ اس علم امکان سے ترقی مدارج تو معلوم کیوں کہ ضروریات دینی میں سے نہیں البتہ مؤاخذہ نقصان مذکورہ کا احتمال ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام

جب یہ سب باتیں نذر خدام ہو چکیں تو اس ذیل میں وہ مضمون بھی عرض کئے دیتا ہوں جو فی الجملہ ماقبل سے مناسب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اَرواح طیبہ کو بعد مرگ بھی وہی تعلق اپنے اجسام سے رہتا ہے جو قبل مرگ تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کے اجساد مثل اجساد احیاء پھوٹتے پھٹتے نہیں چنانچہ احادیث میں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے

ازواج مثل اَزواج احیاء اوروں سے نکاح کرنے کا اختیار نہیں رکھتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے اَموال کو مثل اَموال احیاء اُن کے وارث نہیں کر سکتے۔

چند تعارضات کا جواب

اور اس وجہ سے حدیث لا نورث کو معارض آیت یوصیکم اللّٰہ، اور آیت لا تنکحوا ازواجه من بعده ابدا کو معارض آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا نہیں کہہ سکتے کیوں کہ آیت یوصیکم اللّٰہ اور آیت والذین یتوفون کے مصداق وہ ہیں جن کی اَرواح کو اُن کے ابدان کے ساتھ وہ تعلق نہ رہا ہو جو حالت حیات میں تھا چنانچہ للرجال نصیب مما ترک الوالدان میں لفظ ترک اور آیت والذین یتوفون میں مادّہ توفی اس پر شاہد ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس آیت ولیخش الذین لو ترکوا من خلفهم ذریة ضعافا میں لفظ ترکوا قرینہ مضمون معروض ہے کیوں کہ جیسے مضمون توفی جب ہی چسپاں ہو سکتا ہے جب کوئی چیز نکال لی جائے اور یہ بات یہاں اسی وقت صحیح ہوتی ہے جب رُوح کو بدن سے نکال باہر کیا جائے کیونکہ الذین کا مصدق آیت والذین یتوفون میں وہی ہے اور نیز وہ نہ ہوتو جسم ہوا۔

اور ظاہر ہے کہ جسم مورد توفی وقت مرگ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ رُوح کو ایسے لوگوں کی اپنے جسم سے وہ علاقہ نہیں رہتا جو وقت حیات تھا، ایسے ہی مضمون ترک بھی گرفتارانِ محبت اولا دو اَموال کے حق میں جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جب کہ اس خاکدان سفلی کو چھوڑ کر عالم علوی کو چلے جائیں، سو یہ بھی جب ہی متصور ہے جب کہ رُوح کو وہ تعلق اَوّل نہ رہے ورنہ وہ ترک نہیں بلکہ مثل بندیوان دست و پا بستہ ملاقات اولا دو تصرف اَموال سے مجبور ہیں یہی وجہ ہے کہ قیدیوں کے ازواج و اَموال ان کی مِلک سے خارج نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ سکتہ والے کے اَزواج و اَموال بدستور اُس کے مِلک میں باقی رہتے ہیں اِن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ

قیدیوں کے اجسام مقید ہوتے ہیں اور سکتہ والے کی رُوح مقید ہو جاتی ہے مگر اُس کا قید خانہ بھی جسم خاکی ہوتا ہے اس لئے وہ پھیلاؤ جو بذریعہ ظہور افعال اختیار یہ ہوا کرتا ہے اور نور آفتاب وقمر کے پھیلاؤ کے مشابہ ہوتا ہے ایسی طرح بند ہو جاتا ہے جیسے چراغ پر کسی ظرف کے رکھ دینے کے وقت اُس کے نور کا پھیلاؤ بند ہو جاتا ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام کی کیفیت

سو یہی صورت حال بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کی موت کی سمجھئے۔ اتنا فرق ہے کہ سکتہ میں سوائے بعض مواقع تمام اعضاء میں سے رُوح کھینچ لی جاتی ہے اور تمام قوائے رُوحانی کو مثل قوت سامعہ وقوت باصرہ اپنے اپنے مواقع سے کھینچ لیتے ہیں اور اس وجہ سے اگر تدبیر مناسب نہ بن پڑے تو رفتہ رفتہ بالکل کھینچ کر باہر کر دیتے ہیں اور اَرواح انبیاء کو بدن کے ساتھ علاقہ بدستور باقی رہتا ہے۔

بر اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہے اور اس لئے حیات جسمانی کو بہ نسبت سابق ایسی طرح قوت ہو جاتی ہے جیسے ظرف مذکور کے رکھ دینے کے بعد چراغ کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی اور سکتہ میں ایسا ہو جاتا ہے جیسے فرض کی جائے چراغ ٹمٹمانے لگے اور گل ہونے کو ہو بہر حال اَرواح انبیاء کو بدستور اپنے ابدان کے ساتھ تعلق رہتا ہے بلکہ کیفیت حیات بعد بوجہ اجتماع مدت اور ہی قوت آجاتی ہے اور مثل نور چراغ وظلمت ظرف محیط حیات وموت دونوں مجتمع ہو جاتے ہیں۔

اجتماع اضداد کے شبہ کا حل

اور اس سے بھی روشن مثال اجتماع اضداد کی ضرورت ہو تو آب گرم کی گرمی عارضی اور برودت طبعی کو پیش نظر رکھ کر اپنے اطمینان فرمالیجئے یا ادویہ حارہ کی برودت خارجی اور ادویہ باردہ کی حرارت خارجی پر نظر ڈالئے اور وہم عموم استحالہ اجتماع اضداد کو دل سے نکالئے۔ شرح اس کی یہ ہے کہ آب گرم کی برودت طبعی وقت حرارت بھی موجود ہے یہی سبب ہے کہ آگ کو بجھارہی ہے اگر وہ برودت نہ تھی تو یہ آتش کشی کیوں ہے،

علیٰ ہٰذا القیاس ادویہ میں وقت عروض کیفیت مخالف طبیعت اگر طبیعت اصلی باقی نہیں رہتی تو یہ تاثیر کیوں ہے القصہ اگر ایک ضد طبعی اور ذاتی ہو اور دوسری خارجی عارضی ہو تو پھر یہ اجتماع محال نہیں بلکہ کثیر الوقوع۔ ورنہ کارخانہ عروض بالکل باطل ہو جائے۔

عروضِ اوصاف وہیں ہوتا ہے جہاں اُن اوصاف کی اضداد ہوتی ہیں، زمین میں ظلمت اصلی ہے نور تو اس پر عارض ہوتا ہے۔ ہاں یہ محال ہے کہ دونوں وصف متضاد عارضی یا طبعی ہوں اور پھر مجتمع ہو جائیں۔

انبیاء کا سماع بعد وفات بدستور باقی رہتا ہے

مگر یہ ہے تو پھر قوت حیات جس کو قوت سامعہ کی قوت بھی لازم ہے انبیاء میں اس بات کو مقتضی ہے کہ اس قوت کا تعلق قوت سامعہ سے اُس ضعف واسطہ کا تدارک ہو جائے اور اُن کا سماع بعد وفات بھی بدستور باقی رہے۔

شہداء کی اَزواج واَموال ان کی مِلک سے کیوں نکل جاتے ہیں حالانکہ ان کی حیات بھی منصوص ہے؟

اب اگر کسی کو حیات شہداء کا خیال آئے اور اس وجہ سے کچھ اور خیال آئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حیات شہداء اجسام یعنی اجواف طیر خضر کے اعتبار سے ہے چنانچہ حدیثوں میں مصرح ہے اور قرآن میں لفظ **عند ربھم** جو احیاء کے ساتھ اُس طرف مشیر ہے اور جب حیات شہداء کی یہ کیفیت ہے تو ان کے اَزواج و اَموال اوروں کے اَزواج واَموال کی طرح بجرد مرگ اُن کے مِلک سے نکل جائیں گے۔

اَزواج کو نکاح ثانی کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟

البتہ اَزواج کو نکاح ثانی میں اتنا انتظار کرنا پڑے گا جس میں احتمال اختلاط نطفۂ شوہر اَوّل وشوہر ثانی نہ رہے، سو وضع حمل میں تو یہ بات ظاہر ہی ہے اور دس دن چار ماہ میں بایں وجہ کہ چار ماہ کے تین چلّے ہوتے ہیں اور موافق ارشاد نبوی تین چلّہ کے

بعد نفخ رُوح کی نوبت آتی ہے اور دس دن میں کسی قدر قوت حرکت آ ہی جائے گی جس سے حمل ہوگا تو یقینی ہوجائے گا یہ بات یوں ٹھیک ہو جاتی ہے کہ بوجہ ظہور حرکات جو اعلیٰ درجہ کا ظہور ہے حمل کا تیقن ہو گیا۔

تو موافق آیت **واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن** انتظار وضع حمل کیا جائے گا ورنہ بوجہ عدم حمل بے اندیشہ ہو کر جو چاہو سو کرو۔ غرض ان دونوں آیتوں میں جو بظاہر دربارہ میعاد عدت مختلف معلوم ہوتی ہیں اختلاف نہیں بلکہ منشاء دونوں آیتوں کا وہی نطفوں کے اختلاط کا بچاؤ ہے اتنا فرق ہے کہ وضع حمل کے بعد خلورحم کا یقین تھا اور اس لئے اختلاط کا احتمال ہی نہ تھا وہاں تو بطور قطع یہ فرمادیا **اجلھن ان یضعن حملھن** اور دس دن چار ماہ میں اتنا معلوم ہو جاتا تھا کہ حمل ہے کہ نہیں اس لئے تربُّص ارشاد ہوا جو بمعنی انتظار ہے۔ الحاصل ازواج (شہداء) مثل ازواج دیگر اَموات اُن کی مِلک سے نکل جاتی ہیں اور مثل اَزواج دیگر اموات عدت متعینہ تک اُن کو ممانعت نکاح ہے۔ پَر یہ ممانعت جیسے بوجہ بقاءِ ملک اور اموات نہیں بلکہ بوجہ اختلاط اندیشۂ نسب ہے تا کہ احکام صلہ ومیراث ونکاح وسفر میں کچھ آمدورفت پیش نہ آئے اور موافق ارشاد **جعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا** احکام مذکورہ میں حقیقت الحال معلوم رہے کچھ اشتباہ نہ ہو۔

شہداء اور عام اَموات

اور وجہ تساوی کی جو شہداء اور اَموات باقیہ میں ملحوظ رہی وہی ہے کہ اس بدن کے اعتبار سے دونوں کی موت برابر ہے یعنی دونوں یہاں کے جسم سے بے علاقہ ہو جاتی ہیں بلکہ شہداء کی بے تعلقی کچھ زیادہ ہو تو تعجب نہیں کیوں کہ اُن کو جب نعم البدل عنایت ہو گیا تو اَب اس جسم کی محبت کیا رہی ہوگی اس لئے اُن کے سماع اور اُن کی قبور سے استفاضہ زیادہ مستبعد ہے اور اُن کی اَزواج واَموال زیادہ تر قابل اجازت غیر ہیں

کیوں کہ احتمال استماع بوجہ بقاءِ محبت تھا اور امکان قبض بھی اُسی محبت اور توجہ پر مبنی تھا اور اَزواج و اَموال سے قطع اُمید اغیار بایں نظر تھی کہ اَزواج تو موافق ارشاد ''نسائکم حرث لکم'' مزرعۂ اولاد ہیں اور ظاہر ہے کہ تخم اولاد یعنی نطفۂ والد جو اس مزرعہ میں بویا جاتا ہے وہ موافق قاعدۂ نباتات اسی جسم سے پیدا ہوتا ہے۔علیٰ ہذا القیاس اموال جو موافق ارشاد جعل اللّٰہ لکم قیاما اور نیز بالبداہت بغرض حفظ جسم خاکی یا مرمت جسم خاکی عنایت ہوا ہے اسی بدن کے لئے ہے۔

ایک بہترین مثال

سو جیسے گھوڑا ہے تو گھاس دانہ کا بھی فکر ہے اور وہ نہ رہے تو ان سے بھی مطلب نہیں رہتا ایسے ہی یہ بدن ہے تو اَزواج واَموال سے بھی تعلق ہے اور اس بدن ہی کو چھوڑ گئے تو پھر اُس کے متعلقات سے کیا مطلب رہ گیا؟ اس لئے یوں مناسب ہے کہ یہ اللہ کی نعمتیں بے وجہ بے کار نہ رہیں یعنی اَموال کو اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اَزواج کو اجازت ہو جائے کہ وہ اپنا فکر خود کر لیں۔

انبیاء علیہم السلام اور عام اَموات میں ایک فرق

مگر اور لوگ تو سب کو چھوڑ جاتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام فقط مال کو چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ اَزواج دینے کے قابل ہی نہیں جو چھوڑ دیجئے بالجملہ اَموال کو چھوڑ دیتے اور اَموات باقی اَزواج اَموال دونوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔

چنانچہ وقت موت اوروں کی مجبوری اور اَنبیاء کی خود مختاری جس پر اُن کی رضا سے اُن کی اَزواج مقبوض ہونا دلالت کرتا ہے اس فرق پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ چھوڑ جاتے ہیں تو جانے کی ضرورت میں چھوڑنا پڑتا ہے ورنہ اَصل میں چھوڑنا ناگوار ہوتا ہے اور چھوڑ دینے میں دینے کے لئے باختیار خود چھوڑتے ہیں سو اسی فرق کے اظہار کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا: ما ترکناہ صدقۃ تاکہ لفظ صدقہ چھوڑ دینے پر دلالت کرے اور کسی کو چھوڑ جانے کا وہم نہ ہو جو

انجام کار یہ وہم نہ ہو کہ ترک ہے تو معما ترک میں آپ کا متروکہ بھی داخل ہو گیا۔ اس لئے یوں مناسب ہے کہ موافق ارشاد یوصیکم اللہ اس میں بھی میراث جاری ہو کیوں کہ چھوڑنا جو مفہوم ترک ہے گو دونوں میں مشترک ہے مگر وہی فرق ہے جو میں نے عرض کیا اسی لئے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ صدقہ سے ایک قسم ترک کو متعین کر دیا ایسے ہی لفظ للرجال نصیب و للنساء نصیب سے خدا نے اوروں کے حق میں قسم ثانی ترک کو معین کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس آیت ولیخش الذین بقرینۂ خافوا علیھم میں قسم ثانی کی تخصیص فرمادی۔

اس فرق کی تشریح

شرح اس معما کی یہ ہے کہ خوف اُسی وقت متصور ہے جب کہ بہ مجبوری چھوڑ کر جایئے اور باختیار خود چھوڑ دیجئے تو کیا خوف ہے جو چیز اوروں کو دے بیٹھتے ہیں وہ ضائع ہو یا باقی رہے اُس کا کیا خوف۔ علیٰ ہذا القیاس اُموال کو باختیار خود ہم وقت مرگ چھوڑ دیا کریں تو جس کو ہم دے جایا کریں وہ اُسی کا ہے جیسے ایام حیات کے تصرفات میں خدا کو کچھ مزاحمت نہ تھی اس صورت میں وقت مرگ بھی خداوند عالم دخل نہ دیتے مگر یہ ارشاد اُسی بناء پر ہے کہ اموات اپنے اُموال کو چھوڑ کر جاتے ہیں، چھوڑ دینا نہیں ہے چنانچہ موت کی مجبوری خود اس پر شاہد ہے کہ دل خستہ بدستور لبریز محبت ازواج و اُموال و اولاد ہے پھر کیوں کر کہہ دیجئے کہ ہم چھوڑ دیتے ہیں، نہیں یہ چھوڑ جانا ہے۔ سو یہ چھوڑ جانا اسی وقت متصور ہوا کہ جسم سے اخراج روح ہو اور جس قسم کا اُس کا دخول تھا جس پر یہ تمام آثار تسلط یعنی باختیار خود جسم اور اعضائے جسم سے کام لینا دلالت کرتا ہے اس کے مناسب خروج متحقق ہو جائے سو یہ بات بدلالت فرق احکام مذکورہ اور اُموات میں تو ہوتی ہے۔ پر اُنبیاء میں نہیں ہوتی۔

اَرواحِ اَنبیاء علیہم السلام کا اِخراج نہیں ہوتا

یعنی بقاء اجساد اُنبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ضروری ہونا اور سوا اُن کے اوروں کے لئے ضروری نہ ہونا اور اَزواج انبیاء کرام علیہم السلام کو نکاح ثانی کی اجازت کا نہ ہونا

اور اوروں کی اَرواح کے لئے اس کا اجازت ہونا اور اموات انبیاء کرام علیہم السلام میں میراث کا جاری نہ ہونا اور اوروں کے اموال میں جاری ہونا اس پر شاہد ہے کہ اَرواحِ انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا فقط مثل نور چراغ اطراف و جوانب سے قبض کر لیتے ہیں یعنی سمیٹ لیتے ہیں اور سوا اُن کے اوروں کی اَرواح کو خارج کر دیتے ہیں اور اس لئے سماعِ انبیاء کرام علیہم السلام بعد وفات زیادہ تر قرین قیاس ہے۔

وفات کے بعد انبیاء کرام کی زیارت (یعنی ان کی قبور کی زیارت) ممنوع نہیں، اور حدیث ''لا تشد الرحال'' کا جواب

اور اسی لئے اُن کی زیارت بعد وفات بھی ایسی ہی ہے جیسے ایامِ حیات میں اَحیاء کی زیارت ہوا کرتی ہے اور اِس وجہ سے یوں نہیں کہہ سکتے کہ زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مثل زیارتِ مسجد، زیارتِ مکان ہے اور اِسی وجہ سے بحکم'' لا تشد الرحال ......'' وہاں اس اہتمام سے جانا ممنوع ہے بلکہ وہ زیارت مکان نہیں زیارت مکین ہے۔ سو اگر'' لا تشد الرحال الی مسجد ......'' محذوف نہ ہو بلکہ الی مکان ہی محذوف ہو، جنس قریب مستثنیٰ نہیں بلکہ جنس بعید مستثنیٰ لیں اور وجہ یہ ہو کہ وجہ ممانعت یہ ہے کہ محنت بے سود ہوگی۔ سو زیارت جملہ مکانات میں خواہ مسجد ہو خواہ کچھ اور سوائے مساجد ثلاثہ جن کا ثواب عظیم ظاہر ہے یہ وجہ برابر ہے تب بھی زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حرج نہیں بلکہ اُس ترحم کی اُمید ہے جس کا نتیجہ مغفرت اور رضوان خداوندی نظر آتا ہے کیونکہ یہ زیارت مکان نہیں زیارت مکین ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں عنایت فرما کر اس تحریر کی نقل یا خود یہ اصل عنایت فرمائیں ورنہ ایام نقاہت کی یہ کارگزاری انجام کار بہت دُشوار معلوم ہوگی۔ زیادہ بجز التماس دُعا اور کیا عرض کروں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ ایک مدت سے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا رہتا ہوں، دُعا کا محتاج۔ باقی بیماری کی اس نواح میں کثرت ہے۔ حاضرینِ خدمت کی خدمت میں سلام۔

العبد محمد قاسم سوم ذیقعدہ ۱۲۹۵ ہجری نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) روز چہارشنبہ

(کتاب جمالِ قاسمی مکمل ہوئی۔)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ
کا آخری مکتوب گرامی

مظہر الطاف وکرم نواب احمد حسین خاں صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

زکوٰۃ میں کھانا.... کپڑا وغیرہ دینا بھی ایسا ہی ہے جیسا نقد دینا.... پر اتنا لحاظ ضرور ہے کہ کھانے میں دعوت کا سا قصہ نہ ہو کہ جتنا پیٹ میں آئے کھالو.... لے جانے کی اجازت نہیں.... بلکہ جس کو دیا جائے اس کو اختیار کلی دیا جائے.... وہ اسی کی ملک سمجھا جائے.... اس کو اختیار ہو چاہے بیچ ڈالے یا خود کھالے اور قرض میں زکوٰۃ ایام قرض کی بھی دینی پڑے گی.... اتنا فرق ہے کہ اگر قرض کی یہ کیفیت ہے کہ جب چاہو وصول کرلو تب تو اسی وقت واجب الادا ہوگی.... ورنہ بعد وصول واجب الاداء ہوگی.... مگر دینی سب ہی پڑے گی.... باقی رہا مولود شریف کا قصہ.... اس میں آپ کا پوچھنا فضول معلوم ہوتا ہے اور میرا بولنا بیکار نظر آتا ہے.... اس قسم کی باتوں میں زبان ہلانے کا نتیجہ بجز فتنہ پردازی اور کچھ نہیں ہوتا.... مگر چونکہ آپ نے پہلی بار یہ استفسار فرمایا ہے.... جواب لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے.... سنئے!

اگر کوئی شخص ملازمان شاہی میں سے سر دربار.... بادشاہ سے زیادہ کسی وزیر.... مشیر کی تعظیم کرے تو وہ تعظیم چونکہ موجب توہین بادشاہی ہے.... اس لئے بوجہ تعظیم مفرط وزیر یہ تعظیم کرنے والا مستوجب عتاب بادشاہی ہوگا تعظیم وزیر کچھ کام نہ آئے گی.... بلکہ خود وزیر بوجہ مذکور درپے تذلیل شخص مذکور ہو جائے گا جب

یہ بات ذہن نشین ہوچکی تو اب سنئے!

اعلیٰ درجہ کی وہ مجلس ہے جس میں قرآن وحدیث پڑھا جائے اور بیان احکام خداوندی کیا جائے اور کیوں نہ ہو؟ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس غرض سے بھیجے گئے کہ احکام خداوندی پہنچائیں اور کتب مقدسہ اسی غرض سے نازل کی گئیں کہ احکام خداوندی معلوم ہوجائیں....خود خداوند کریم فرماتا ہے:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" (الذاريات ۵۶)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (البينة: ۵)

اور ظاہر ہے کہ عبادت اطاعت احکام کا نام ہے....اسی لئے وہ مجلس جس میں بیان احکام ہو....اعلیٰ درجہ کی مجلس ہوگی....کیونکہ غرض اصلی عبادت ہے.... چنانچہ دونوں آیتیں اس پر شاہد ہیں....بے بیان....احکام محقق نہیں ہوسکتے....غرض مجلس وعظ و درس قرآن وحدیث کے برابر کوئی محفل نہیں....پھر ستم یہی نہیں کہ اس محفل کے لئے تو کچھ اہتمام نہ ہو....نہ اس میں اس برکت کی امید ہو جو محفل میلاد شریف سے رکھتے ہیں اور نہ اس کے لئے فرش وفروش....روشنی وشیرینی وغیرہ ہو جو محفل میلاد شریف کے لئے مہیا کی جاتی ہے....علاوہ بریں میلاد شریف کی بدولت جماعت سی واجب چیز کو ترک کیا جائے اور جماعت کے لئے میلاد شریف ترک نہ کیا جائے اور یہ اسی قسم کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بادشاہ سے زیادہ وزیر کی تعظیم کی جائے....

پھر اس پر قیام معمول بہ اگر بایں اعتقاد ہے کہ روح پرفتوح حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت رونق افروز ہوتی ہے تو یہ اعتقاد بے سند ہے کہ جس کا پتہ نہ قرآن میں....نہ نشان حدیث میں....اگر یہ بدعت نہ ہوگا تو اور کون سی چیز بدعت ہوگی؟ شیعوں اور خوارج کے اعتقادات جو ان کے مبتدع اور ضال ہونے کی وجہ سمجھی گئی ہے تو کیوں سمجھی گئی؟ اسی بے سند ہونے کے باعث....اور اگر بایں خیال یہ اہتمام قیام

ہے کہ بعض اولیائے کبار اس وقت کھڑے ہوئے تھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم بھی اسی طرح مشرف بہ زیارت ہوتے ہیں جیسے وہ اولیاء مشرف ہوئے تھے....

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض اولیاء کبار ارباب حال کو وقت ذکر ولادت شریف.... دولت زیارت میسر آئی تھی.... اس لئے ان کے واسطے اٹھنا ضروری ہوا.... بے شک اگر وہ اس وقت نہ اٹھتے تو عجب نہ تھا کہ اس بد تعظیمی کے سبب اپنے مرتبہ و مقام سے گر جاتے مگر عوام الناس جو ان کی اقتدا کرتے ہیں گویا زبان حال سے یوں جتلاتے ہیں کہ گویا ہم بھی دولت زیارت سے مشرف ہوئے.... اب کہئے یہ کس درجہ کی ریا ہے؟

بعض اولیاء کو چند بار یہ اتفاق ہوا کہ اپنے حلقہ میں یا شیخ بہاؤ الدین شیئاً للہ کہا.... ان کے ایک مرید نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا.... حضرتؒ نے فرمایا: تم کیوں کہتے ہو؟ مرید نے کہا: کہ آپ کہتے ہیں میں بھی کہتا ہوں.... حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھ کو تو حضرتؒ کی زیارت میسر آتی ہے.... اس لئے یہ کہہ پڑتا ہوں تو جو کہتا کیوں کہتا ہے غرض حضرتؒ نے اس کو منع فرمایا اور اپنی اقتداء اور اتباع کی اس امر میں اجازت نہ دی.... ایسے ہی جن صاحبوں نے وقت مذکور پر قیام کیا وہ مشرف بہ زیارت ہوئے تھے.... عوام کو ان کا اقتداء جائز نہیں....

باقی یہ کہنا کہ ہم بغرض تعظیم اسم مبارک پر کھڑے ہوتے ہیں یہ ایسی بے ہودہ بات ہے کہ کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا.... کیا اسی وقت آپ مستحق تعظیم ہوتے ہیں؟ اس سے آگے پیچھے ان لوگوں کے نزدیک مستحق تعظیم نہیں ہوتے؟ افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر انوار کو ایسی ایسی واہیات سے ناواقفوں نے خراب کر دیا....

اس لئے اپنا یہ قول کہ ہمارے لئے تو مولود شریف اگر کریں جائز بلکہ مستحب ہے.... پر رواج کے موافق کرنے والوں کے حق میں جائز نہیں.... ہاں گوشۂ تنہائی میں بے قیام کوئی بھی بتقاضائے محبت بروایات صحیحہ پڑھ لیا کرے تو سبحان اللہ! پر ان روایات ضعیفہ موضوعہ کا پڑھنا یوں بھی جائز نہیں....

غرض اصل سے ذکر بابرکات حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات عمدہ حسنات میں سے تھا....گو ذکر احکام اور استماع احکام بغرض اطاعت وتبلیغ حقیقت میں ذکر ملک علام ہے....مگر جیسے منجن وزعفران وغیرہ اطعمہ لذیذہ اصل سے عمدہ غذا ہوتی ہے.... پر زہر مل جائے تو باوجود عمدگی خراب ومہلک ہوجاتی ہیں اور اس وقت بوجہ اختلاط زہر باوجود لذت معلومہ اس لذت کا ترک ضروری ہے.... چہ جائیکہ بوجہ لذت زہر مخلوط کا کھانا عمدہ سمجھا جائے....ایسے ہی ذکر خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم متضمن ولادت ہو یا متضمن وفات....عمدہ خیرات میں سے ہے.... بر بالائی خرابیوں کے باعث واجب الاحتراز ہے.... چہ جائیکہ خرابی ہائے مذکورہ بوجہ عمدگی سفوہ واجب الارتکاب ہوں....

لیجئے نواب صاحب! آپ کی خاطر یہ دو ورق سیاہ کرڈالے.... پر دیکھئے اس نامہ سیاہ کے حق میں اس تحریر کے باعث کیا کیا صلوٰتیں ادھر سے پیش ہوتی ہیں؟

مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں سلام یہ عرض ہے کہ عنایت نامہ پہنچا....اس تفقد احوال کا شکریہ کیا ادا کروں اور اپنا حال لکھوں تو کیا لکھوں؟ دو دن کو اوروں کی دعا سے کچھ آرام سے گزرتی ہے....تو دو دن اپنی شامت اعمال سے پھر تکلیف کوئی نہ کوئی کھڑی ہوجاتی ہے....

اب آج کل اللہ کا شکر ہے کہ تخفیف ہے....چندروز پہلے بشدت گزری....

اس وجہ سے جواب نامہ نواب صاحب ونیز جواب عنایت نامہ سامی میں دیر ہوئی....

یا وہ دن تھے کہ ورق دو ورق ایک بات تھی.... یا یہ دن ہیں کہ جواب خطوط بھی دشوار ہے.... پہلے گھنٹہ دو گھنٹہ کی تقریر کو میں کچھ نہیں سمجھتا تھا اور اب بعض اوقات دو چار جملوں کا ادا کرنا بھی ایک مہم عظیم ہوجاتی ہے....اب آپ کے شاگردوں اور احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں فقط:

العبد محمد قاسم

چند اہم تاریخی مکتوبات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ
بنام حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمہ اللہ

(نور الحسن راشد کاندھلوی)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ (ولادت ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۳ء وفات ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء پنجشنبہ) کا منجملہ اور تمام اوصاف وکمالات کے ہندوستان کے ان علماء اور ممتاز اہل فضل وکمال میں شمار ہے جن کی زندگی میں ان کے فیض کا دریا رواں ہوگیا تھا اور ہر سوان کی جامعیت اور تبحر علمی کی آوازیں بلند اور ان سے استفادہ کرنے کے متمنی افراد کی جماعتیں موجود تھیں ان کو شاگرد بھی نہایت منتخب اور غیر معمولی نصیب ہوئے اور نہ صرف چھوٹوں، شاگردوں اور استفادہ کرنے والوں کو بلکہ ان کے بڑوں کو بھی اس کا پوری طرح حساس تھا۔

(۱) کہ حضرت مولانا ایک غیر معمولی شخصیت ہیں اور ان پر جس طرح علوم کا ورود ہوتا ہے اور اللہ نے دینی عقلی کلامی مسائل سمجھنے کی جو غیر معمولی وہبی صلاحیت عنایت فرمائی ہے وہ ہر زمانہ میں جنس نایاب اور متاع بے بہا رہی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مولانا کے متعدد شاگردوں متوسلین اور اہل تعلق نے حضرت مولانا کی تحریریں، خطوط، رسائل وتالیفات، احوال وسوانح اور ملفوظات جمع کرنے کا کام اسی وقت شروع کردیا تھا۔ ایسی متعدد کوششوں اور تالیفات کے مجموعوں کا مختلف ذرائع سے علم ہوتا

ہے جن کی ترتیب وتدوین حضرت مولانا کی حیات میں یا حضرت مولانا کی حیات کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی مگران محنتوں اور علمی خدمات کی حفاظت واشاعت پر حضرت کے نام لیواؤں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔اس کی وجہ سے حضرت کی کئی اہم سوانحات اورتحریرات وملفوظات کے متعدد مجموعے ضائع یا گمنام و بے نشان ہوگئے۔

ایسی ہی چیزوں میں جن کا عموماً سراغ نہیں ملتا۔حضرت مولانا کے وہ گرامی نامے بھی ہیں جو مولانا نے اپنے پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی کوتحریر فرمائے تھے اور غالباً ان مکتوبات کے ناپید ہونے کی وجہ سے ہی مولانا کے متاخر سوانح نگاروں کو حضرت مولانا اور حضرت حاجی صاحب کے سلسلۂ عقیدت ومودت کی صحیح تاریخ دریافت کرنے میں مشکلات پیش آئیں۔تاہم اللہ کا شکر ہے کہ مولانا کی ایسی کئی چیزیں جن کو عموماً معدوم سمجھا جاتا ہے (اگرچہ منتشر ہیں مگر) موجود ومحفوظ ہیں۔

ایسی ہی چیزوں میں سے ایک گراں بہا سرمایہ ایک قلمی مجموعۂ مکتوبات ہے جس میں حضرت مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام گیارہ خطوط درج ہیں۔یہ مجموعہ مکتوبات ۴۵ صفحات پر مشتمل ہے اور قلیل ضخامت کے باوجود اپنے مشتملات کے لحاظ سے گنج ہائے گراں مایہ کہا جاسکتا ہے۔افسوس ہے کہ اس مجموعہ پر اس کے مرتب یا کاتب کا نام اور مقام سنہ کتابت وغیرہ کچھ درج نہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا کام اچانک بیچ میں رہ گیا ہے اور وہ اپنے ارادہ اور منصوبہ کے مطابق اس کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔تاہم اس کی تحریر اور رسم خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا آدھے سے زائد حصہ ۲۵ صفحات مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (وفات یکم شعبان ۱۳۶۰ھ ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء مترجم قرآن ومؤلف تذکرہ الرشید وتذکرہ الخلیل (۳) (وغیرہ) کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور ۲۰ صفحات مولانا عبداللہ گنگوہی مؤلف تیسر المنطق اور تیسیر المبتدی وغیرہ (وفات ۱۵ رجب ۱۳۳۹ھ ۲۶ مارچ ۱۹۲۱ء) (۴) نے نقل کیے ہیں۔اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو اس مجموعہ کی کتابت سنہ ۱۳۳۹ھ سے پہلے ہوئی ہے جو مولانا عبداللہ گنگوہی کا سنہ وفات ہے اور

آخری کچھ حصہ مولانا کی وفات کے بعد نقل ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت حاجی صاحب کے نام ان کے ممتاز و عزیز ترین خلفا کے خطوط یکجا کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے چھ والا نامے ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا قاسم صاحب کے ۱۱ خطوط نقل کئے گئے ہیں۔ بعد ازیں حضرت مولانا محمد یعقوب کے ۳ مکتوبات نے جگہ پائی ہے۔ (یہ خطوط بھی حضرت حاجی امداد اللہ کے نام ہیں) آخر میں حضرت مولانا گنگوہی کے وہ خط ہیں جو شارح ابو داؤد مولانا خلیل احمد انبہٹوی مہاجر مدنی کے نام صادر ہوئے ہیں۔ یہ کل ۴۲ خطوط ہیں۔ یہ رسالہ ۱۶×۳۶ سینٹی میٹر سائز کے کل ۴۵ صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت معمولی کاغذ پر لکھا گیا ہے کاغذ ایسا خستہ و شکستہ ہے کہ بہت احتیاط سے ہاتھ لگانے پر بھی ورق کے ٹوٹ کر گر جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کاغذ کی خستگی کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریر کا خاصا حصہ لال روشنائی سے لکھا گیا ہے جو اپنا رنگ کھوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے اس نسخہ کا دیر تک باقی رہنا نہایت مشکل ہے۔ اس لئے کوشش کر کے اس کا فوٹوسٹیٹ لے لیا ہے اور ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً اس کے مندرجات و خطوط شائع ہوتے رہیں گے۔

اگرچہ ان خطوط کا زمانہ تحریر بہت طویل نہیں ہے اور یہ خصوصاً تقریباً ۱۲۹۰ھ سے ۱۲۹۲ھ (۷۵۔۱۸۷۳ء) کے درمیان لکھے گئے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط صرف دو سال کے موسم حج کی یادگار ہیں کیونکہ اس زمانہ میں جب یہ خطوط لکھے گئے (بیرونی) ڈاک کا کوئی معقول نظام موجود نہیں تھا۔ ساکنان ارض حرم کی ہندوستان اور دیگر ممالک سے اور ہندوستان نیز دوسرے ملکوں کے لوگوں کی حرمین شریفین میں مقیم اپنے بزرگوں عزیزوں سے رابطہ اور مراسلت کی عموماً یہی ایک صورت تھی کہ جب کوئی جاتا متعلقہ اصحاب کیلئے خطوط لے جاتا اور جب کوئی ادھر سے آتا تو وہاں والے اپنی تحریروں اور مکتوبات سے مسرور و شاد کام فرماتے تھے۔ اسی طرح حضرت نانوتوی بھی حجاز جانے والے اصحاب کے ذریعہ سے حاجی صاحب کی خدمت میں خطوط بھیجا کرتے تھے اور

حضرت حاجی صاحب واپس آنے والے حجاج کے بدست ان کے جوابات سے سرفراز فرماتے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام آئے ہوئے حضرت حاجی صاحب کے متعدد گرامی نامے مرقومات امدادیہ مرتبہ مولانا وحید الدین رامپوری میں شامل ہیں۔

(۵) زیر تعارف قلمی مجموعہ' مکتوبات میں درج حضرت نانوتوی کے خطوط اور مرقومات میں حضرت حاجی صاحب کے جوابات سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی حضرت حاجی صاحب سے اکثر خط وکتابت رہتی تھی۔

مولانا نے حضرت حاجی صاحب کو یقیناً پچاسوں خط لکھے ہوں گے اور اسی طرح حضرت حاجی صاحب کے گرامی نامے بھی کثیر تعداد میں آئے ہوں گے۔ لہٰذا اس مجموعہ میں اور مرقومات امدادیہ میں طرفین کے جو خطوط ہیں وہ اس مراسلت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن (راقم سطور کی معلومات کی حد تک) اس وقت تک حضرت حاجی صاحب کے نام حضرت مولانا محمد قاسم کا کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ درج بالا قلمی مجموعہ میں سے حضرت مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام چار گرامی نامے قارئین احوال وآثار کی نذر کئے جا رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے یہ خطوط کئی طرح سے نہایت اہم ہیں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حضرت حاجی صاحب کے نام دریافت پہلے خطوط ہیں۔ ان کی مدد سے حضرت مولانا نانوتوی کے علوے مراتب انکسار وتواضع' تعلق مع اللہ اور اپنے نفس پر بد اعتمادی کا خوب علم ہوتا ہے کہ اس جلالت شان کے باوجود وہ اپنے کو کس طرح ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا توکل واستغنا کے ایسے بلند مقام پر فائز تھے جو ہر ایک کا نصیب نہیں۔ انہوں نے پوری زندگی میں جاہ ومنصب' عہدہ واقتدار اور مال و دولت کی طرف ایک لمحہ کیلئے بھی توجہ نہیں کی۔ بڑے بڑے مقتدر روٴساء نوابوں اور اہل ثروت کے گراں قدر نذرانوں اور ہزاروں لاکھوں روپیوں کے عطیات کو بے

پروائی کے ساتھ رد کردیا اور جسم وروح کے رشتہ کو جوڑے رکھنے کے لائق ضروریات کے سوا کبھی کسی دنیاوی چیز کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور پوری زندگی اسی شان استغنا اور کہنا چاہئے کہ فقر اختیاری میں گزار دی۔

حضرت مولانا کی زندگی کا کوئی لمحہ معلوم نہیں ہے جو طلب دنیا سے آلودہ ہوا ہو مگر اس سب کے باوجود وہ حضرت حاجی صاحب سے ایسی لجاجت کے ساتھ دعا اور توجہ کی درخواست کرتے ہیں کہ خاص طور پر دعا فرمایئے میرے پاؤں دنیا کی طلب میں نہ اٹھ جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی روحانی کیفیات مدارج سلوک اور سفر معرفت کے بھی نقوش ثبت فرمائے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب کے ہندوستان میں جو عزیز و اقارب تھے ان سب کے احوال و کیفیات کا ذکر ہے۔ خوشی اور غمی، لین دین اور باہم مراسم وتعلقات ہر قسم کے واقعات کی ایک جھلک ان خطوط میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نیز خود مولانا کے خاندان اور اعزاء میں کیا ہو رہا ہے۔ کون خوش وخرم ہے اور کون بیمار و پریشان ہے ان خطوط میں ان قصبات ونواح کا بھی ذکر ہے جہاں حضرت حاجی صاحب کا قرابت ونسبت کا کچھ رشتہ تھا یا وہاں حضرت حاجی صاحب کے متوسلین رہتے تھے۔ ان خطوط سے اگر ایک طرف حاجی صاحب کے اپنے اہل تعلق کی خیر وخبر رکھنے کا ان مسرتوں سے خوش اور ان کے رنج وغم میں شریک رہنے کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب حضرت مولانا کی سعادت مندی اور جذبہ خدمت کا تاثر بھی بہت واضح ہے کہ مولانا بھی حضرت کے سب متوسلین کی اچھے برے کی سب معلومات رکھتے اور حضرت حاجی صاحب کو ان سے مطلع فرماتے رہتے تھے۔

یہ خطوط اس پہلو سے بھی بہت قابل قدر اور لائق استفادہ ہیں کہ ان میں حضرت مولانا کے ذاتی احوال کی جس قدر جھلک مل جاتی ہے ویسی اس وقت تک معلوم مولانا کے کسی اور خط یا تحریر میں نظر نہیں آتی۔ اس میں حضرت مولانا نے اپنے گھریلو واقعات وحوادث کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ خطوط اس لحاظ سے بھی ایک منفرد یادگار ہیں کہ ان میں

حضرت مولانا نے اپنے متعدد ممتاز شاگردوں کا حضرت حاجی صاحب سے تعارف کرایا ہے۔ ان شاگردوں کی حضرت مولانا کی نگاہ میں جو قدر و منزلت تھی اور مولانا ان کو جیسا سمجھتے تھے ان کا بھی ان خطوط میں تذکرہ ہے۔ مولانا احمد حسن امروہوی' مولانا فخر الحسن گنگوہی' مولانا محی الدین احمد خاں مراد آبادی کا تذکرہ ملاحظہ ہو۔ ان ہی خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اپنے شاگردوں میں مولانا احمد حسن امروہوی کو سب سے زیادہ باصلاحیت فہیم اور اپنا قائم مقام سمجھتے تھے اور انہیں خطوط کی مدد سے ان سب صاحبان کی حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری اور تربیت حاصل کرنے کا بھی علم ہوتا ہے جس کا دوسرے خطوط میں بہت کم ذکر ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اپنے ایسے متوسلین کو جو مولانا سے بطور خاص سلوک و تربیت کے طالب ہوتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ خط بعض ایسی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں جو اب تک نامعلوم تھیں۔ مثلاً اس میں حضرت مولانا کے ایک شاگرد مولانا سلطان الدین امروہوی کا ذکر ہے جن کا حضرت مولانا کے تلامذہ میں عموماً ذکر نہیں آتا۔ ان خطوط میں حضرت مولانا کے والد محترم شیخ اسد علی اور مولانا کی والدہ ماجدہ کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ یہ دونوں تاریخیں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ اسی طرح ان خطوط کے ذریعہ سے مولانا کے تیسرے صاحبزادے محمد کی ولادت اور وفات کا بھی علم ہوتا ہے۔

ان خطوط میں درج شخصیات کے متعلق معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔ تاہم بعض مندرجات مزید تحقیق کے منتظر ہیں۔ مثلاً ایک خط میں بھائی عبداللہ' برادر زادہ حضرت حاجی صاحب کی وفات کی خبر ہے اور اس خط (مکتوب ۵) پر تاریخ تحریر ۱۰ رمضان ۱۲۹۲ھ چہار شنبہ لکھی گئی ہے۔ اس میں کچھ سہو ہو گیا ہے۔ اگر تاریخ کتابت صحیح ہے تو یہ شب دوشنبہ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء ہو گی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان خطوط میں سے دو خطوں میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

کی پہلی اہلیہ کی وفات کا ذکر ہے جس میں سے ایک سب سے آخری خط (مکتوب ۱۱) مولانا محمد یعقوب کی اہلیہ کے انتقال کے اگلے دن لکھا گیا ہے اور مولانا یعقوب صاحب کی اہلیہ کی وفات ۱۴ رمضان ۱۲۹۲ھ میں ہوئی تھی۔

چونکہ مولانا محمد یعقوب کی اہلیہ کی وفات کی تاریخ بیاض یعقوبی میں خود مولانا محمد یعقوب کے قلم سے لکھی ہوئی موجود ہے۔

دوسرے ذرائع بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ لہٰذا یہی اندراج ہونا چاہئے تھا۔ نیز اسی کے ذریعہ سے یہ بھی متعین ہوجاتا ہے کہ شیخ اسد علی کی وفات ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ شب پنجشنبہ (۱۳ مئی ۱۸۷۵ء) میں ہوئی۔

ان خطوط سے ایک اور اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ مدرسہ مراد آباد (مدرسۃ الغرباء) کا آغاز اس تاریخ سے بہت پہلے ہو چکا تھا جو عام طور پر ذکر کی جاتی ہے۔ یہ مشہور و متعارف تاریخ ۱۹ صفر ۱۲۹۶ھ (۱۲ فروری ۱۸۸۹ء) ہے (۶) مگر حضرت مولانا نانوتوی کے ایک خط میں اس سے کئی سال پہلے مراد آباد میں ایک دینی مدرسہ کی ابتدا کی اطلاع ہے جو مدرسۃ الغرباء (مدرسہ شاہی) کے آغاز کی مشہور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اگر مدرسہ امداد الغرباء شاہی مراد آباد کے آغاز کی تاریخ ۱۹ صفر ۱۲۹۶ھ ہی ہے اور اس سے پہلے اس مدرسہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اس سے پہلے بھی مراد آباد میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی کوشش فرمائی تھی جو ۱۲۹۲ھ میں شروع ہوا تھا اور مولانا فخر الحسن صاحب اس کے صدر مدرس بنائے گئے تھے ممکن ہے وہ مدرسہ کسی وجہ سے نہ چل سکا ہو اس لئے حضرت مولانا دوبارہ ۱۲۹۶ھ میں مراد آباد تشریف لائے اور اس وقت مدرسۃ الغرباء (مدرسہ شاہی) کا سر و سامان فرمایا یہ کوشش بفضلہٖ تعالیٰ مفید اور بار آور رہی اور یہ مدرسہ آگے بڑھتا اور ترقی کرتا رہا اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ مدرسۃ الغرباء کا غیر رسمی افتتاح ۱۲۹۲ھ میں ہوگیا ہو اور اس وقت مولانا فخر

الحسن گنگوہی عارضی طور پر اس میں بڑے مدرس مقرر کیے گئے ہوں۔

ان مکتوبات میں درج بعض شخصیات تو ایسی ہیں کہ ان کے متعلق معلومات کا کوئی ذریعہ راقم سطور کی دسترس میں نہیں ہے اور ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ایک ہی نام کی الگ الگ کئی شخصیتیں ہیں ان کو متعین کرنا بھی آسان نہیں۔ مثلاً قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان خطوط میں عبداللہ نام کے جن اصحاب کا ذکر ہے وہ چار الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ ایک عبداللہ حضرت حاجی صاحب کے بھتیجے ہیں۔

ایک اور عبداللہ نامی شخص تھانہ بھون کے رہنے والے ہیں۔ ایک عبداللہ مہاجر مکی اور حضرت حاجی صاحب کے خادم خاص ہیں۔ ایک اور جن کو میاں عبداللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ حضرت حاجی صاحب اور غالباً مولانا کے عزیز ہیں۔ میاں عبداللہ کا شادی کے چند ہی دن کے بعد آغاز نوجوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ایسے ہم عہد، ہم وطن اور قریب ترین ہم نام اعزہ کے احوال وتعارف میں غلطی کا خاصا امکان رہتا ہے۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ ان اشخاص کو الگ الگ کردیا جائے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے۔

مکتوب اوّل

ہدایت کے مرکز اور آخرت کے دن نجات کی ایک علامت.... اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے.... کمترین غلامان محمد قاسم سلام اور مناسب آداب کی بجا آوری کے بعد عرض کرتا ہے کہ اگرچہ خاندان اور اعزا میں خیریت و عافیت ہے صرف میاں عبدالسمیع نانوتوی کا چھوٹا بیٹا (وبا میں) ضائع ہو گیا (انتقال کر گیا) لیکن وطن کے آس پاس نیز دہلی کے قرب و جوار اور کول (علی گڑھ) میں ہیضہ کی ایسی زیادتی ہے کہ سینکڑوں اشخاص ایک ایک دو دن میں جان جانِ آفریں کے حوالے کر رہے ہیں.... نانوتہ میں بہت شدت کے بعد کچھ کمی ہو چکی ہے بلکہ (وبا) ختم ہو گئی ہے مگر تھانہ بھون اور گڑھی میاں بھائی خان میں نہایت زور ہے.... اس شہر دہلی میں بھی یہ مرض اپنا کام کر رہا ہے مگر علاقہ پہاڑ گنج میں نہیں ہے شہر میں کچھ کم ہے مگر ہم غریبوں کے لئے یہ کمی بھی زیادتی کا حکم رکھتی ہے....

کل رات ایک خوبصورت خوش اخلاق نوجوان امروہہ کے خاندان سادات کا فرد سلطان الدین نام.... جس نے حضرت کے نام سے میرے ہاتھ پر بیعت بھی کی ہوئی تھی اور مولوی احمد حسن امروہوی کے سامنے جو احقر کے احباب میں سے ایک ہیں اور احقر کے سامنے درسی کتابیں پوری کر لی تھیں اوپر کی کتابیں پڑھتا تھا اس مرض میں جاں بحق ہوا.... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ.... یہ نوجوان اچھی عادات واطوار کا مالک تھا جمعہ اور جماعت میں حتیٰ الامکان کوتاہی نہیں کرتا تھا اگر اس کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد فرمالیں خدام نوازی سے بعید نہیں.... کیونکہ اس مرحوم نے ارادہ بیعت کا رشتہ ایسی ہی اغراض کی وجہ سے کیا تھا....

اس کے علاوہ حضرت کے سب نیاز مند خادم اور عزیز اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہیں مگر تمام اشخاص حیران اور دعا کے امیدوار ہیں.... زیادہ کیا عرض کروں

کہ سمع خراشی سے نا گواری خاطر کا ڈر ہے.... مگر کیونکہ یہ بھی ڈر ہے اور اپنے اوپر ظلم ہے اسی لئے اس کا کچھ نہ کچھ ذکر کرنا ضروری ہے.... دہلی کے اکثر علماء نے (مولانا نذیر حسین محدث کے علاوہ) اس ناکارہ کے کفر کا فتویٰ دیا ہے اور فتویٰ پر مہر کرا کر علاقے میں ادھر اُدھر مزید مہریں لگوانے کے لئے بھیج دیا ہے اب یہ خبر ہے کہ وہ فتویٰ عن قریب عرب شریف بھی پہنچے گا.... اس رسالے کے عرب شریف بھیجنے کا ایک مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا رحمت اللہ اس کا مطالعہ فرمائیں اور ان کے ذریعہ سے عرب شریف کے علماء کی مہریں بھی اس فتوے پر ہو جائیں.... اس علاقے کے احباب جواب کی امید کر رہے ہیں مگر میں نے اپنے اسلام کو ننگ کفر سمجھ کر خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہیں دیا.... اور میں نے کہہ دیا کہ اس جواب میں انہیں کی تکفیر ہو گی مگر یہ مجھ سے نہ ہو گا کیونکہ میں ان (لوگوں) کو اس زمانے کے اہل ایمان کا رہنما جانتا ہوں....

محمد یاسین نے لکھا تھا کہ احمد حسین کے قرض کی رقم تیار ہے مگر کاندھلے والے اس کی دستاویز نہیں دے رہے ہیں اور اس تاخیر میں شاید ہمارے نقصان کی امید رکھتے ہونگے.... کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ دیر کریں اور اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے میرا ہاتھ اس رقم پر پڑ جائے اور یہ خرچ ہو جائے....

حامل عریضہ امروہہ کے ممتاز سادات میں سے ہیں.... احقر کی جانب عنایت کی نظر رکھتے ہیں اسی عنایت کی وجہ سے حضرت والا کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے.... لہٰذا حضرت والا کی نظر کرم کے مستحق ہیں.... حافظ احمد حسین کی خدمت میں حافظ عبداللہ مولانا رحمت اللہ.... حاجی سکندر خان کی طرف سے سلام پہنچے اور مخدومہ پیرانی کی خدمت میں احقر کا سلام بھی عرض ہے.... مولوی فیض الحسن اتفاق سے دہلی آئے ہوئے ہیں حضرت کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں....

کمینہ احقر زماں.... احمد حسن عفی عنہ سلام وکلام کے بعد عرض کرتا ہے کہ عزیز از جان محمد سلطان میرا بھانجہ تھا اور میرے حقیقی چچا کی دختر ان کے نکاح میں تھی دو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے اللہ اس مرحوم کیلئے مغفرت کی دعا فرمائیں.... اس کی اہلیہ بچوں اور پس ماندگان کو بھی دعا میں یاد رکھیں....

مکتوب دوم

قبلہ حق پرستان .... اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے .... آستانہ عالی کے کمترین خادموں میں سے ایک روسیاہ محمد قاسم .... دین و دنیا سے بے نصیب .... کہ جو سلام کے علاوہ کوئی چیز پیش کرنے کے لائق نہیں رکھتا .... سلام کے بعد عرض کرتا ہے کہ اس دن سے جب کہ آپ ایسے بزرگوں نے اس علاقہ کی مٹی کو اپنے قدم چومنے (کی سعادت) سے محروم کیا ہے .... کوئی سال ایسا نہیں گذرا کہ (ہمارے) سر پر آسمان سے کوئی نئی آفت نازل نہ ہوئی ہو .... اور کوئی مہینہ ایسا نہیں جس میں کسی نئے فتنہ کا گرد و غبار نہ اٹھتا ہو ....

اس وقت اس علاقہ کا دین و دنیا کا حال یہ ہے کہ بیماری ہر طرف سے ہجوم کئے ہوئے ہے .... بریلی کے اطراف میں ہیضہ کے اثر سے بے شمار جانیں ضائع ہو گئی ہیں .... اور (ہمارے) اس علاقہ میں تپ ولرزہ کی زیادتی کی وجہ سے لوگ زندگی سے عاجز آ گئے ہیں .... اس قصبہ (نانوتہ) کا حال یہ ہے کہ دو چار آدمی بھی ایسے نہ نکلیں گے جو نہ بیمار ہوں اور نہ بیمار ہوئے ہوں .... رام پور کا بھی ایسا ہی حال کانوں میں پڑا ہے اور جلال آباد اور تھانہ بھون اور شاملی نیز کاندھلہ کا بھی یہی حال ہے .... لیکن کہتے ہیں کہ تھانہ بھون میں اور قصبات کی نسبت کچھ کمی ہے مگر دیوبند میں امن و امان ہے .... اگر ہوں گے تو پچاس میں سے ایک دو شخص اس میں شاید مبتلا ہوں یہ سلامتی اور امن و امان (غالباً) مدرسہ کی برکت سے ہو گا بہرصورت یہ اس علاقہ کا دنیاوی حال ہے .... جو بہت مختصر بطور مشتے از خروارے ہے تفصیل کہاں تک لکھوں ....

ورنہ حکام کا ظلم....عوام و خواص کے جھگڑے....سامان ضروری کی مہنگائی اور شرفاء کی روز افزوں غربت کا اگر تذکرہ کروں تو (یہ خط) ایک بڑا دفتر ہو جائے گا....

اور دینی حالات یہ ہیں کہ اس ضلع کے علاوہ جس طرف بھی نظر جاتی ہے سب (دینی رہنما) جنگ و جدال میں مشغول ہیں....ایک کے ہاتھ میں شیشہ ہے تو دوسرے کے ہاتھ میں پتھر ہے....بہ ظاہر اسی لڑائی نے دنیاوی رہنماؤں کو بھی بے کیف کر دیا....(سب) بلاؤں سے حفاظت کا ذریعہ اتباع سنت اور امت کا اتفاق و اتحاد ہے اور یہ دونوں نعمتیں ہم بدنصیبوں کی قسمت میں نہیں....اس سمع خراشی کا مقصد ہمت و حوصلہ (اتباع سنت) کی آرزو اور حضرت والا سے دعا کی تمنا ہے ممکن ہے کہ بزرگوں کی برکت اور عنایات کے طفیل میں....اس علاقہ کے افراد کچھ اور دن آرام سے گزار لیں....اور ان سختیوں سے کہ جن کی بہت سی احادیث میں اطلاع دی گئی ہے اور کچھ دن گوشہ عافیت میں بسر کر لیں اور اگر یہ آفتیں اور یہ فتنے انہی احادیث شریفہ کا ظہور ہیں تو میں (اپنے اور سب مسلمانوں کے) سرمایہ ایمان کی عافیت کی دعاؤں کا خواستگار ہوں....اس کے علاوہ اور کیا گذارش کروں....

دو ہزار دو سو روپے جس میں سے دو ہزار روپے ہمشیرہ راؤ عبدالعزیز کے وعدہ کے ہیں اور ایک سو روپے عبدالعزیز خاں صاحب کی جانب سے تازہ نذر ہے....
مخدوم العلماء مولانا احمد علی صاحب اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور ان کا فیض جاری رہے عرصہ ہوا روانہ ہو چکے ہیں....اور اہلیہ جناب حافظ احمد حسین صاحب انتقال کر گئیں....اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ. اس سلسلہ میں زیادہ معلومات نہیں ہوئیں جو عرض کر سکتا....اگر صاحبزادہ میاں مقصود احمد صاحب پہنچیں گے سب حالات مرض اور تاریخ و ماہ انتقال عرض خدمت کر دیں گے ورنہ امید ہے کہ تھانہ بھون اور کاندھلہ کے خطوط سے معلوم ہو جائے گا....

مولوی مظہر صاحب دیر سے بیمار ہیں اور ضعف و کمزوری کا حال یہاں تک ہے

کہ بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور ابھی تک مرض زائل نہیں ہوا.... مولوی رشید احمد کے لئے بھی میں نے سنا ہے کہ چند دن سے بخار آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کریم رحم فرمائے.... ماموں جمیل الدین صاحب بھی دیر سے بیمار ہیں اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی بڑی بہن بھی سخت بیمار ہیں مختلف تدبیریں کی گئیں مگر کوئی دوا مفید نہیں ہوئی....

حکیم ضیاء الدین صاحب میاں علاء الدین کی سرسام کی اطلاع پر گذشتہ ہفتہ شنبہ کو بھوپال گئے مگر آج مولوی عبدالکریم رام پوری رام پور سے آئے اور شاملی گئے.... کہتے تھے کہ کل بھوپال کے (آئے ہوئے) خطوط سے ان کی صحت یابی کی خوش خبری ملی ہے.... میاں خلیل الدین صاحب رام پوری اہلیہ کو اس سال اپنے ساتھ لے گئے ہیں.... فاطمہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی امید ہے خیریت سے ہوگی میاں عبداللہ بڑوت میں اپنے کام پر ہیں.... دیگر عقیدت منداور نیاز مند و غلامان جناب خیریت سے ہیں.... کوئی بات لائق تحریر نہیں ہے جو عرض کروں....

مولوی محمد منیر صاحب مولوی مظہر کے چھوٹے بھائی اپنے ذاتی اوصاف کے علاوہ جناب والا کی عقیدت دل میں ایسی راسخ رکھتے ہیں کہ کیا عرض کروں.... اس وقت ان کے سر پر ان کی حیثیت سے زائد قرض کا بوجھ پڑ گیا ہے اور ادھر ان کے عہدہ میں تخفیف کی وجہ سے ہمیں پریشانی ہے.... کیونکہ اس ہجوم قرض کی وجہ سے ان کی مروت ہے.... اکثر ان کی پریشانی کی وجہ سے دل افسردہ رہتا ہے....

اور اب تک ان کا حال یہ ہے کہ جو شخص بھی جس چیز کی فرمائش کرے وہ اس کی فرمائش کی چیز لا دیتے ہیں اور کم لوگ ہیں جو اس کی قیمت دیتے ہوں.... اگر ان خوبیوں کی وجہ سے اور حضرت والا سے عقیدت و محبت کے سبب ان کے لئے دعا فرما دیں ہوسکتا ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پالیں.... ان کو آخرت (میں پرسش) کا ڈر زیادہ پریشان کرتا ہے....

دوسری گذارش یہ ہے کہ مولوی نذر اللہ خلف مولانا محمد رمضان صاحب

(آنجناب کے) اس حقیر خادم اور ننگ خاندان کے سامنے بہت معذرت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ (میں نے) تیرے متعلق نامناسب الفاظ لکھ دیے تھے.... حضرت والا (حاجی صاحب) ناراض ہو گئے.... یہ بات سن کر مسرت کی وجہ سے میں بے خود ہو گیا اور اپنی نالائقی کو دیکھتے ہوئے اور ان کی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت غوث الثقلین سے نسبت کی وجہ سے نادم و شرمسار ہو گیا ہوں.... مقصد یہ ہے کہ اول تو یہ ناکارہ خود سراپا عیوب ہے.... اگر کسی نے شکایت لکھی.... غلط بھی اگر لکھی تو غلط نہیں لکھی.... دوسرے یہ کہ پہلے تو سرور دین و دنیا صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک امتیاز اپنے نیاز مندوں پر کس قدر ناز فرمانا ہے اس چیز پر نظر کرتے ہوئے (مولوی نذر اللہ صاحب سے) ترش روئی کی جرأت نہیں ہوتی اور اگر اتفاقاً ہو جائے تو اس کو اپنی کم ظرفی سمجھتا ہوں.... لہٰذا امیدوار ہوں کہ ان کو راضی نامہ تحریر فرما کر مسرور و معزز فرمائیں اور اس نالائق کے لئے دعا فرمائیں کہ (میرے) عیوب کا انبار حق تعالیٰ اس طرح چھپا لے کہ پھر کسی اور کو شکایت کی گنجائش نہ باقی رہے....

حامل عریضہ منشی فضل حق احقر کے کرم فرما اور جناب والا کے نہایت عقیدت مند ہیں.... مزید یہ کہ سادات کرام میں سے ہیں اور شیخ ممتاز علی مرحوم کے رشتہ داروں میں سے ہیں.... نیز دین دار شخص اور مدرسہ کے ہمدرد ہیں.... ان کے حال پر عنایت ہو جائے.... میں ان کو اپنی جگہ سمجھتا ہوں (انہوں نے) صاحبزادہ میاں مقصود احمد کو اصرار کر کے ساتھ لیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ سے مخدوم عالم کی توجہ (منشی صاحب پر) ہو جائے زیادہ عرض کرنا گستاخی ہے.... حضرت (اہلیہ محترمہ) کی خدمت میں سلام مسنون.... اور حافظ احمد حسین سے سلام و نیاز کے بعد اہلیہ کی وفات پر تعزیت فرما دیں.... مولانا رحمت اللہ صاحب کی خدمت میں .... حافظ عبداللہ صاحب سے اور حاجی سکندر خاں اور میاں سعدی سے سلام مسنون ہے....

❁❁❁

مکتوب سوم

غلاموں میں سے نالائق غلام محمد قاسم (مرشد والا مقام) مخدوم جہاں سے (اللہ تعالیٰ ان کے فیوض سے قیامت تک لوگوں کو مستفید فرمائے) نہایت مخلصانہ سلام کے بعد عرض پرداز ہے کہ جناب والا کی ہدایت کے مطابق عزیز مقصود احمد کے (یہاں سے) روانہ کرنے کا اس طرح انتظام کیا تھا کہ ان کو منشی فضل حق دیوبندی کے ساتھ بھیج دیں اور منشی صاحب بھی مقصود احمد کی رفاقت اور اس کی خدمت کو جناب والا کی عنایات (مزید) کا ذریعہ سمجھ کر ان کے سب راستہ کے جملہ اخراجات اور ضروریات کا (اپنی جانب سے) انتظام کرنے کے لئے نہایت خوشی اور شوق کے ساتھ تیار ہو گئے تھے.... مگر جب عزیز مذکور کو دیوبند پہنچایا گیا اس نے رونا دھونا شروع کر دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی پرانی بری عادت کے مطابق راجو پور بھاگ گئے.... منشی صاحب اور دوسرے نیاز مندوں کو اس کی وجہ سے جو فکر و پریشانی اور شرمندگی کا غیر معمولی احساس ہوا وہ ناقابل بیان ہے.... بالآخر راجو پور سے اس کا پتہ ملا قصہ مختصر اس کی تلاش میں وہ تاریخ گذر گئی جس میں منشی صاحب کی روانگی طے کی گئی تھی.... مگر جب عزیز مذکور راجو پور سے واپس آئے پھر وہی رونا چلانا شروع کر دیا اور ادھر قسمت سے منشی صاحب میعادی بخار میں مبتلا ہو گئے.... مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان پر فضل الٰہی ہوا (اور وہ صحت یاب ہو گئے) پھر تقریباً ایک مہینہ کے بعد اس قصہ کو نئے سرے سے تازہ کیا گیا.... مگر ان میں ابھی ایسی طاقت وقوت نہیں ہے جیسی سفر کے لئے چاہئے نہ چلنے کی طاقت ہے نہ سامان اور بوجھ لدوانے کی ہمت (ان کا ایسا کمزور حال ہے کہ) اگر یہ سفر اس مبارک منزل کا نہ ہوتا تو شاید ایک شخص بھی ان کو اس سفر کی اجازت اور مشورہ نہ دیتا مگر ان کا شوق سفر حد سے زیادہ نظر آتا ہے اس لئے کسی نے ان کو سفر سے منع نہیں

کیا.... لیکن حضرت والا کے سب غلام مولانا رشید احمد صاحب.... مولانا محمد یعقوب صاحب منشی محمد اسمٰعیل راجوپوری حاجی محمد عابد صاحب جناب مولوی رفیع الدین صاحب اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور دوسرے صاحبان سب کی یہی رائے ہے کہ مقصود احمد کا یہ چلن ہے اور (منشی صاحب کی) طبیعت کا یہ حال ہے اس صورت میں ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ عزیز مذکور (مقصود احمد) کو ان کے ساتھ کیا جائے.... اللہ نہ کرے اگر راستہ میں کہیں فرار ہو گیا پھر کیا تدبیر ہو گی؟ نہ منشی صاحب تندرست ہیں کہ بھاگ دوڑ کر کے اس کا سراغ نکالیں.... نہ کوئی اور خدمت گار ساتھ ہے جس کو اس کام کے لئے کہہ سکیں اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات ہیں جن کا ذکر (یہاں) مناسب نہیں.... جو منشی صاحب سے معلوم ہو جائیں گی اس وجہ سے یہ رائے ہوئی ہے کہ مقصود احمد کو ان کے ساتھ نہ بھیجا جائے.... اس سب کے باوجود اگر حضرت عالی کا مقصود احمد کو مکہ مکرمہ بلوانے کا خیال ہے (اللہ خیریت رکھے) آنے والا سال (موسم حج) قریب ہی ہے ان شاء اللہ آئندہ سال بھیج دیا جائے گا....

باقی حضرت مخدوم جہاں کے سب خادم و نیاز منداور جملہ اعزہ حسب سابق اور اپنے اپنے حال کے مطابق ہیں.... کل گذشتہ اتفاق سے حامل عریضہ راؤ امداد علی خاں زیارت حرمین شریفین کے ارادہ سے پہنچے وہ اس ناچیز کے ذریعہ سے حضرت والا کے زمرہ نیاز مندان میں شامل ہیں (اب وہ) حضرت والا سے بلاواسطہ بھی بیعت سے مشرف ہونا چاہتے ہیں.... نیک آدمی ہیں.... زیادہ کیا عرض کروں کہ جناب والا کے اخلاق عالیہ خود ہی خادموں اور نیاز مندوں کی مدد (راہنمائی) فرماتے ہیں....

جناب حافظ احمد حسین کی خدمت میں حافظ عبداللہ صاحب سے شیخ سعدی سے قاضی بنیاد سے مولانا رحمت اللہ صاحب سے اگر یاد رہے میری جانب سے سلام پہنچے.... عاشق علی شاہ دیوبندی حضرت والا کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں....

عریضہ کمترین محمد قاسم از دیوبند.... ۱۴ شوال پنجشنبہ ۱۲۹۳ھ (۲ نومبر ۱۸۷۶ء)

مکتوب چہارم

کمترلوگوں میں سے سب سے بے حقیقت، محمد قاسم وہ سلام عرض کرنے کے بعد جو غلاموں کے مناسب ہے کہتا ہے کہ یہ خط لانے والے مولویوں فخر الحسن (نبیرہ شاہ حسن عسکری مرحوم) فرزند میاں عبدالرحمٰن مرحوم بن مولوی حبیب اللہ سہارنپوری ہیں۔ (انہوں نے) منقول ومعقول کی اکثر کتابیں مجھ سے پڑھی ہیں طبیعت کے فہیم اور قوی الحافظہ ہیں اور اس وقت مراد آباد کے مدرسہ میں جس کو اس علاقہ کے مسلمانوں نے چندہ کرکے بنایا ہے مدرس ہیں (زیارت حرمین کی) جذب وکشش کی وجہ سے اس دیار مقدس کا احرام باندھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت والا کی زیارت اور بیعت کا شوق رکھتے ہیں اگر قبول فرمالیں تو کیا ہی بہتر ہو یہاں کا مزید حال پچھلے خطوط سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ مولوی فخر الحسن صاحب کی زبانی بھی مفصل معلوم ہوگا۔ مگر ضروری تحریر یہ ہے کہ بھائی عبداللہ کی ہمشیرہ عزیزم محمد یاسین کی اہلیہ بہت دنوں سے (مختلف) امراض میں مبتلا ہیں اس وقت زندگی کی کچھ امید ہوئی ہے۔ حکیم حسین بخش رام پوری اور مولوی محمد یعقوب علاج کررہے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ حضرت کی دعا کی مدد اس علاج کو کامیاب فرمادے۔

میرے والد ماجد نے ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ دوشنبہ (۳۱ مارچ ۱۸۷۵ء) کو اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ ان کیلئے مغفرت کی دعا اور ان کی غلطیوں کی معافی کی درخواست ہے۔ اگر ان کی زبان پر کس وقت کوئی نامناسب بات آگئی ہو تو وہ ان کی سادگی اور جناب والا سے ناز برادرانہ تعلقات کی وجہ سے آئی ہوگی ورنہ ان کا دل

حضرت والا کی عقیدت سے لبریز تھا۔ خصوصاً اس آخر عمر میں بعض گفتگو اس طرح کرتے تھے جیسے (حضرت والا) سے باتیں کر رہے ہوں۔

حافظ عبدالرحمٰن خیریت سے ہیں تھانہ بھون میں تشریف رکھتے ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ رمضان المبارک گزرنے کے بعد اپنا حصہ فروخت کرنے کیلئے تشریف لائیں اور مولانا رشید احمد کے سامنے اسی مقصد سے آئیں گے کہ یہ معاملہ نمٹ جائے' فی الوقت بھائی عبداللہ اس کے خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ اور خریداروں سے کم قیمت لگائیں۔ دیکھئے اس قصہ کا کیا انجام ہوتا ہے۔

اور میرا دگرگوں حال لائق اظہار و بیان نہیں ہے اگر عرض کروں بلاوجہ حضرت والا کے رنج و ملال کا سبب بنے گا اس کے باوجود (یہ بھی) جانتا ہوں کہ جناب والا کے عام لطف و کرم سے محروم نہیں ہوں۔ لہٰذا کیا ضرورت ہے کہ بار بار دعا و ہمت کی درخواست کر کے جناب والا کے اوقات اور مصروفیات میں خلل ڈالوں۔ مگر اس قدر درخواست ضرور کرتا ہوں کہ اس ناچیز پریشان روزگار کیلئے اس مرتبہ یہ دعا (اپنے معمولات میں) اضافہ فرمالیں کہ اس ناچیز کے قدم روزی کی طلب میں سرگرداں نہ ہوں۔ میں اپنے ارادہ اور ہمت پر قطعاً بھروسہ نہیں رکھتا۔ بارہا تجربہ کیا ہے۔ سینکڑوں مرتبہ پختہ ارادہ باندھا ہے مگر ہر مرتبہ نفس بدراہ کے اشارہ پر اس کو بالکل توڑ دیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ یہ ناچیز معاش کی تلاش میں دوسروں کے سامنے رسوا نہ ہو جائے۔ میں کم ہمت کمزور یقین والا اور اللہ تعالیٰ بے نیاز' سوچتا ہوں معاملہ کس طرح (حل) ہوگا' اگر نگاہ ہے تو حضرت کی توجہ (اور دعا) پر نگاہ ہے۔ کاش حضرت والا کی برکت سے دنیا میں رسوا نہ ہوں۔

حافظ عبداللہ صاحب اور دیگر خدام کی خدمت میں نیز مولانا رحمت اللہ صاحب سے بشرطیکہ یاد رہے سلام مسنون اور دعا خیر کی درخواست ہے۔ ایک دوتہی حاجی حافظ قادر بخش صاحب سہارنپوری کے ہاتھ ارسال خدمت ہے۔ اگر پہنچ جائے تو اس کے قبول فرمانے کی امید رکھتا ہوں۔ مخدومہ محترمہ کی خدمت میں احقر کا سلام قبول ہو۔

مکرر عرض یہ ہے کہ مولوی محی الدین احمد خان فرزند ارجمند نواب شیر علی خان مرادآبادی احقر سے وہی تعلق رکھتے ہیں جو مولوی فخر الحسن مذکورہ رکھتے ہیں اور وہ بھی حضرت والا سے بیعت اور استفادہ کا شوق رکھتے ہیں اور جوان صالح ہیں ان کو بھی محروم نہ فرمائیں۔ میاں محمد خلیل گنگوہی خلف میاں ولی محمد گنگوہی اگرچہ ناچیز کے توسط سے حضرت والا کے حلقہ بگوش ہیں مگر جو برکت خود حضرت کے مبارک ہاتھ میں ہے وہ حضرت کی خاص توجہ پر موقوف ہے یہاں ایسی کہاں امید ہے کہ وہ کامیاب ہوں۔

نیز یہ کہ مولوی رفیع الدین کے خط سے اور مولوی فخر الحسن کی زبانی جو ابھی حال میں اس طرف سے آئے ہیں معلوم ہوا کہ منشی فضل حق نے سواری اور ایک حجام کو تھانہ بھون بھیجا تھا اور عزیز مقصود احمد کو دیوبند طلب کیا تھا۔ اس ڈر سے کہ راستہ میں سے فرار نہ ہو جائے ایک حجام کو وہاں سے بھی ساتھ کر دیا تھا تا کہ اگر ایک کو کچھ ضرورت پیش آئے یا اپنے کام سے جائے تو دوسرا نگرانی کے لئے موجود رہے (مقصود احمد نے) یہاں پہنچ کر راجو پور (جانے) کی اجازت چاہی مولوی فخر الحسن فرماتے تھے کہ اس خیال کو بھاگنے کا بہانہ سمجھ کر منشی صاحب نے تامل کیا مگر (ادھر) منشی صاحب اپنی کسی ضرورت سے گھر میں گئے ادھر وہ (مقصود احمد) فرار ہو گئے حجام کو راجو پور بھیجا گیا اس نے وہاں پہنچ کر مقصود احمد سے چلنے کیلئے کہا مگر مقصود احمد نے صاف انکار کر دیا۔ حامد علی خان کہتے تھے کہ میں اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ چنانچہ وہ عزیز مذکور کو لے کر دیوبند آئے۔ مگر عزیز مذکور نے (حسب معمول) رونا چلانا شروع کر دیا کہ میرا دل پریشان ہے اور میں ہرگز عرب نہ جاؤں گا مگر بہت کچھ سمجھانے سے کسی قدر آمادہ ہوا ہے لیکن بعض سمجھدار اس کے راستہ سے بھاگ جانے کے ڈر سے اس کو ساتھ لے جانے کا مشورہ نہیں دے رہے۔ لہٰذا منشی صاحب مجبور ہو گئے۔ ان کو بے حد افسوس ہے کہ وہ یہ خدمت انجام دینے سے قاصر رہے۔ (یادگار تحریریں)

❀❀❀

قاسم العلوم، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کے

مکتوبات وافادات کا ایک نادر وغیر مطبوعہ مجموعہ

مکتوباتِ قاسمی

(عکس نسخہ پھلاودہ، مکتوبہ ۱۳۲۲ھ)

تعارف وپیش کش

نورالحسن راشد کاندھلوی

مکتوبات قاسمی

مندرجات، خطی نسخے، مرتب وناقل اور متعلقات

نورالحسن راشد کاندھلوی

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم کے علوم وافادات کا بڑا حصہ حضرت مولانا کے ...
میں محفوظ ہے، جس میں سے اکثر معلوم مجموعے شائع ہو چکے ہیں، کچھ بار بار چھپے ہیں ...
ایسے بھی ہیں جو ایک دو مرتبہ ہی شائع ہو سکے اور مرتب ومعلوم مجموعہائے مکتوبات ...
مجموعہ مکتوبات ایسا بھی ہے جو تاحال شائع نہیں ہوا، یہ مجموعہ مکتوبات قاسمی ہے۔ راقم ...
اس مجموعہ مکتوبات کے دو نسخوں کا علم ہے جس میں ایک مکمل ہے دوسرا ناقص۔ جو مکمل نسخہ ...
پھلاودہ ضلع میرٹھ میں مولانا سید عبدالغنی صاحب پھلاودی کے ذخیرہ میں تھا جو حضرت مولانا مرحوم ...
کے پرپوتوں جناب ڈاکٹر سید محمد خالد اور سید محمد مطلوب صاحبان کی عنایت سے ہمارے پاس ...
آگیا ہے۔ جزاهما الله تعالیٰ

زیر نظر نسخہ کا تعارف اور ترتیب: یہ مجموعہ کب مرتب ہوا، کس نے ترتیب دیا ...
دونوں نسخوں میں اس کی صراحت نہیں۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ترتیب میں مولانا عبد ...
الغنی صاحب پھلاودی کی کوشش شامل رہی ہوگی، کم از کم زیر نظر نسخہ کی نقل مولانا کی ...
مرہون منت ہے۔

اگرچہ اس کا نام مکتوبات قاسمی ہے، مگر یہ بھی حضرت کے مکتوبات کے بعض اور مجموعوں کی ...

طرح مکتوبات و افادات کا مشترک مجموعہ ہے، جس میں تین خط ہیں اور ایک بہت مفصل بحث وضوء اور طہارت و نجاست کے شرعی احکامات کے عقلی حکمتوں پر ہے اور اس کتاب یا مجموعہ کا بڑا حصہ اسی تحریر و افادہ پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں شامل تینوں خطوط اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہیں یہ صفحات پوری کتاب کے کل صفحات کے ایک تہائی سے کچھ ہی زیادہ ہیں، باقی تقریباً دو تہائی صفحات پر (ص ۴ سے ۳۴ تک) یہ افادہ اور بحث درج ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی کا یہ رسالہ یا افادہ ایک پادری کے اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا، مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ پادری کون تھا اور یہ اعتراضات کس وجہ سے اور کس موقع پر کئے گئے تھے اور ان اعتراضات کے اصل مخاطب حضرت مولانا ہی تھے یا حضرت کے پاس ضمناً کہیں اور سے آئے تھے۔ غالباً پادری صاحب کے اعتراضات کسی نے خط میں لکھ کر حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجے تھے، اس کے جواب میں حضرت مولانا نے یہ جامع اور مفصل تحریر مرتب فرمائی تھی اعتراضات و سوالات یہ تھے:

۱۔ ریاح خارج ہونے سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

۲۔ قہقہہ سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

۳۔ نیند سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

حضرت مولانا نے تینوں سوالات کے مفصل جواب اپنے خاص متکلمانہ عقلی اصول پر تحریر فرمائے، آخری سوال کے جواب میں اس پر بھی بحث فرمائی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کیوں ناقض وضو نہیں، اور اسی کے آخر میں انبیاء علیہم السلام پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ نہ ہونے کا بھی ذکر ہے مذکورہ تینوں سوالات کے علاوہ اسی سلسلہ کا ایک سوال یہ بھی تھا کہ:

گندگی نجاست کے ایک خاص جگہ سے نکلنے کی وجہ سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟"

حضرت مولانا نے اس کا جو جواب لکھا یا فرمایا تھا وہ مکتوبات قاسمیہ میں شامل نہیں، مگر اس کا جواب مولانا قاری محمد طیب نے مولانا عبدالرحمان امروہوی کی زبانی (حضرت نانوتوی کے

حوالہ سے) سنا تھا، یہ جواب مولانا طیب صاحب نے "اسرار الطہارہ" میں نقل کیا ہے، اگر چہ اس سوال وجواب کا مکتوبات قاسمی کے پیش نظر نسخہ میں ذکر نہیں، مگر اس موضوع کے مباحث کی تکمیل کے لئے یہ جواب بھی مکتوبات کے بعد ضمیمہ میں شامل کیا جارہا ہے۔

اس مجموعہ کی ترتیب میں مکتوبات اور محولہ بالا افادہ کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی خط اور افادہ بلا کسی عنوان کے مشترک طور پر نقل ہیں۔ نسخہ کی ترتیب یہ ہے:

ا۔ سب سے پہلے ایک خط ہے جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں، پھر پادری کے اعتراضات کے جواب پر مشتمل تحریر ہے، جو تیں صفحات پر مشتمل ہے (ص ۴ سے ۳۴ تک) اس کے بعد دو خط ہیں، ایک فارسی میں ایک اردو میں، اسی پر کتاب ختم ہوگئی۔ ترقیمہ کے بعد ایک خط اور نقل کیا گیا ہے، جس کو ضمیمہ کہنا چاہئے۔

پہلے خط کے مکتوب الیہ کی صراحت نہیں اس کا سرنامہ یہ ہے:

"اجی مولوی صاحب، حافظ صاحب، حاجی صاحب! السلام علیکم الخ"

اس طرز تخاطب سے خیال ہوتا ہے کہ یہ گرامی نامہ مولانا عبدالغنی صاحب یا مولانا سید احمد حسن امروہوی کے نام صادر ہوا ہوگا، حافظ مولانا عبدالغنی صاحب تخلص تھا، حضرت مولانا ان کو حافظ صاحب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ جن کے نام کے ساتھ حافظ کا لاحقہ استعمال ہوا ہے اور حضرت ان کو بھی کبھی کبھی حافظ صاحب کہتے تھے، مولانا سید احمد حسن امروہوی تھے، اس لئے خیال ہے کہ یہ خط مذکورہ دونوں احباب میں سے کسی کے نام ہوگا۔

دوسرا خط حافظ عبدالرحیم صاحب کے نام ہے۔ تیسرا مولانا عبدالعدل پھلتی کو لکھا گیا ہے۔ مولانا عبدالعدل پھلتی کے نام گرامی نامہ کو دو حصوں پر منقسم سمجھنا چاہئے، پہلا حصہ جو تقریباً دو صفحات پر مشتمل ہے، ذاتی شخصی احوال وتذکرہ پر مشتمل ہے، اس میں مولانا عبدالعدل کی صحت پر اظہار مسرت ہے، اپنے ضعف اور کمزوری کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ ضعف دماغ بے حد ہے، سر کے بال سب گر گئے ہیں:

"ضعف دماغ ہماں است کہ بود، کہ باز موہائے سرم ہمہ ریختند، بہر

صحیح کہ از ہوائے سرد باشد اندیشہ ایں خلش است، ایں بار خلاف عادت
یک لنگی بار سرم می ماند" (۱)

اس خط میں مولانا محمد یعقوب کی اہلیہ کی وفات کے حادثہ کی خبر ہے اور اس موقع پر مولانا محمود حسن (شیخ الہند) حادثہ وفات کے فوراً جس جانکاہی اور نیاز مندی سے اندھیری رات میں دیوبند سے نانوتہ کا پیدل سفر کے بلا تاخیر صبح چار بجے حضرت مولانا محمد قاسم کو اس واقعہ ہائلہ کی خبر پہنچائی، اس کا بھی خاص انداز میں ذکر ہے (۲) اور مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کی سعادت مندی کی تحسین فرمائی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"ہمہ وابستگان بخیر اند، اما اہلیہ احقر را صدمہ جانگداز دی شب بجان رسید ساعتے پیشتر از صبح مولوی محمود حسن صاحب پاپیادہ بہ معیت دیگرے از دیوبند رسیدند، و خبرے انتقال اہلیہ مولانا محمد یعقوب صاحب رسانیدند۔ غرض ایں افتاں و خیزاں آمدنی آں بود کہ میاں معین الدین بہ نانوتہ بودند، آنجا فکر رسیدن اوشاں بجنازہ بود۔ چوں دیگرے کفیل ایں کار نشد، بحکم سعادت کہ زائد از دیگراں نصیب اوشاں شد، بیاد حق استادی برخاستند و خبر ایں واقعہ کہ وقت نواخت یازدہ جاں گزاشد، قریب نواخت چار رسانید انا للہ و انا الیہ راجعون!"

اس کے بعد تقریباً سات صفحوں میں حضرت مولانا کے اپنے ایک مضمون کی وضاحت اور مولانا عبد العدل کے حسب طلب ولکن رسول اللہ و خاتم النبین سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے ثبوت پر مفصل گفتگو فرمائی ہے اور اسی بحث کے اختتام پر یہ

(۱) مکتوبات قاسمی ص ۳۹

(۲) حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ وفات کا واقعہ تقریباً گیارہ بجے پیش آیا تھا اور اس کی خبر لے کر مولانا محمود حسن اسی وقت نانوتہ روانہ ہو گئے تھے اور تقریباً چار بجے یہ اطلاع حضرت مولانا محمد یعقوب کے فرزند مولوی میاں معین الدین کو پہنچادی تھی، اس کو خاص غیبی مدد کہیے یا کرامت کہ دیوبند سے نانوتہ کا فاصلہ جو چھبیس کلو میٹر ہے کچے راستے سے، رات میں تقریباً چار گھنٹے میں طے ہو گیا تھا۔ مولانا محمد یعقوبؒ کی اہلیہ کی وفات ۱۴ رمضان ۱۲۹۳ھ کی شب میں ہوئی تھی۔ رمضان المبارک کی مشغولیات کے ساتھ اس سرعت کے ساتھ سفر طے ہوا کہ چار بجے یعنی تقریباً چار گھنٹے میں دیوبند سے نانوتہ پہنچ گئے، حیرت انگیز ہے۔

مجموعہ بھی اختتام پذیر ہو گیا ہے۔

تعارف نسخہ: یہ نسخہ کل اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے، تحریر خوبصورت نستعلیق ہے، جو باد نظر معلوم ہوتی ہے، یہ نسخہ مولانا عبد الغنی کے بھائی، محمد ابراہیم پھلاودی نے نقل کیا ہے۔ زرد رنگ کے کسی قدر دبیز کاغذ پر لکھا ہوا ہے اور ہر پہلو سے نہایت عمدہ ہے۔ اس کے اختتام مختصر سا ترقیمہ بھی درج ہے، جس کے الفاظ یہ ہے:

"الحمد للہ! کہ امروز تاریخ پانزدہم ماہ محرم در ۱۳۲۲ھ یک ہزار و سہ صد و بست و دو ہجری نبوی صلعم از نقل جملہ تحریرات انفراغ یافتم"

بقلم خادم قدیم محمد ابراہیم غفرلہ۔

اس نسخہ کا ضمیمہ: یہ مجموعہ درج بالا سطور اور مذکورہ تین خطوط کی تکمیل پر مکمل ہو گیا۔ مگر اختتام نسخہ اور ترقیمہ کاتب کے بعد ایک خط کا اور اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ حضرت مولانا نے منشی ممتاز علی صاحب مالک مطبع مجتبائی میرٹھ و دہلی کو ان کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، یہ نامہ بھی تحذیر الناس پر رد و جواب کے سلسلہ تحریرات کی ایک کڑی ہے، اس میں حضرت مولانا نے منشی کو ہدایت کی ہے کہ مولانا محمد علی کے نام جو خط لکھا ہے وہ اصل خط جا رہا ہے اس کو مولانا کے حوالہ کر دینا۔ حضرت مولانا کا منشی جی کے نام یہ خط ذاتی نوعیت کا ہے اور ایک مرتبہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے ماہنامہ دار العلوم، دیوبند: ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ میں شائع کرادیا تھا، یہ اشاعت اسی قلمی نسخہ پر مبنی ہے جس کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس نسخہ کی نقل اور طباعت: مکتوبات قاسمی کے اور کسی مکمل نسخہ کا راقم سطور کو علم نہیں تاہم اس کے ابتدائی صفحات کی ایک خوشخط نقل جناب حکیم سیف الدین احمد صاحب (محلہ نئی سرائے میرٹھ) کے ذاتی ذخیرہ میں راقم کی نظر سے گذری ہے اور اس کے سات صفحات کا فوٹو اسٹیٹ بھی میرے پاس ہے۔ نسخہ میرٹھ پر اس تالیف کا نام مکاتب قاسمیہ درج ہے۔

نسخہ پھلاودہ اور نسخہ میرٹھ دونوں قلم کا بہت مشابہ ہے، ممکن ہے دونوں ایک ہی شخص کے

قلم سے ہوں، مگر یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے یہ مجموعہ مکتوبات (راقم سطور کی معلومات میں) اس وقت تک شائع نہیں ہوا، اسی لئے نسخۂ پھلاودہ کا جوں کا توں عکس شائع کیا جارہا ہے۔

مکاتیب قاسمیہ میں شامل افادہ کا ایک اضافہ اور تکملہ: مولانا قاری محمد طیب صاحب کی فرمائش پر، پھلاودہ سے حضرت مولانا نانوتوی کے غیر مطبوعہ افادات کے کچھ صفحات کی نقل مولانا قاری طیب صاحب کو بھیجی گئی تھی، جس میں یہ صراحت نہیں تھی کہ یہ کیا کتاب ہے، کہاں سے حاصل یا نقل ہوئی ہے اور اس کی کیا افادیت و اہمیت ہے اور بہ ظاہر اس نسخہ کا نقل کے بعد اصل سے مقابلہ بھی نہیں کیا گیا تھا، مولانا قاری طیب صاحب نے اس کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "حسب وعدہ کچھ عرصہ ہوتا ہے کہ فولسکیپ کی نصف تقطیع کے ستاون صفحے نقل کرا کر ارسال فرمادئے، جو شاید کل ذخیرہ کا کوئی قلیل جزو معلوم ہوتا ہے، جس میں بعض ملفوظات ہیں اور بعض مکتوبات جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں اور عجیب و غریب نکات و لطائف کا خزینہ ہیں چونکہ اصل تحریرات دستیاب نہیں ہوئیں اور نہ غالباً نقل کے بعد اصل و نقل کا مقابلہ کیا گیا اور پھر اسی کے ساتھ اکثر مضامین میں روایت بالمعنی کی گئی ہے، اس لئے کہیں املا کی غلطیاں اور کہیں نفس عنوان یا تعبیرات کی کوتاہیاں دیتی ہیں"

مولانا قاری طیب صاحب نے موصولہ نسخہ کی فروگذاشتوں اور نقل کے ناتمام ہونے کے احساس کے باوجود اس کی خدمت پر توجہ فرمائی اور اس پر بعض افادات کا اضافہ فرما کر "اسرار الطہارہ" کے نام سے شائع کردیا تھا۔

اسرار الطہارۃ رسائل کے معمولی کے عام سائز سے بڑے سائز کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں پہلے چار صفحے تمہید کے ہیں، اس کے بعد صفحہ ۵ سے ۲۲ تک اٹھارہ صفحات میں اصل کتاب آئی ہے، چوں کہ مولانا طیب صاحب کو جو نسخہ ملا تھا قاری صاحب کے ارشاد کے مطابق اس کے:

"اکثر مضامین میں روایت بالمعنی کی گئی ہے، کہیں املاء کی غلطیاں اور کہیں نفس عنوان یا تعبیرات کی کوتاہیاں دکھائی دیتی ہیں"

مگر قاری صاحب نے اس نسخہ کی اساس پر اس کو مرتب فرمایا اس پر ایک مفید ا... بھی کیا، جو اس مجموعہ افادات کی تکملہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مولانا نے طہارت و نجاست کی جن حکمتوں اور پہلوؤں کا اس تحریر میں ذکر... ہے اس کے سلسلہ کا ایک افادہ مولانا قاری طیب صاحب نے مولانا عبدالرحمن امروہوی (۰۰ ـ ۱۹۴۸ء) کی زبان سے سنا تھا، جو مولانا عبدالرحمان نے اپنے استاد سید احمد حسن امروہوی سے اخذ کیا ہوگا، جو حضرت مولانا نانوتوی کے خاص بلکہ مایہ ناز شاگرد تھے۔ اس افادہ میں اس ... کا جواب ہے کہ:

"خروج نجاست (بول و براز) ناقض وضو کیوں ہے، حالاں کہ بظاہر نجاست کا بدن سے منفصل اور جدا ہو جانا باعث طہارت ہونا چاہیے نہ باعث نجاست"

مگر یہ افادہ جوں کے توں حضرت نانوتوی کے ارشادات و افادات نہیں بلکہ مہتمم صا... نے اس کو خاصے عرصہ کے بعد یادداشت سے کچھ اضافات کے ساتھ قلم بند کیا تھا، پھر ... اس کی اشاعت کا ارادہ ہوا تو اس میں نصوص شرعیہ اور دوسرے مباحث بھی شامل فرما... تھے اور اس مجموعہ کو "اسرار الطہارہ" کے نام سے شائع کر دیا تھا، لکھا ہے:

"پہلے سوال کا جواب احقر نے حضرت مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب دام ظلہ محدث امروہی کی زبان مبارک سے سنا اور اپنے الفاظ میں نیز اپنی ہی ذہنی تفصیل کے ساتھ بعد میں قلم بند کر لیا، مولانا نے اصول و اجمالی تقریر فرمائی تھی، احقر نے ضروری تفصیل و ترتیب کے ساتھ موقع بموقع اس میں نصوص شرعیہ کو بھی نقل کر دیا۔" (۱)

مذکورہ مجموعہ افادات اسرار الطہارہ کی اشاعت: اسرار الطہارہ کب چھپی اس

---

(۱) تمہید اسرار الطہارہ ص ۳۔

کی صراحت نہیں ملی، اس کے جو نسخے میری نظر سے گذرے ہیں وہ سب ایک ہی طباعت کے ہیں اور غالباً اس وقت تک یہی پہلی اور آخری طباعت ہے۔ اس کے ٹائٹل پر صرف یہ عبارت درج ہے:

اسرار الطہارہ

از افادات مبارکہ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب

بانی دارالعلوم نور اللہ مرقدہ

باہتمام

جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب و مولانا قاری محمد طاہر صاحب

در مطبع قاسمی واقع دیوبند طبع گردید

یہ تالیف یا افادات قسط وار کسی رسالہ میں چھپے تھے، ان صفحات پر رسالہ کا نام درج نہیں مگر (ص ۸ پر) لکھا ہے: "باقی آئندہ" ص ۱۲ کے صفحہ کے آخری کونہ پر بھی یہی اندراج ہے، پھر ص ۱۸ پر بھی الفاظ ملتے ہیں اور صفحات کا مذکورہ شمار بھی مسلسل صفحات کا نہیں ہے، صفحات بے ترتیب اور اسی رسالہ کے مطابق ہیں جس میں یہ ترجمہ قسط وار چھپا تھا۔

رسالہ میں اشاعت کے بعد اس پر تمہید کا اضافہ کیا گیا جو چار صفحات پر مشتمل ہے اور ٹائٹل لگوایا گیا، مگر صفحات کی ترتیب درست کرنے پر توجہ نہیں کی گئی، صفحات وہی رسالہ کے نکلے ہوئے اوراق ہیں۔

حضرت مولانا کے افادہ کا صرف وہ حصہ جو مکتوبات قاسمیہ کے زیر نظر نسخہ میں شامل نہیں اور جو مولانا محمد طیب صاحب نے مولانا عبدالرحمان امروہوی سے سنا تھا اور مولانا طیب صاحب کی اس تحریر کے آغاز پر شامل ہے، افادات کی تکمیل کے لئے زیر نظر نسخہ کے آخر میں ضمیمہ کے طور سے شائع کیا جارہا ہے۔ (نور)

مکتوبات قاسمی

مرتبہ (غالباً) مولانا عبد الغنی پھلاودی مکتوبہ ۱۳۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتوب اول ازجی مولوی صاحب حافظ صاحب حاجی صاحب السلام علیکم آج سترہویں روز پنجشنبہ
کو آپکا عنایت نامہ آیا اگرچہ سلام روستائی ہی پر ہمیں یاد کرنیوالوں کی ممنون ہونیکی لئی کافی
ہی آپ کو اشارہ و تعجیل کی شعر کی پیرایہ مین تاکید فرمانی کی کیا حاجت تھی مین تو یون بھی
آپ کی نام خط لکھنی کی لئی فقط بہانہ ہی کا طالب ہون سنئے اسمین تو شک نہین کہ کوئی
لفظ اپنی معنی مطابقی سی زیادہ دلالت نہین کرسکتا پھر جب کوئی لفظ اوسکی ساتھ
ملالیجئی تو مجموعہ اول و ثانی لاریب مجموعہ معنیین پر دلالت کریگا لیکن ملانی کی کئی
صورتین ہین ایک تو یہی الحاق لفظی جیسی یہان اول کی ساتھ لفظ المومنین ملحق ہوگیا
ہی کہ قبل الحاق مضاف الیہ مشار الیہ اول اولیت مطلقہ پر دلالت کرتا تھا مومنین
غیر مومنین کی کچھ تخصیص نہ تھی بعد الحاق معلوم اون معنون مطلق پر ایک اور قید زائد
ہوگئی اگرچہ حاصل معنی نسبت حاصل معنی اول کم ہوگیا کیونکہ خاص اور مقید ہی اگرچہ
باعتبار معنی مدلول عام اور مطلق سی زیادہ ہون پر وسعت مصداق مقید و خاص
وسعت مصداق مطلق اور عام سی کم ہوتی ہی دوسری الحاق معنوی یعنی لفظون کو ملانا

نزانا ملحق یہ تھا ہو پر معانی کو دیکھئے تو اوسکے ساتھ معنی لفظ دیگر ملحق ہوں مگر اسکی
دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ گو قرینہ لفظی بدلالت عقلی کسی لفظ پر دلالت کرے
اور وہ لفظ بدلالت لفظی معنی زاید پر دلالت کرے مثلاً کلام اللہ میں فرماتے ہیں فان لم
تفعلوا ولن تفعلوا دونوں تفعلوا کا مفعول محذوف ہے پر بقرینہ فاتوا بسورۃ من مثلہ مفعول
معلوم ہے الغرض لفظ بظاہر مطلق ہے پر بدلالت قرینہ لفظیہ مقید ہے لہذا یہاں السورۃ
اوسکے ساتھ ملحق ہے غرض متکلم نے جسکو قرینہ کے بھروسے حذف کیا تھا مخاطب نے بدلالت
قرینہ اوسکو ملحق کر لیا دوسری یہ کہ کوئی قرینہ خیالی جسکو اتفاقات مناسبت کہئے اوسپر دال
ہو قرینہ لفظی کوئی بھی ہو تو صورۃ مسئولہ میں یہی صورۃ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام
توریت لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لیگئے تھے چنانچہ شروع رکوع میں فرماتے ہیں وٰوٰعدنا
موسیٰ ثلثین لیلۃ واتممنٰہا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ اور اسمیں چلہ کشی
موسوی کی طرف اشارہ ہے تو یہ چلہ اپنی نعمت کے حصول کا مقدمہ تھا اور وکتبنا لہ فی الا
لواح من کل شئی موعظۃ الخ بھی اسکی طرف اشارہ ہے اور ظاہر ہے کہ توریت آپکے اور
آپکی امت کے لئے عطا ہوئی تھی اس صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غرض وقت
ورود انا اول المومنین اس گروہ خاص کی طرف ہونی چاہئے اور یہ قصہ ایسا ہی ہے جیسا
یا یوں چند آدمیوں کی دعوت کریں اور کہلا بھیجیں تو پوچھنے والوں کی جواب میں
کہیں کہ سب کو کہلا بھیجے سو پوچھنے والوں کو اور جواب دینے والوں کو وقت سوال و جواب

جو ایک ہی لفظ یعنی سب کو کہلا چکنی ہی متصور ہی گروہ خاص پر نظر ہی یعنی
مدعو وین ملحوظ نظر ہی کافہ انام جو مدلول ظاہری ہی مراد نہین سو جیسی بیان کر
لفظی نہین فقط قرینہ خیالی اوسپر شاہد ہی ایسی ہی جملہ مومنین مراد نہین مومنین
موسیٰ علیہ السلام مراد ہین الغرض لفظ اگرچہ عام ہی پر قرینہ خیالی تخصیص ہی
قسم کی قرینہ لفظون مین مذکور نہین ہوتی تو بظاہر نظر دہوکا پڑتا ہی لیکن نظر کو غا
دیکہیئی تو کوئی دہوکہ کی بات نہین رہتا آپکا گانا آپ کا وعظ سنانا ہی یہہ تو
راگ مین استماع مخاطبین مدنظر ہوتا ہی سو اگر فائدہ کیا اتفاق ہوتا ہی تو پسند بہی
اور اثر بہی کر جاتا ہی سو آپ کو خدا تعالیٰ نی اور آپ کی راگ مین یہہ بات
ہی اب میرا حال سنئی بظاہر اچہا ہون اگرچہ بیمار رہنی پر سے ہون تپ و درد
کبہی کو بخار درد سر لیا میری ناتوانی کی شرم بہی رکہ لی مگر اب بفضلہ تعالیٰ اچہا ہون
زور پر ہے اور کیون نہو کہ احباب اور اعداء دونون کی ہاتہ لگنی کیا کیا نہین اوٹہاتی پڑتی
بالفعل سب اچہی ہین ہان خوب یاد آیا ہمین تو آپ کی گہر والی یاد کرتی ہین جب آپ
آتی تو ہمین ہی کیا آنا پڑا ہی مولوی صاحب کی گہر بہی خیریت ہی ابہی چچا اور دادی
بیگی بہائی وغیرہم کو یاد رہی تو میرا سلام کہہ دینا مولوی معین الدین صاحب کو اگرچہ
دیگاہ بخار آ دباتا ہے پر کوئی کام بہی نہین اونکی والد بہی اب بہ نسبت سابق
ہین پر منشی محمد یٰسین کی بخار شدید مین بظاہر ورم جگر ہی اور وہ بہی دیر کا آج شاید

میں بخش رام پوری کی پاس لگئی ہیں فقط ؛ مکتوب دیگر الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ
والسلام علی خیر خلقہ محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین بعد حمد و صلوٰۃ یہ گزارش
ہے کہ آریہ وغیرہ ہنود والے جب اہل اسلام کے عقائد میں مجال دم زدن نہیں پاتے تو اونکے اعتراضوں
کے مقابلہ میں جو وہ اور ونکے عقائد پر کرتے ہیں اہل اسلام کے فروع اور مسائل پر اعتراض کرتے
ہیں حالانکہ اہل عقل کے نزدیک بعد ثبوت عقائد و درستی اصول اعمال کے وجوہ کے بارہ میں
کرنے ایسی ہے جیسی بعد اسباب کے معلوم ہوجاتی کہ ملکہ بادشاہ ہند ہے اور کلکٹر اوسکا
مقرر کیا ہوا حاکم قانون سرکاری اور احکام سرکاری میں جو بواسطہ کلکٹر وغیرہ نافذ
اور جاری ہوتے ہیں تکرار کیجیے اور اونکی اوپر اعتراض کیجیے جیسے اس قسم کا شخص لایق
جواب تو کیا ہوتا اولٹا قابل مواخذہ ہوتا ہے ایسی ہی وہ شخص جو فروع پر اعتراض کرے
نالایق جواب تو کیا اولٹا لایق عتاب خداوندی ہے القصہ حکام کی بات میں جیسے چون
و چرا مناسب نہیں ہوتی اور دلیل اونکے احکام کا ماننا لازم ہوتا ہے اس سے بڑھکر خدا کے احکام
میں چون و چرا نامناسب ہے اور بے دلیل تسلیم کرنا واجب ہے ہاں جیسے حکام کو بوجہ مراعات
عدل تنفیذ احکام اور تجویز قوانین میں وجوہ اور حکمتوں کا لحاظ ہوتا ہے گو بوجہ حکومت
اونکو ضرورت کچھہ نہو ایسی ہی خدا تعالیٰ کے احکام میں بلحاظ عدل حکمتیں اور وجہیں ہوتی
ہیں بوجہ حکومت اوسکو کچھہ ضرورت نہیں ہوتی مگر ہر چند بآواز استفسار دلائل و وجوہ
احکام بنظر تسلیم سخت گستاخی ہے مگر ہم بپاس ملت محمدی اس پر بھی بادر لعباب کے

اون چار اعتراضون کی جواب جو اونہون نے بعض احکام وضو پر وارد کیے ہین لکھ دیے پر
مگر اول پادری صاحب سے یہہ التماس ہے کہ آپ اول تثلیث اور کفارہ کی وجہہ بتلائیے جو
آپ کے دین کے اصل اصول ہین تماشا ہے کہ پادری صاحب ایسے نامعقول عقیدے تو تسلیم کیے
بیٹھے ہین کہ جنکو نہ عقل مانے نہ نقل سے ثبوت ہو نہ انجیل مین پتہ ہو نہ توریت مین ذکر ہو نہ
پہلے کسی نبی نے اونکی طرف ہدایت فرمائی نہ کوئی کتاب اونکی تائید مین آئی جسکی وجہہ سے
یہہ کہنا لازم آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے پہلے جتنے نبی یا ولی یا صلحاء یا شہداء ہوئے
سب دولت ایمان سے بے بہرہ رہے عوام تو عوام پادری صاحب آپ کس منہہ سے اہل اسلام پر
اعتراض کرتے ہین تین خداؤنکو ایک کہو اور ایک کو تین کہو ایسی محال بات کو مان کر
بھی آپ کو ہوس اعتراض اہل اسلام پر ہے یہہ وہ عقیدہ غلط ہے کہ بت پرستان جاہل
بھی اسکو سنکر کانون پر ہاتھ دھرتے ہین اول تو کوئی بت پرست خدا کو متعدد نہین کہتا نہ عرب
کے جاہل مشرک نہ ہندوستان کے بیوقوف صورت پرست سب کے سب پیدا کرنے والا ایک
ہی کو سمجھتے ہین گو کسی اور وجہہ سے اورونکی بھی عبادت کرتے ہون دوسرے اوسپر یہہ طرّہ کہ
ایک اور محال بھی سر دھرتے یعنی تین خداؤنکو پھر ایک کہتے اور وحدت حقیقی اور کثرت
حقیقی کو اکھٹا کر دکھلایا رہا کفارہ اوسکے یہہ معنی ہوئے کہ کرے کوئی بھرے کوئی گناہ کرین اُمتی
پکڑے جائین حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو خدا بھی خدا کے بیٹے بھی اس عالیشان پر تین دن تک
مین رہنے سے تو یہی بہتر تھا کہ بندہ رہتے کہ خدا اور خدا کا بیٹا نہ بنتے یا باہم تثلیث کا

تو کہیں پتہ بھی نہیں انجیل میں ہوتا تو ہوتا اور کہیں بھی نہو تو پھر کہاں ہو رہا کفارہ اور کہیں
یہ اتنی بات تو اس انجیل محرف سے نکلتی ہے کہ تین دن کے بعد قبر میں نعش کا پتہ نہ ملا
کہنے والے تو کہہ سکتے ہیں کہ کہیں نعش نکال لے ہو گی باقی اور جو کچھ ہے یہ نصرانیوں کا ایجاد بندہ
ہے یاد رہے جب آپ اول اسکا جواب عنایت فرماویں اور پھر ہماری جوابات ملاحظہ فرماویں

جواب اعتراض اول معدہ یا ماتحت معدہ جب پائخانہ سے بھر جاتا ہے تو طبیعت اوسکی
نکالنے اور بار سے سبکی کی فکر میں ہوتی ہے اوسکی اوس حرکت طبعی کی باعث ہوائی محتبس بھی
اوپر کو ہو لیتی ہے غرض گوز کا آنا اور پائخانہ پیشاب کا آنا بحکم طبیعت اسپر شاہد ہے کہ
اب ظرف ناپاکی معلوم پر ہو گیا اور ظاہر ہے کہ اوس ظرف کا ناپاکی سے پر ہو جانا اسقدر طبیعت
کو مکدر کر دیتا ہے کہ ہر فرد بشر اوس سے واقف ہے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام رونق افروز
ہوتے تو وہ بھی اسکی تصدیق فرماتے سو اصل میں وہ کدورت ہے ناقض وضو ہے کیونکہ کدورت
صفائی کی مخالف ہے مگر جیسے معدہ وغیرہ کی استلاء سے جو اصل میں موجب آلودگی باطن
جسم انسان ہے روح کو بواسطہ جسم ایک آلودگی حاصل ہوتی ہے جسکا حاصل وہی
کدورت مذکورہ ہے ایسے ہی غسل و وضو وغیرہ سے جو اصل میں صفائی جسمانی ہے بواسطہ
جسم صفائی روحانی حاصل ہوتی ہے جسکا حاصل طہارت روحانی ہے اور وہ طہارت
موجب زوال کدورت مذکورہ ہو جاتی ہے جو نجاست روحانی تھی بالجملہ اصل میں وہ
امور منشاء مذکورہ ناقض وضو ہے اور خروج ریح و بول و براز اوسکی علامت ہے اور

بعض اوقات جو خلو معدہ پر ریح خارج ہوتی ہے تو اوسکا اعتبار نہیں اوسکی لحاظ سے ہو دہ
توڑئے تو گوز کی علی العموم برائی کا قاعدہ بھی باد ریصاحب کو توڑنا پڑیگا اور اسوجہ سے یہ بات
حالت میں کسی کا باد ریصاحب یا کسی اور کی ناک پر سُرین رکھکر گوز مارنا اور ایسی تو
کا سونگھنا بھی ممنوع و معیوب نہوگا غرض خلاف طبیعت اگر کوئی حالت مشابہ حالت
طبعی پیش آئے تو جب تک کچھ حرج اور دقت نہو اوسکو حالت طبعی کی حکم میں رکھا کرتے
ہیں تاکہ انتظام خراب نہو جائے دیکھئے شب کو جو وقت استراحت عام و خاص ہے
باہر اکثر چور بھی پھرا کرتے ہیں اسلئے ہر کسیکو محافظان سرکاری گرفتار کر لیا کرتے ہیں اور
کوئی کسی اور ہی ضرورت کی باعث پھرتا ہو فقط اس تقریر سے جیسا یہ سمجھ میں آگیا کہ خروج
ریح میں باوجودیکہ آثار ناپاکی نہیں یہانتک کہ اسلئے کپڑے اور بدن کی پاک کرنیکی ضرورت
نہیں وضو کیوں ٹوٹ جاتی ہے ایسے ہی یہ سمجھ میں آگیا ہوگا کہ پائخانہ اور پیشاب کی تنگی
سے وضو کیوں ٹوٹ جاتی ہے حالانکہ ناپاکی کا رہنا موجب ناپاکی نظر آتا تھا نکلجانا تو اور
موجب پاکیزگی ہوتا مگر جسکو فہم نہو اوسکی حساب سے یہ تقریر دلپذیر بھی لغو ہے اور کیوں نہ
لطف سیر گلزار و مشاہدہ انوار و دیدار خوبان دلارام و دل آزار آنکھوں سے متعلق ہے
آنکھیں ہی نہوں تو پھر کچھ نہیں ایسے ہی ذوق مضامین دلچسپ فہم سلیم سے متعلق ہے فہم
ہی نہو تو پھر کچھ بھی نہیں ٭ جواب سوال دوم یہ ہے اگر انسان پیدا ہوتا ہے
تو پائخانہ کی کھاد سے کھیت میں وہ غذائیں نفیس و لذیذ پیدا ہوتی ہیں کہ انسان بنا

اشرف المخلوقات ہیں جن پر جان نثار کرتا ہے اور ایک جہان ہے کہ مرتا پھرتا ہے اس حساب سے
دیکھیے تو وہ انسان سے بھی کسی درجہ میں اعلیٰ ہیں ورنہ طالبی اور مطلوبی کی کیا وجہ تھی
غرض انسان کا اشرف المخلوقات ہونا گو مسلّم ہے پر ایسا بھی نہیں جیسا اغذیہ
لطیفہ و لذیذہ کا مرغوب و مطلوب ہونا جس سے ایک طرح کا شرف اُن کو خدا نے انسان
پر بھی عطا فرمایا گو شرف کلی انسان ہی کو سہی مگر جب اغذیہ مذکورہ باعتبار فضل جزئی
انسان سے بھی افضل ہوئیں تو معلوم نہیں ایسی اچھی پاک و پاکیزہ چیزیں ایسی ناپاک کیوں
سے کیونکر پیدا ہوئیں ہاں یوں کہیے کہ معترض کے نزدیک پاخانہ بھی پاک ہو اور کیوں
نہ ہوگا جب یہ ہی قاعدہ ٹھیرا کہ اچھی شئے سے بری شئے پیدا نہیں ہو سکتی اور بری شئے
سے اچھی شئے کا پیدا ہونا محال ہے تو یہاں تو دونوں طرف بھلائی ہی بھلائی ہے جن
غذاؤں کے کھانے سے پاخانہ پیدا ہو وہ اچھی ستھری پاک پاکیزہ جو غذائیں لذیذ یا پھول
پھلواری پاخانہ کی کھات سے پیدا ہوتی ہیں وہ اچھی ستھری پاک پاکیزہ علیٰ ہذا القیاس
خون غذاؤں سے پیدا ہو اور خون سے گوشت سے عمدہ غذا پیدا ہو جسم انسانی
ہے باوجود اس اشرفیت و افضلیت مسلّمہ معترض صاحب اسی خون سے بنتا ہے القصہ
منشاء غلطی یہ قاعدہ غلط ہے جو ذہن نشین معترض صاحب ہے مگر یہ غلط ہے تو پھر منی کا
پاخانہ پیشاب سے زیادہ ناپاک ہونا اہل عقل کے نزدیک بے شک مسلّم ہوگا جس راہ
سے پیشاب آئے اسی راہ سے منی آئے اتنا فرق ہے کہ پیشاب کی اصل وہی پانی ہے جس سے

ناپاک چیزون اور ناپاک جسمون کو پاک کرتی ہی اور منی کی اصل وہ مادۂ بلغمی کر اہی یا
مونہہ اور ناک سی بہی نکلی تو نفرت بی آئی باعتبار ظاہر تو یہہ فرق ظاہر ہی اور باعتبار باطن
یہہ تفاوت ہی کہ باعث خروج پیشاب وہ تقاضائی اندرونی ہی جسکی حقیقت سی معترض
صاحب بہی خوب واقف ہین وانگان کہئی تو یہہ معنی ہون کہ پیشاب کا اندر ہونا اتنا
گران اور نفرت انگیز ہی کہ طبیعت کو بلی مدافعت واخراج چین نہین اور ظاہر ہی کہ وقت
نفرت اوسکی ضد کی رغبت ضروری جس سی نفرت ہو یعنی کڑوی چیز اگر بری لگتی ہی تو ایک
وجہہ یہی کہ مٹھائی وغیرہ ذائقہ دار چیزین مرغوب ہین وہ مرغوب نہوتین تو اس سی نفرت
بہی نہوتی علیٰ ہذا القیاس مرض سی اگر نفرت ہی تو اسی وجہہ سی کہ صحت مرغوب ومطلوب ہے
وہ مرغوب ومطلوب نہ ہوتی تو مرض سی نفرت بہی نہوتی اوروں کی صحت اگر اپنی آپ کو محبوب
ومطلوب نہوتی تو اونکی بیماری سی بہی کچہہ تکلیف یعنی نفرت نہین ہوتی بالجملہ جس سی نفرت
یا تکلیف ہو اوسکی ضد کی طرف رغبت اور اوس سی راحت ہونی چاہئی اس صورت
مین بیشک وہ صفائی جو ضد کدورت لازمہ استلاء بول ہی وقت تقاضاء بول محبوب
ہوجانی چاہئی اور وہ محبوب ہوئی تو یون کہو وہ چیز محبوب ہوئی جو خدا تعالیٰ کی نزدیک
محبوب ہی غرض وقت تقاضاء بول باعتبار اصل مرضیات طلب خداوندی کی طلب
مکنون طبیعت ہوتی ہی گو شدت تقاضاء مین اودہر کو دہیان نہ جائی مگر یہہ غفلت ایسی
ہی جیسی کہ بحر مرض مین صحت کا خیال دل سی زائل ہوجائی سو جیسی یہہ غفلت دلیل

عدم محبوبیت و مطلوبیت صحت نہیں ایسی ہی رہ مغلطہ ہی دلیل عدم محبوبیت و مطلوبیت
نہیں جیسی یہاں یہہ کہنا لازم ہی کہ طلب ہی پر علم طلب نہیں یا محبت ہی پر علم محبت نہیں
اور یہہ ایسی بات ہی جیسی علم میں ہوتا ہی کہ بسا اوقات علم ہوتا ہی اور علم العلم نہیں ہوتا
یا علم العلم ہوتا ہی اور اوسکا علم نہیں ہوتا ایسی ہی وہاں بھی یہہ کہنا لازم ہی کہ طلب ہی پر علم
طلب نہیں اور محبت ہی پر علم محبت نہیں۔ القصہ اوس محبت کا اور طلب کا علم نہیں
تو کیا ہوا محبت اور طلب موجود ہی اور باعتبار باطن طبیعت اوسوقت خدا ہی کی طرف متوجہ
رہتی ہی اور دل وجان آلودگی طلب غیر سی ملوث نہیں ہوتی اور خروج منی کا حال گو نامردون
کو معلوم نہو پر مردونسی پوچھنا چاہئی کہ موجب خروج کیا لذت روح افزا ہوتی ہی اور جب
باعث خروج لذت مذکورہ ہوئی تو بیشک دل وجان اوسوقت فدائی مونس جان
ہونگی اور اسوجہہ سی بیشک اور تمام اشیاء سی اوسوقت اسقدر غفلت اور انحراف ہوگا
کہ اوس سی زیادہ جب ہی متصور ہو جو اوس سی زیادہ لذت نصیب ہو بہر حال وقت
لذت جماع جو موجب خروج منی ہی خدا سی غفلت اور انحراف ہوگا مگر یہہ بھی تو بہر صورت
حال صاحب جماع سی یہہ نمایان ہوتا ہی کہ وہ طلب و محبت جو حصہ خداوندی تہا اورکی
حوالہ کر بیٹھا اور ظاہر ہی کہ محبت غیر اللہ کسقدر ناپاک چیز ہی شرک میں اور کیا ہوتا ہی
یہی محبت غیر ہوتی ہی مگر اتنی بات ہی کہ محبت خدا تعالیٰ از قسم محبت قرابت نہیں
اور محبت قرابت ایسی طبعی ہی کہ اول ہی سی ہوتی ہی اور آخر تک رہتی ہی محبت قرابت

نہ مزاحم محبت خداتعالی ہوگی جو خدا کے نزدیک موجب ناخوشی ہو اور نہ بوجہہ طبعی ہونیکے قابل
زوال ہے جو اوسکے ازالہ کا تہوڑا بہت فکر کیا جائے اور زایل نہو سکے تو کچھہ تاوان سر پڑے
البتہ محبت خداوندی از قسم محبت عشقی ہے یعنی باوجود عدم قرابت جیسے کسی محبوب کی
خوبیاں موجب محبت ہو جاتی ہیں ایسے ہی خداتعالی کی خوبیاں بہی باوجود عدم قرابت
موجب محبت ہو جاتی ہیں اور اس وجہہ سے اگر محبت عشقی کو مزاحم محبت خداوندی کہیے
تو بجا ہے اور پہر بوجہہ مزاحمت اگر اس محبت کو موجب ناخوشی کہیے تو زیبا ہے اور یہہ بہی
ظاہر ہے کہ محبت باہمی زن و شوہر از قسم محبت عشقی ہے پہلے سے کچھہ قرابت نہیں ہوتی
ناگہاں ایک دوسرے کو بوجہہ تقاضاء بشریت ایسا بہاتا ہے کہ اپنوں سے چہڑا دیتا ہے اسلیے
اس محبت و رغبت کو اگر مکروہ کہیے تو دور از عقل نہیں یہی وجہہ ہوئی کہ اکابر اہل اسلام
کی یہہ رائے ہوئی اور قرآن و حدیث میں اوسکی طرف اشارے پائے کہ اصل میں اس
قصہ میں حرمت و کراہت ہے مگر بوجہہ ضرورت بقاء نسل یہہ امر مخالف عقل سلیم ایسی
طرح جائز ہو گیا جیسے بضرورت بقاء زندگانی دوائے مخالف طبع مگر پہر بہی بادا باد اصلی خرابی
کی طرف کچھہ اشارہ چاہیے اسلیے تاوان غسل و حکم تطہیر جامہ و جسم لگا دیا گیا تاکہ اشارہ
شناسان حقیقت کو یہہ بات یاد رہے کہ موجب خروج منی وہ محبت غیر اور غفلت من اللہ
ہے جو سب ناپاکیوں کی ناپاکی ہے الغرض پیشاب اور منی دونوں ایک راہ سے نکلتے ہیں
مگر اتنا فرق ہے کہ پیشاب کی اصل وہ پانی ہے جو طاہر چہوڑ مطہر ہے اور منی کی اصل وہ مادہ

بلغمی ہی کہ اپنی مونہہ اور ناک سی نکلی تب ہی نفرت آئی موجب خروج پیشاب وہ کدورت
اور اشتمال ناپاکی ہی جسکی پہلو مین رغبت صفائی اور رغبت مرضیات الٰہی ضروری ہی اور موجب
خروج منی وہ لذت اور محبت غیر اللہ ہی جسکو غفلت من اللہ لازم ہی پیشاب کی غلبہ کی
وقت جو کچھہ کیفیت مخالف طبیعت پیش آتی ہی فقط آلہ تناسل اور اوسکی گرد و پیش
مین ہوتی ہی اور لذت جماع جو بوجہ موافق طبیعت بشری ہی ساری جسم کو محیط
ہوتی ہی اِس صورت مین اہل عقل تو بیشک منی کو پیشاب سی زیادہ ناپاک کہین گی
پیشاب سی اگر وضو لازم ہوگی تو خروج منی سے غسل واجب سمجہین گی چنانچہ لذت
جماع کا تمام جسم کو محیط ہوتا ہی اسیکو مقتضی ہی کیونکہ موجب خروج منی وہ ہی لذت ہی
اور بیعقل یا کم عقل اور یہی لوگ ایسی مضامین پر معترض ہوتی ہین اگر پیشاب کو بہی برابر
سمجہین تو دور نہین صاحبو دین اسلام پر جو اعتراض ابنا روزگار کی خیال مین آتی
ہین تو بوجہہ قصور فہم خیال مین آتی ہین اور اسلئی مجیب کو یہہ دقت پیش آتی
ہی کہ قرار واقعی بیان کیجئی تو معترضون مین مادہ عقل نہین اور بات کو اوں ہی چہوڑ دیجئی
تو کام نہین چلتا مگر بناچاری کچہہ نہ کچہہ کہنا ہی پڑتا ہی خیر اہل فہم ہی کام ہی بد فہمون
کا حساب ہی کیا تو مضامین عالیہ ایسی ہین جیسی ہلال شب سوم کم نظرون اور بی ایمانون
کا حق مین اسلئی اتنا اور کہنا لازم ہی کہ علوم شرعیہ اگر ایسی آسان ہوتی جیسی اور
علوم تو خداوند عالم ہماری ہی عقل پر چہوڑ دیتا اور اپنی طرف سی معلم یعنی انبیاء کرام

علیہم السلام کو نہ بھیجا یہہ علوم کچھہ دقیق ہی نہ تھی تو یہہ انتظام ہوا اور اس وقت ہی کی وجہہ سی
تو اس علم کا نام منقول ہوا معقول نہوا ورنہ یہہ مطلب نہیں کہ علوم نقلیہ میں عقل کو دخل
ہی نہیں ۞ جواب سوال سوئم جواب میں پہلی ایک بات سن لیجیئے غیر کی طرف توجہہ و
التفات کی دو صورتیں ہیں ایک تو توجہہ و التفات محبت جیسی محبوبوں کی طرف ہوتا ہی
دوسری توجہہ و التفات ضرورت جیسا اہل معاملات کی طرف ہوتا ہی محبوبوں کو غیر کی طرف
پہلی قسم کی توجہہ اور التفات تو ناگوار ہوتی ہی پر دوسری قسم کی توجہہ ناخوش نہیں معلوم
ہوتی غرض جیسی عشاق کو معشوقوں کا اوروں کی ساتھہ ارتباط موجب آزار ہوتا ہی ایسی ہی معشوقان
اور محبوبوں کو بھی اور کسی محبوب کی طرف التفات ناگوار ہوتا ہی اور کیوں نہو جان
نثاروں کی کس کو طلب نہیں اونکا گرفتار رہنا ہی بھلا ہی یہہ چھوٹی تو پہر کہ کی آشنا جو محبوبوں کی
ناز اوٹھائیں اور اپنی جان گنوائیں کام کریں اور جوتیاں کھائیں جان دیں اور صلہ
نہ پائیں اس تمہید کی بعد یہہ عرض ہی کہ محبت خداوندی کا حال معلوم ہی ہوگا کہ از
قسم محبت عشقی ہی اقسام محبت قرابت میں سی نہیں اور یہہ بھی ظاہر ہی کہ خندہ و قہقہہ
وقت خرمی و خوشنودی آتا ہی اور کون نہیں جانتا کہ موجبات خوشنودی محبوب
اعتدال مرغوب اور دلکش ہوتی ہیں اسی وجہہ سی یہہ ہوتا ہی کہ جیسی آتی ہیں تو راحت
اور خوشی ہوتی ہی اور نہیں تو رنج و غم اتنا فرق ہی کہ کبھی اول سی محبت ہوتی ہی اور
انکی وجہہ سی طلب میں سرگردان ہونا پڑتا ہی پہر اگر کامیابی ہوئی تو راحت پر راحت

اور سرور پر سرور ہی ورنہ غم ناکامی ورنج وحسرت جانگزا ہوتا ہی اور کبھی یون ہوتا ہی
کہ نہ پہلی سی محبت ہی نہ پہلی سی بوجہہ محبت طلب ہی کوئی اور ضرورت مثلاً ضرورت
بیع وشرا باعث ملاقات و دیدار ہوئی صورت ہوش و نازِ دلکش موجب دلبستگی
ہو گیا پہلی صورت مین وہ صورت پاک نقش کالحجر کی طرح نقش دل بیقرار اور دل محو یاد
دلدار ہوتا ہے اور دوسری صورت مین وہ صورت نقش برآب اور مثل خیال وخواب
ہوتا ہے تہوڑی دیر مین مثل سراب زایل ہوجاتی ہی مگر خارج از نماز تو گنجایش معاملات
باہمی ہی اوسوقت اگر کسی چیز کی طرف توجہہ اور التفات ہو تو اندیشۂ ناخوشی خداوندی
چندان نہین اور خاص نماز مین کسی اور طرف توجہہ اور التفات ہو تو احتمال معاملہ باہمی تو ہو
ہی نہین سکتا ہو ہو تو جہہ محبت اور التفات موٴثر ہوگا مگر یہہ ہی اہل عقل کو معلوم ہوگا
کہ شرک کی کل دو قسمین ہین ایک تو یہہ کہ منصب حکومت احکم الحاکمین مین کسی دوسری
کو شریک سمجہی یعنی احیا و اماتت پیدا کرنی اور نابود کر دینی وغیرہ مین جو تصرفات خاصۂ خداوندی
مین ہی ہین کسی دوسری کو شریک سمجہی دوسری یہہ کہ کمال وجمال وغیرہ امور مین جو
منشاء محبوبیت ہین کسی دوسری کو ہمتا ذات یکتا وحدہٗ لاشریک لہٗ اعتقاد کری
باقی رہا علم غیب وہ بحیثیت کمال تو دوسری قسم مین داخل ہی اور باین نظر کہ حکم
سی پہلی ارادہ اور ارادہ سی پہلی علم مراد کی ضرورت ہی وہ مبادی حکومت مین سی ہی
بہرحال شرک کی یہی دو صورتین ہین اور کیون نہو معبودیت انہین دو صورتون میں ہے

منحصر ہیں پہلی صورت کی طرف تو آیۂ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا
وَلَا نَفْعًا وغیرہ آیات میں اشارہ ہے کیونکہ مالکیت نفع وضرر اور اختیار راحت
رسانی وتکلیف دہی ہی کو حکومت کہتے ہیں اور دوسری صورت کی طرف آیۂ
وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ وغیرہ آیات میں اشارہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت
بوجہ حکومت کیسے ہی اخلاص سے کیوں نہ ہو پھر بوجہ مجبوری ہے اخلاص حکومت اس
سے زیادہ اور کیا ہے کہ حاکم کو دل سے حاکم سمجھے اور باین نظر کہ خداوند عالم عالم الغیب
ہے نفاق کو دل سے دور کر دے مگر پھر بھی بایں ہمہ بنائے تابعداری مجبوری اور لاچاری
پر ہوگی اور وہ اطاعت جو بوجہ محبت ہو اس میں ہرگز وہم جبر وتعدی اور گمان
ناچاری نہیں ہوتا وہاں جو کچھ ہوتا ہے تہ دل سے ہوتا ہے غرض وہ بندگی جو بوجہ محبت
ہو وہ اول درجہ میں ہے اسلئے وہ شرک جس میں محبوبیت خاصۂ خداوندی میں اوروں
کو شریک کیا جائے اعلیٰ درجہ کا شرک ہوگا اور اسکی ناپاکی اول مرتبہ کی ناپاکی
ہوگی اور یہ بھی مسلم ہے کہ کمال ہو یا جمال وہ سب عطاء خدا ہے اور پھر وہ عطا بھی
از قسم داد ودہش روپیہ وفلوس نہیں یعنی یوں نہیں کہ جیسے یہ چیزیں بعد عطاء معطی
کے قبضہ سے نکل جاتی ہیں اور معطیٰ لہ کے قبضہ وتصرف میں چلی جاتی ہیں کمال وجمال
خداوندی بھی بعد عطاء خدا میں نہ رہے اور اوروں میں چلا جائے بلکہ اسکی خوبیاں سب
ازلی وابدی ہیں اسلئے یہ ہی کہنا پڑیگا کہ عطاء خداوندی اس قسم کی ہے جیسے آفتاب سے

اور دن کو فیض نور ہوتا ہے اور آفتاب مین جون کا تون رہتا ہے گر جیسی کسی مستفیض النور
کو دیکھیے آفتاب ہی کا پرتو سمجھتے ہین اور اسوجہہ سے یون ہی کہتے ہین کہ یہان بہی نور آفتاب
ہی جلوہ گر ہے اور اصلی آفتاب ہی ہے اور محبت اور قدردانی کا مستحق ہے جو بوجہہ نور
ہونی چاہیے مستفیض شریک محبت نہین ایسے ہی سوائے خداوند عالم کوئی صاحب کمال
وجمال کیون نہو اوسمین خدا ہی کا پرتوہ ہوگا اور اصلی وہ محبت جو بوجہہ کمال وجمال
ہونی چاہیے خاص حصہ خداوندی ہوگا وہ صاحب جمال وکمال بذات خود اسکا مستحق
نہوگا اور اسلیے سوائے محبت انبیاء واولیاء وعلماء جو بلحاظ تقرب ونیابت خداوندی
ہوتی ہے اور سب اس قسم کی محبتین شرک سے خالی نہونگی اتنا فرق ہوگا کہ اعتقاد اور
محبت دونون کی مرتبہ مین خدا کی ظل وپرتوہ کا لحاظ نہین تب تو وہ شرک قابل
مغفرت نہوگا اور اگر اعتقاد کی مرتبہ مین ظل وپرتو خداوندی سمجھتا ہے پر محبت مین مثل
محبت انبیاء وعلماء واولیاء خدا اکا واسطہ نہین جیسے عشق خوبان مین ہوتا ہے تو بوجہہ
صحت اعتقاد دربارہ ذات کبریا اور ہر سے چشم پوشی ہوگی پر وہ آلودگی جو شرک کی
ماہیت کو لازم ہے کسی درجہ مین کیون نہو کہان جائے کیونکہ غور سے دیکہیے تو آلودگی
کی بنا یہہ محبت ہی ہے اعتقاد درست ہو یا غلط ہو آخر اعتقاد غلط مین اس سے زیادہ
اور کیا ہوتا ہے کہ اُنکو ایک لگاؤ محبت ہو جاتا ہے اور اسوجہہ سے محبوب مثل نقش
کالو نقش دل ہو جاتا ہے اور چونکہ غیر اللہ کا دل مین نقش ہو جانا دل کو آلودہ کر دیتا ہے

اصلی پیشرک کو رجس اور نجس کہتے ہیں بہر حال اعتقاد اگر درست بھی ہے تب بھی
ناپاکی شرک وقت محبت غیر اللہ جسمیں خدا کا واسطہ نہو کہیں نہیں گئی اسوقت
محبت غیر میں مبتلا ہو جانا ایسا ہوگا جیسے چوڑے کو چوڑا سمجھے اور پہلے کر اوس میں
پڑے یا عزت جان بوجھکر چھوڑ رہے ہیں گر دیا پہلے کر ناپاک ہوجاتے ہیں دونوں صورتیں
برابر ہیں ایسے ہی محبت غیر میں اعتقادی مبتلا ہو یا بے اعتقادی سے مبتلا ہوا تو وہ
مذکورہ میں دونوں حالتیں برابر ہیں جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو اور سنئے روح اور
بدن میں ارتباط ہے کہ ایک دوسرے کے احوال ادہر جاتے ہیں اور ادہر کی کیفیات ادہر آتی
ہیں رنج و غم راحت و سرور اصل میں احوال قلبیہ ہیں پر ہیں لیکن سب کا اثر بوجہ
ارتباط باہمی چہرہ اور تن پر نمایاں ہوجاتا ہے اور درد بخار وغیرہ کیفیات جسمانی میں پر
ہیں اونکے آثار یعنی تکلیفیں روح کو بیتاب بنا دیتی ہیں مگر اوس کدورت کو دیکھا جو
بوجہ تقاضا بول و براز روح پر عارض ہوتی ہے روح پر جسم کی طرف سے آتی ہے
اور اوس حالت کو دیکھا جو بوجہ خرمی پیش آتی ہے یعنی یہی خندہ و ضحک تو وہ
روح کی طرف سے بدن کی طرف آتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز خانہ زاد نہیں ہوتی اوس میں
عطار اور فیض ہوتی ہے وہ اوس درجہ کو قوی اور شدید نہیں ہوتی جو خانہ زاد ہے اور
اوسمیں کسی کا واسطہ نہو اب التماس یہ ہے کہ وقت خندہ جو آلودگی پیش آتی ہے وہ
بلا واسطہ اور خانہ زاد روح و دل اور وقت تقاضا بول و براز جو آلودگی پیش

آتی ہی وہ فیض تن خاکی پہر کیونکر کہدیجئے کہ یہہ اوسکی ہمسنگ ہوگی پہر یہہ آلودگی جو وقت
تقاضائے بول وبراز پیش آتی ہی حسب قرارداد جواب دوم توجہہ مرضیات الہی کو اپنی
آغوش مین لئے ہوئی جسکا حاصل یہہ ہوا کہ خدا سی غافل نہین تہا نہ خانہ طبیعت مین اودہر
کو توجہہ ہی گو اوس توجہہ کی ایسی طرح خبر نہو جیسی علم کا علم نہین ہوتا اور وقت تعجب
بوجہہ دلکشی اشیای تعجب انگیز وہ غفلت کہ خدا کی یاد کا اوس سی لیکر بہی تک پتہ ہی نہین
اسلئے وہ آلودگی جو وقت تعجب ہوتی ہی اوس سی زیادہ موجب آلائش ہوگی پہر کیونکر
کہدیجئے کہ کدورت بول وبراز تو ناقض طہارت ہو اور کدورت محبت غیر ناقض
طہارت نہو مگر جیسی ایدہر خروج بول وبراز کو علامت استلاء قرار دیا ہی اور اسلئی ادہی
وقت حکم طہارت صادر ہوتا ہی ایسی ہی ضحک وقہقہہ کو علامت توجہہ الی الغیر
قرار دینا چاہئے لیکن کدورت بول وبراز مین تو سوای اوسکی اور احتمال نہ تہا ناپاکی
کی آمد آمد ہی اور توجہہ الی الغیر مین یہہ بہی احتمال ہی کہ بوجہہ محبت نہو جو موجب آلائش
دل وجان ہوتی ہی بلکہ بوجہہ ضرورت معاملات ہو جو موجب تکدر خاطر محبوب نہین
ہوتی اسلئے جہان احتمال مذکور ہو وہان تو خداوند کریم ورحیم کی طرف سی چندان دار و گیر
نہوگی مگر وہ توجہہ جسکا باعث اول معاملہ تہا فی الجملہ دل کشی کا باعث ایسی طرح ہو جائے
جیسی کسی حسین وجمیل کی طرف بوجہہ معاملہ بیع وشرا کسی قدر دل کو میلان پیدا ہو جائے
مگر جیسی ایسی توجہہ اور میلان سی صورت حسینان نقش دل نہین ہو جاتی بلکہ اگر تہوڑی

دیر کی بعد وہ خیال دل سی محو ہو جاتا ہی ایسی ہی وہ دل کشی جو بوجہہ اوس توجہہ کی
ہوئی ہو جو معاملہ کی باعث پیش آتی ہی لائق اندیشہ نہیں اگر یوں ہوتا ہی کہ تہوڑی
دیر میں وہ خیال محو ہو جاوی اور نقش دل نہونی پائی جو دل وجان آلودہ ہو جاوی
وہ توجہہ الی الغیر جو بضرورت معاملات ہو دلیل محبت غیر نہیں جو بوجہہ ازالہ نجاست
شرک خفی سامان تطہیر کیا جاوی پر جہاں یہہ احتمال ہی نہو وہاں انتقاض طہارت
لازم و واجب ہی سو وقت نماز تو احتمال معاملہ باہمی بنی آدم ہو ہی نہیں سکتا اسلئی
اسوقت کی ہنسی اور قہقہہ توجہہ محبت غیر کا ثمرہ سمجہا جائیگا ورنہ سو کو نعوذ باللہ ایسا
اور اسوجہہ سی نماز کو بہی فاسد کہنا پڑیگا کیونکہ بی طہارت نماز جائز نہیں علاوہ بریں
حقیقت نماز حضور دربار خداوندی ہی اور قہقہہ اسپر شاہد ہی کہ توجہہ الی اللہ کا نام
ونشان نہیں جو کچہہ ہی توجہہ الی الغیر ہی اس تقریر کو سنکر اہل فہم کا دل تو باغ
باغ ہو جائیگا انشاء اللہ احکام دین کی حقیقت اور حقانیت کی لئی یہہ ایک دو مسئلہ
بمنزلہ مشتی نمونہ از خرواری ہو کر موجب قبول اسلام ہونگا ہاں بد فہموں کی تئیں
یہہ تقریر خوش آئندہ ایسی طرح موجب انکار و استنکاف ہوگی جیسی کہ نبالی
والوں اور پاخانہ اوٹہانی والوں کی لئی عطر کی خوشبو ناک چڑہانی کی باعث
ہو جاتی ہی واللہ اعلم ؁ جواب سوال چہارم نوم بذات خود ناقض وضو
نہیں اگر ہی تو باین نظر ہی کہ اوسوقت بوجہہ استرخاء اعصاب کی ان

یہہ ہیں کہ ریح نکلجائی اور خبر نہوا اور یہہ خوب معلوم ہی کہ اکثر افراد بنی آدم کا شکم جیسی ہر وقت
کسیقدر بول و براز پر مشتمل رہتا ہی ایسی ہی ریح سی بھی خالی نہیں رہتا اور دوسری
یہہ اگر ہوسکتی ہی تو یہہ ہوسکتی ہی کہ اصل میں یاد خداوندی موجب روشنی و صفائی
قلب ہے اور غفلت موجب کدورت اصلی اور ظاہر ہی کہ نیند کی وقت سی زیادہ غفلت
متصور نہیں مگر جب کدورت ہوئی تو اثر طہارت جو صفائی باطن تہا کہاں رہا اسلئی
یون ہی کہنا پڑیگا کہ طہارت بہی جاتی ہوئی مگر جہان وقت خواب بہی خدا کی غفلت
نہو وہان نہ یہہ احتمال ہی کہ ریح کی نکلنی کی خبر نہوا اور نہ اوس کدورت کی کوئی صورت
ہی جو بوجہہ غفلت وقت خواب پیش آتی ہی اسکی بعد یہہ عرض ہی کہ اوصاف کی کل
دو قسمیں ہیں ایک تو یہہ کہ خانہ زاد ہوں یعنی عالم اسباب میں کسی اور کا فیض نہو
جیسی نور آفتاب یا حرارت آتش دوسری یہہ کہ فیض غیر اور عطاء بیگانہ ہو جیسی
نور آئینہ یا حرارت آب گرم سوای ان دو صورتوں کی اوصاف کی اور کوئی
صورت نہیں مگر جیسی یہہ دو قسمیں ہیں ایسی ہی ان دونوں کی جُدی جُدی عوارض
اور لوازم ہیں سو جیسا وصف خانہ زاد ہوگا اوس وصف میں دو موصوفات
جو اوس سی مستفیض اور اونکا وصف اوس سی مستعار ہو کبھی برابر نہیں ہوسکتا
او. صاحب وصف خانہ زاد اوروں میں موثر ہوتا ہے اور صاحب وصف مستعار اوس
سی متاثر غرض اول کی احکام و آثار دوسری میں آتی ہیں اسلئی منصب حکومت

اوسکی طرف ہوتا ہی اور دوسرا اوسکا محکوم کیونکہ حاکم و محکوم مین بہی فرق تاثیر و تا
ہوتا ہی اور اسی وجہہ سی آثار کو احکام کہا کرتی ہین یعنی احکام ظاہری کی حکومت
بہی یہی ہی کہ حاکم کی طرف کی بات محکوم مین ظہور کرتی ہی اسی کا نام تاثیر ہی اب ا
اگر یون کہتی ہین کہ اوسمین احراق و تسخین کی تاثیر ہی تو اوسکی بہی معنی ہین کہ ا
طرف کی بات یعنی حرارت اودہر نمایان ہوتی ہی غرض منصب حکومت بہی او
ہوتا ہی جبہ بر وصف خانہ زاد ہوتا ہے اور اسوجہہ سی حکومت ظاہری کا
اول وہ ہی ہوگا جو دربارہ کمالات لازمہ حکومت یعنی علم و اخلاق اورون مین
اونپر حاکم طبعی ہو القصہ منصب حکومت بہی ادہر ہی ہوتا ہی جبہ بر وصف خانہ
ہو اور شدت وصف بہی ادہر ہی ہوتی ہی جبہ بر وصف خانہ زاد ہوتا ہی او
سی اوس وصف مین افضل بہی وہی ہوتا ہی جو خانہ زاد وصف رکہتا ہو ا
سی یہہ بہی ضرور ہی کہ صاحب وصف خانہ زاد پر مراتب کمال وصف ختم ہو جا
اور یہہ ہی تو پہر یہہ بہی ضرور ہی کہ اگر چند موصوفات وصف واحد مین باہم او
وصف مین کمی بیشی یعنی شدت و ضعف ہو تو جو فرد سب مین زیادہ وہ وصف
رکہتا ہوگا وہ تو وصف خانہ زاد رکہتا ہوگا اور باقی اوصاف والی اوس سی
ہونگی اگر سب مین زیادہ وصف والا خانہ زاد نہ رکہتا ہوگا تو یہہ بات غلط ہو جا
کہ صاحب وصف خانہ زاد اونسی زیادہ ہوا کرتا ہی جو اوس سی مستفید ہوا کرتی ہین

ضمو کہ سب مین زیادہ ہو کر جب کسی اور سی مستفید ہوگا تو اپنی سی کم سی کا دست نگر
ہوگا غرض جو سب مین زیادہ ہوگا وہ اورون کا دست نگر نہوگا ورنہ خدا تعالیٰ
کو باوجود افضلیت وعلو شان کلی اگر کوئی غیرون سی مستفید کہی تو اوسکا موہنہ
بندکرنا مشکل ہی باقی رہا باقیو نکا اس سی مستفید ہونا وہ اگر ضروری نہو تو یہہ بہی ضروری
نہو کہ غیر خدا خدا ہی سی وجود اور کمالات وجود مثل علم وقدرت وغیرہ صفات مین
مستفید ہین یہان بہی یہہ کہہ سکتی ہین کہ اورونکا وجود اور اورونکی کمالات وجود
ہی باوجود کمی وضعف خانہ زاد ہین باقی رہا یہہ شبہہ کہ چراغ باوجودیکہ شمس وقمر
کواکب سی نور مین کم ہوتا ہی اونسی مستفید نہین اسکا جواب یہہ ہی اصل نورانی وہ
ایک مادہ حاری ہی اور جسم آفتاب اور شعلہ چراغ وشعل سب اوس سی مستفید ہین
اتنا فرق ہی کہ کہین قابلیت زیادہ ہی کہین کم چنانچہ بعض شعلون کا صاف ہونا
اور بعض کا مکدر ہونا اسپر شاہد ہی یعنی گو ایک ہی آتش سی مختلف چراغ اور شعلین
اور شمعین روشن کرین پر بوجہہ تفاوت قابلیت ایسی طرح فرق پڑجاتا ہی جیسی آئینہ
اور پتہر کی آفتاب سی منور ہونی مین فرق پڑجاتا ہی اسکی بعد اگر آفتاب سی اور کواکب
باز مستنیر ہون تو وہ ایسا ہی جیسی آئینہ مستنیرہ من الشمس سی اور اشیاء منور ہوجاتی
ہین اور اگر یون کہئی کہ حقیقت آفتاب ایک نور مجسم ہی یہہ نہین کہ جسم آفتاب
اور ہی اور اوسکا نور مثل انوار دیگر نیرات اور تو پہر جواب کی یہہ صورت ہی کہ یہہ جوہر

جسم میں ایک مادۂ آتشیں ہے چنانچہ ترکیب مسئلہ اربع عناصر اوسپر شاہد ہے اور جو
کچھ وجہ ہے اوسپر گواہ تو ورود فیض آفتاب ہی ہے کیونکہ جیسے آفتاب مطلع الانوار ہے ویسے منبع
حرارت بھی ہے اصل جیسے اوس سے فیض تنویر ہوتا رہتا ہے ایسے ہی افاضۂ مادۂ آتشیں
بھی اوسی کا کام ہے مگر چونکہ اوس مادہ کو بعد ظہور روشنی ایسی طرح لازم ہے جیسے مثلاً
گویا شمس و قمر کو ہنڈیا یا ابر سے نکلنے کے بعد روشنی لازم ہے اصل جہاں دبا ہوا
ظاہر ہوا اوسیوقت نور افشاں ہوا غرض اور عناصر کے تلے جب تک دبا ہوا ہے تب تلک
تو اوسکو ایسا سمجھئے جیسا آفتاب فرض کرو گرد و غبار کے تلے دبا ہوا ہوا اور اور عناصر کے اوپر
آگیا خواہ بوجہ کشش ہمجنس ہو یا بوجہ میلان طبعی جو ہمجنسوں کی طرف ہوتا ہے جیسے
مادۂ مکنونہ روغن کا حال وقت اشتعال شعلۂ چراغ و مشعل ہوتا ہے یا بوجہ تحریک
خارجی ہو جیسے دیا سلائی میں نظر آتا ہے تو پہر وہ روشنی جو اوسکو لازم ہے نمایاں ہوگئی
علیٰ ہذا القیاس اگر الوان اجسام میں تفاوت کمی بیشی دیکھکر یہ شبہہ دل میں آئے کہ کوئی
چیز زیادہ سرخ و سفید ہے اور کوئی کم باایں ہمہ یوں نہیں کہہ سکتے کہ ایک دوسری سے
ایسی طرح مستفید ہے جیسے زمین آفتاب سے یا آب گرم آتش سے تو اسکا جواب یہ ہے
کہ تمام اجسام ملونہ قابل الوان میں خود بذات خود ملون نہیں صورت اوسکی یہ
ہے کہ نور آفتاب وغیرہ جلوہ گر ہوتا ہے تو کوان اجسام نمایاں ہوتے ہیں نہیں تو
نہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ اصل میں وہ نور مظاہر ہے ورنہ پہلے نور ہی میسر

ہوا کرتی اور جب نور ہی منعکس ہوا تو اصل ملوّن ہی وہی ہوگا کیونکہ ہم اوسکو رنگ
کہتی ہیں جو منعکس ہوتا ہی چنانچہ سب پر آشکارا ہی مگر بوجہ تفاوت کہیں کسی طرح نظر
آتا ہی اور کہیں کسی طرح کہیں کوئی کیفیت ہوتی ہی کہیں کوئی کیفیت سو یہی اختلاف
کیفیات اختلاف الوان ہی غرض سفید و سرخ اصل میں وہ نور ہی اوس کی
اور اجسام بقدر قابلیت مستفید ہوتی ہیں اور ظاہر ہی کہ گفتگو اوصاف میں ہی
خود قابلیت اوصاف میں نہیں غرض وہ اوصاف جو کسی کی ساتھہ ہوگی بیشک
اوس موصوف کا فیض ہوگی جسکا وصف خانہ زاد ہو اور وہ موصوف جسکا
وصف خانہ زاد ہو اوروں کا دست نگر نہوگا دلیل اس دعوی کی مسائل مسلمہ
میں سی تو معروض ہو چکی یعنی خدا کی سوا اور مخلوقات وجود اور کمالات وجود
میں خدا کی محتاج ہوتی ہیں اگر کمی و ضعف اوصاف بالذات اس بات کو مقتضی
نہوتا کہ اوروں کا فیض ہوا کری تو ہر سب کا فیضیاب خداوندی ہونا مسلّم
نہ ہو سکتا اور دلیل عقلی درکار ہو تو لیجئے اگر اوصاف ضعیفہ والی اوسکی دست نگر
نہوں جو سب میں افضل اور اعلی اور اشد اور اقوی اوس صفت میں ہو بلکہ اونکا
وصف بھی خانہ زاد ہو تو یہہ معنی ہوئی کہ منبع وصف اور مطلع صفت منبع اور
مطلع نہیں کیونکہ کمی اور نقصان کی دریافت کرنیکی لئی کوئی نور یا اصل چاہئی جس
کی کم ہر جانی تو کم کہلاتی سو باوجود اصلیت اور خانہ زاد ہونیکی اگر کمی ہو تو یہہ

یعنی یوں کہ اصل میں اتنا تھا اب اتنا رہ گیا اسلئے کہ کمی اور نقصان اصل ہی میں متصور
ہے اور جو پہلے ہی سے ہو اوسکو نقصان ہی نہیں کہہ سکتے غرض نقصان بعد تمامیت
متصور ہے اس سے پہلے متصور نہیں سو جہاں نقصان ہوگا اوس سے پہلے ایکبار
مرتبہ ماننا پڑیگا جہاں تمامی اور کمال ہو مگر وہ مرتبہ اول ہوا تو پھر یوں نہیں
کہہ سکتے کہ موصوف بالوصف الناقص منبع اور مطلع ہے بلکہ منبع اور مطلع وہ
مرتبہ ہوگا جو اوس سے پہلے ہے اور جہاں وہ وصف تمام اور کمال ہے اسکے بعد یہ
گزارش ہے کہ اوصاف ناقصہ کے موصوفات کو جب موصوف بالوصف الکامل
کی دستگیری لازم ہوئی تو موصوف وصف کامل تو مصدر اور مطلع وصف
ہوگا اور باقی موصوفات اوصاف ناقصہ سب قابل مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قابل کا
وصف اوس سے منفصل ہوجاتا ہے پر مصدر کا وصف اوس سے منفصل نہیں
ہوتا آفتاب اہل ہیئت کے نزدیک مصدر النور ہے اور قمر اوسکی نسبت قابل
زمین بیچمیں آجائے جیسا چاند گہن کے وقت ہوتا ہے تو قمر سے تو نور علیحدہ
ہوجاتا ہے پر آفتاب سے علیحدہ نہیں ہوتا پھر قمر سے صادر ہوکر اگر زمین وغیرہ
میں نور آئے تو اور کوئی چیز بیچمیں حائل ہوجائے تو زمین وغیرہ سے تو نور علیحدہ
ہوجاتا ہے پر قمر سے علیحدہ نہیں ہوتا اور اگر آئینہ نور قمر سے مستفید ہو اور
اوس سے نور صادر ہوکر در و دیوار پر واقع ہو اور درمیان میں کوئی جسم

کثیف آجائی تو آئینہ تو بدستور منور رہی پر در و دیوار سی نور جاتا رہی غرض
مصدر میں وصف صادر بحیثیت صدور منفصل نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہی کہ فرد اکمل
اور موصوف اعلیٰ و افضل مثل آفتاب بجمیع الوجوہ مصدر ہوگا مثل قمر و غیرہ من
وجہہ قابل اور من وجہہ مصدر نہوگا مگر یہہ ہی تو پہر اوسکی وصف کی انفصال
کی کوئی صورت ہی نہیں اس سب بحث طویل کی بعد یہہ عرض ہی کہ روح کی
حقیقت کو ٹٹولئی تو یہہ ہی فہم و شعور اور اخلاق حمیدہ سی اوسکا خمیر معلوم
ہوتا ہی اور ظاہر ہی کہ ان دونوں باتوں مین افراد بنی آدم مین باہم تفاوت
زمین و آسمان ہی اور یہہ بہی ظاہر ہی کہ فہم و شعور و اخلاق از قسم اوصاف
ہین اور اوصاف کی دو قسمین ہین جنمین سی ایک کا نام مصدر اور موصوف
اصلی یعنی صاحب وصف خانہ زاد ہی اور دوسری کا نام قابل اور مستعیر ہی
اور یہہ بہی ثابت ہو لیا کہ فرد اکمل مصدر ہوگا اور باقی قابل اس صورت مین
فرد اکمل ارواح ادراک و شعور اور فہم و فراست و علم و اخلاق حمیدہ کی
حق مین مصدر ہوگا اور موافق قرارداد حال اوس سی فہم و شعور کا انفصال
نہوگا اسلئی اوسکی خواب اور موت کو اور وں کی خواب اور موت کی ہمرنگ ای طرح
نظر آئی جیسی سورج گہن اور چاند گہن بظاہر ہمرنگ یکدیگر ہوتی ہین پر حقیقت
مین اوسکی خواب اور موت اور اوروں کی خواب اور موت مین ایسا فرق ہوگا جیسا

باعتبار حقیقت سورج گہن اور چاند گہن مین فرق ہوتا ہی یعنی جیسی وقت گہن
نور آفتاب تو زایل نہین ہوتا بلکہ چاند کی اوٹ مین ایسی طرح مستور ہوجاتا ہی
جیسی وقت گرد وغبار اور چاند کا نور وقت خسوف بوجہہ حیلولت زمین ایسی طرح
زایل ہوجاتا ہی جیسی آئینہ مقابل آفتاب کا نور کسی چیز کی حائل ہوجانیکی باعث
ایسی ہی اوس فرد اکمل کا فہم وشعور وقت خواب وموت مستور ہوگا زایل نہوگا
اور افراد ناقصہ کا فہم وشعور وقت خواب ومرگ زایل ہوگا مستور نہوگا اور
اسلئی نہ اوسکی مال مین میراث جاری ہوگی نہ اوسکی ازواج سی اورونکو نکاح
جائز ہوگا مگر فرد اکمل کی خواب ومرگ مین اوسکا فہم وشعور زایل نہوا مستور
ہوا تو یہہ جیسی نور چراغ اوسوقت جسوقت اوسکو کسی ظرف گلی یا مسی وغیرہ مین
رکھکر اوپر سی سرپوش ڈہک دیجئی باین وجہہ کہ ساری شعاعین جو پہلی دور
دور پہیلی ہوئی تہین سب طرف سی سمٹ کر اوسی ظرف مین آجاتی ہین اور بہی
شدید ہوجاتا ہی ایسی ہی یا لازم یون ہی کہ فرد اکمل کا فہم وشعور وقت خواب
اور بہی تیز ہوجائی مگر یہہ ہوگا تو نہ وقت خواب کدورت غفلت جو وقت
خواب تمکو ہوا کرتی ہی اوسکو پیش آئیگی اور نہ یہہ احتمال ہوگا کہ ریح نکلجائی
اور بوجہہ غفلت خواب اوسکی خبر نہو جب یہہ مسلّم ہوچکا تو اب یہہ التماس
ہی کہ جو شخص فرد اکمل ہوگا اوسکی مراتب کمال ایسی طرح ختم ہوجائینگی جیسی

بادشاہ پر مراتب حکومت پہر جیسی ہر مرتبہ حکومت کی لئی جُدی ہی القاب اور جدی
ہی آداب ہوتی ہین کلکٹر کا لقب کلکٹر ہی اور کمشنر کا لقب کمشنر لفٹنٹ کا
لقب لفٹنٹ اور گورنر کا لقب گورنر بادشاہ کا لقب بادشاہ ایسی ہی ہر مرتبہ
کمال کی لئی خدا کی طرف سی بحیثیت کمال جُدی جُدی القاب اور آداب ہونگی
اور باعتبار حکومت بہی جُدی جُدی القاب اور آداب ہونگی تفاوت کمال کا
حال تو ظاہر ہی ہی رہی حکومت اوسکی یہہ صورت ہی کہ خدا تعالیٰ احکم الحاکمین
اور پیغمبر اور رسول اوسکی نسبت بمنزلہ حکام ماتحت وجہہ اسکی یہہ ہی کہ کارخانہ
سلطنت مین اصل حاکم وہ ایک بادشاہ ہی ہوتا ہی اوسکی حکم احکام یعنی
قوانین کی موافق ملازمان سلطنت حکومت کرتی ہین اور اسیوجہہ سی حکام
ماتحت کہلاتی ہین ایسی ہی کارخانہ دین مین اصل حاکم خدا تعالیٰ ہی اوسی
کی احکام کی موافق انبیاء کرام علیہم السلام اور اونکی خلفاء راشدین احکام
جاری فرماتی ہین اور حکم کرتی رہتی ہین بالجملہ انبیاء اور خلفاء بمنزلہ حکام
ماتحت ہین اور اسوجہہ سی جیسی باعتبار کمالات باہم تفاوت ہی باعتبار
حکومت بہی تفاوت ہوگا اور اسوجہہ سی ہر مرتبہ کی لئی جدا لقب اور جدی
ہی اوسکی تعظیم ہوگی اور وہ لقب اور وہ تعظیم ہی اوسکی مرتبہ شناسی مین کافی
ہوگی سو جسکی شان مین وہ لقب خدا تعالیٰ کی طرف سی آئی جو اختتام

مراتب کمال اور اختتام مراتب حکومت پر دلالت کریں اور جس شخص کو فرد اکمل
اعتقاد کرنا چاہئے اور اوسکی خواب وموت کو ساتر ہوش وحواس وفہم وشعور
سمجھنا ضرور ہے اور اوسکی خواب وموت کو مزیل ہوش وحواس وفہم وشعور
خیال کرنا چاہئے مگر ایسا شخص جسکی شان مین خدا کی طرف سے وہ لقب آیا ہو
جو بنی آدم مین سے اوسکی خاتم الکمالات اور خاتم مراتب حکومت ہونے پر دلالت
کرے سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی نہین ہوا نہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی شان مین اس قسم کا لقب آیا نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور
حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہم کی شان مین اس قسم کا لقب وارد ہوا اور
نہ ان صاحبون مین سے کسی نے یہہ دعوی کیا کہ میرے بعد کوئی حاکم نہ آئیگا
اور کوئی نبی یا صاحب کمال اعظم ظہور نہ فرمائیگا اس قسم کا دعوی اگر کرتے تو
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے اور اس قسم کا لقب آتا تو اونکی شان مین
آتا جب انجیل مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہہ مقولہ موجود ہو کہ جہان کا
بادشاہ آنیوالا ہے اور مین اوسکی جوتی کی تسمہ کے برابر بھی نہین تو اہل فہم کو تو
اسمین تامل نہ ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خاتم مراتب حکومت ہین اور نہ خاتم
مراتب کمال اگر خاتم مراتب حکومت ہوتے تو خود بادشاہ جہان ہوتے یون
یہ کہ بادشاہ جہان آنے والا ہے کیونکہ بادشاہ ہی خاتم مراتب حکومت

ہوتا ہے اور خاتم مراتب کمال ہوتا تو یوں نہ فرماتے کہ میں اونکی جوتیوں کی تسمہ کے
برابر بھی نہیں یہہ مقولہ اگر سچا ہے اور جو حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان رکھتے
ہیں اونکے نزدیک بیشک یہہ قول سچا ہے تو پھر حضرت عیسی السلام خاتم مراتب
کمال کیونکر ہوسکتے ہیں اگر ہوگا تو وہی شخص ہوگا جسکی نسبت یہہ ارشاد ہے باقی
رہی نکمی تاویلیں وہ کسکو نہیں آتی مگر وہ کون ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں کیونکہ بعد حضرت عیسی علیہ السلام اول تو حضرت محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نے دعوی نبوت نہیں کیا اور نہ کوئی نبی ہوا دوسرے
آپ کے سوا اور کسی نے دعوی خاتمیت نہیں کیا اور نہ بحوالہ پیغام و وحی
خداوندی اس قسم کا لقب اپنی نسبت کسی نے کسیکو سنایا رہے حضرات حواریین
اول تو وہ نبی نہ تھے حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف سے دعوت دین مسیحی کرتے
تھے جسکا حاصل یہہ ہوا کہ وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے خلیفہ اور اونکے نائب
اور اونکے بھیجے ہوئے تھے بلاواسطہ خدا کے بھیجے ہوئے نہ تھے اور اگر اونکی نبوت حسب
اعتقاد مسیحیان تسلیم بھی کیجئے تو وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے اس مقولہ کے مخاطب
نہ تھے اس لئے وہ شخص کوئی اور ہی ہونا چاہئے رہے پولوس مقدس اونکو حواری
کہنا بجز بیحیائی اور کیا ہے حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں اونکا نام و نشان
نہ تھا با اینہمہ کسی نے اونمیں سے نہ دعوی خاتمیت کیا نہ بحوالہ وحی اپنے لئے

اس قسم کا لقب بیان کیا البتہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لقب خاتم النبیین اور نذیر للعلمین اور رحمۃ للعلمین قرآن شریف میں موجود ہی جن میں سی دو اول سی تو خاتمیت مراتب حکومت بالتصریح اور خاتمیت مراتب کمال بالالتزام نکلتی ہی اور تیسرے لقب سی خاتمیت مراتب کمال تو بالتصریح اور خاتمیت مراتب حکومت بالالتزام نکلتی ہی وجہہ اسکی یہہ ہی کہ نبی اور نذیر حکومت اور حکمرانی میں نایب خدا ہوتی ہیں جو اونکا خاتم ہوگا اوسپر مراتب ماتحتی ختم ہو جائینگی اسلئی وہ سب پر حاکم ہوگا اور تمام عالم اوسکی عملداری میں اسی طرح داخل ہوگا جیسی گورنر کی عملداری میں تمام ہندوستان اور کسی اور کو یہہ بات نصیب نہوگی کیونکہ اور سب ایسی طرح خاص خاص اضلاع کی حاکم ہونگی جیسی لفٹنٹ کمشنر وغیرہ خاص خاص اضلاع کی حاکم ہوتی ہیں اور چونکہ حاکم وہی ہونا چاہئی جو محکوموں سی افضل ہو اور خدا کی یہاں یوں ہی ہوتا ہی یہہ نا انصافی اور ظلم نہیں کہ لایق کوئی ہو اور حاکم کوئی ہو جائی تو یہی خاتمیت حکومت اور عموم حکومت اوسکی افضلیت اور اکملیت پر دلالت کریگی اور جب افضلیت اور خاتمیت حکومت میں بوجہہ عدل و قدر شناسی خداوندی م ہوا تو آیۃ رحمۃ للعلمین جو افضلیت اور خاتمیت مراتب کمال پر بالتصریح

دلالت کرتی ہی خاتمیت مراتب حکومت پر آپ دلالت کریگی باقی رہا اثر مذکورہ
کا خاتمیت مراتب کمال پر دلالت کرنا اوسکی صورت یہہ ہی کہ یہہ تو پہلی ثابت
ہوچکا کہ فرد اکمل و افضل اور افراد کی حق مین مفیض اور مفید اور موثر اور معطی
ہوتا ہی اور سب جانتی ہین کہ یہہ عین ترحم اور رحمت ہی ہو جو شخص تمام عالم
کی حق مین رحمت ہووے بیشک سب کی نسبت مفیض اور مفید اور موثر اور معطی
ہوگا اور اسوجہہ سی اوسکی افضلیت اور اکملیت کا قائل ہونا پڑیگا بالجملہ حضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مین اوس قسم کی القاب وارد ہین جو اونکی
افضلیت اور اکملیت اور خاتمیت مراتب کمال و حکومت پر دلالت کرتی ہین
اور کسی نبی کی شان مین اس قسم کی القاب نہین آئی اور قسم کی القاب آئی ہین اس
سی صاف ظاہر ہی کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل المخلوقات
اور اشرف الکائنات ہین اور یہہ بھی وجہہ ہوئی کہ اونکا دین آخر الادیان ٹھیرا
علاوہ اور معجزات کی قرآن شریف اونکا معجزہ ہی رہا اس دین کا آخر الادیان
ہونا تو یون ضروری ہوا کہ حکام ماتحت کی احکام کا مرافعہ کرتی ہین تو آخری
مرافعہ بادشاہی کچہری مین ہوتا ہی اور اوس کچہری کا حکم آخری حکم ہوتا ہی اور وجہہ
اوسکی یہہ ہوتی ہی کہ اوس کچہری اور اوس کچہری کی حاکم پر مراتب حکومت
ختم ہوجاتی ہین سو ایسی ہی کارخانہ حکومت دینی مین اوس شخص کا حکم آخر

رہنا چاہئے جیسے مراتب حکومت دنیا ختم ہو جائیں اور قرآن شریف کا اعجاز
ایسے شخص کے لئے اسلئے ضرور ہوا کہ اعجاز میں ایک طرح کا اظہار کمال ہوتا ہے
یعنی جیسے بڑا خوشنویس وہ ہے جو ایسا قطعہ لکھدے جسکی ثانی کی لکھنے سے اور خوشنویس
اور منشی عاجز آجائیں اور ظاہر ہے کہ یہہ بعینہ اظہار کمال ہے ایسے ہی بڑا نبی
اور بڑا صاحب کمال وہ ہے جو ایسا کام کر سکے جو اور اقران و امثال اوسکے
کرنے سے عاجز آجائیں غرض حقیقت اعجاز ایک قسم کا اظہار کمال ہوتا ہے اور
ظاہر ہے کہ کمالات میں اعلیٰ اور افضل علم ہے اور کیوں نہو محبت شہوت
ارادہ قدرت وغیرہ کمالات سب علم کے محتاج ہیں اور علم کسی کا کمالات سے
سے محتاج نہیں بلکہ حیات پر علم موقوف معلوم ہوتا ہے یہہ غور سے دیکھئے تو
حقیقت حیات قوت ادراکیہ اور قوت حرکت بالارادہ ہے اسلئے حیوان
کی تعریف میں حساس متحرک بالارادہ کہا کرتے ہیں غرض وہ قوت علمیہ حیات
کے ساتھہ ایسی طرح متعلق ہوتی ہے جیسے نور اجسام کے ساتھہ وہ قوت روح انسانی
کے ساتھہ اس طرح قائم ہے جیسے نور آفتاب کے ساتھہ جب وہ قوت رکن اعظم
اور جزو حیات ہوئی تو حیات اوسپر موقوف ہوئی وہ حیات پر موقوف نہیں
بالجملہ کمالات کا خاتمہ علم پر ہے جو شخص خاتم مراتب کمال ہوگا وہ علم میں بھی
افضل اور اکمل ہوگا اسلئے اظہار کمال علمی میں وہ سب سے فائق ہوگا اور نیز

اوسکی اور سب اوسکی بیانی عاجز ہوگی اور اسوجہہ سے اوسکی معلومات اور اوسکی
عبارات اور روئی حق مین معجز ہوگی جیسی اوسکی معلومات عجیب ہوگی ایسی ہی
اوسکی عبارات بہی عجیب وغریب ہوگی کیونکہ تجویز عبارت بہی اوسی کمال سے
متعلق ہے اس تقریر کو اہل فہم تو قرار واقعی سمجہیں گے اور اسوجہہ سے دین اسلام پر
ایسی طرح فریفتہ ہوجائینگے جیسے عاشق مزاج خاتم مراتب حسن وجمال پر فریفتہ
ہوجاتے ہین اور ہم سے پوچہو تو آدمی بہی وہی ہین جو صاحب فہم ہین اور جو
صاحب دولت ہین فہم سے معرّی ہین اونکو یہہ تقریر ایسی طرح مہمل
اور بے معنی معلوم ہوگی جیسے حیوان لایعقل کو کلام فصیح و بلیغ غرض جیسے حیوانات
کلام انسانی نہین سمجہتے ایسے ہی وہ آدمی بہی جو آدمیون کی فقط تصویر ہی تصویر
ہین ورنہ حقیقت مین ایک کلام لغو اور بے معنی خیال فرماکر کچہہ التفات
نکرینگے واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد خاتم النبیین وآلہ واصحابہ اجمعین فقط

مکتوب بنام حافظ عبدالرحیم خانصاحب عنایت فرمایمن سلامت السلام علیکم
آج ۱۴ رمضان المبارک دوشنبہ کو آپکا عنایت نامہ پہنچا دیکہا تو عجیب قصہ
نظر آیا حیران ہوں ہنسون یا روؤن حافظ صاحب آپکو یہہ کیا سوجہی آپ کی
سوجہنی سمجہنی کیا ہوئی اور مضمون بہت تہے اس دریائے ناپیداکنار مین آپ نے

کیون قدم رکہا آپ نی خدا جانی اپنی آپ کو کیا سمجہا ہی جو ایسی مضامین مسئلہ کی
حل کی درپی ہوئی الف بی تی پڑہنی والون کو کبہی نہ سنا ہوگا کہ سکندر نامہ
ابوالفضل مینا بازار بہی سمجہنی کا ارادہ کیا ہو اور علم معقول اور منقول اصول
الہیات کا تو کیا ذکر ہی پہر یہہ تو کیون نوبت آئی کہ الف با پڑہنی والا ایسی
مضمونون مین اپنی دل ہی دل مین بحث کری اور دل ہاری یا ہرائی وجہہ یہ
ارادہ نکرنی اور بحث نکرنی کی آپ ہی جانتی ہین کہ یہی ہی کہ طفل نادان الف با خوان
اپنی فہم کو اس مضامین سی تمام سمجہا ہی آپ ہی اگر اتنی بات سمجہہ لیتی تو کیون اس
خلجان مین پڑکر دین و ایمان کو نذر شیطان کرتی حافظ صاحب اس مضامین کیا
سمجہنی کی لئی ہی عقل مثل آفتاب روشن چاہئی جسکی نور سی سب یہہ چہوٹی بڑی
چیزین جدا جدا معلوم ہوتی لیکن اگر کسی مین ذرہ کی سی چمک ہو وی کیا ہی تو
اوس سی کیا کام چل سکتا ہی نادان اگرچہ نادان ہی پہر اگر اتنا سمجہہ لی کہ مین
نادان ہون تو بالکل نادان نہین کیونکہ یہہ بہی ایک قسم کی دانائی ہی ہان
نادان ہوکر اگر اپنی نادانی پر بہی مطلع نہو تو اوس سی زیادہ اور کون نادان
ہوگا وہ تو اوس طفل مکتب نشین سی بہی گیا گذرا جو اپنی آپ کو یون سمجہا ہی
کہ مین کتب مذکورہ اور علوم مستورہ کو نہین سمجہتا پر مین نہین سمجہتا تو کیا ہوا
ایک جہان کا جہان سمجہتا ہی اور تمام عقلاء اور اہل علم ان کتب و ان علوم

مق بتلاتے ہیں پہر کیونکر کہدیجیے کہ یہہ کتابیں غلط اور یہہ علوم باطل ہیں آپ بہی اگر
اسی طرح سمجہہ لیتے تو کیا اچہا ہوتا دل ہی مارتا تم نہ مارتے کیا تمہارے نزدیک
یہہ دلیل کم ہیں کہ سارے انبیاء اور سارے اولیاء اور سارے علماء اور سارے
عقلاء تقدیر مطلق اور معلق کو مانتے چلے آئے ہیں یہہ وہ لوگ ہیں جنکے عقل
و دانش کی قسم کہائی چاہیے پہر اسپر دو چار دس بیس سو پچاس ہزار دو ہزار
نہیں کروڑوں اور یہہ ہون سے بہی نوبت گذر گئی ہے تسپر تقدیر کا قصہ غلط
ہو تو یہہ معنے ہوں کہ وہ سب دیوانے تہے ایک آپ ہوشیار ہیں اب
تمہیں انصاف سے کہو اسکو جنون اور مالیخولیا کہتے ہیں یا کچہہ اور آپ کو
لازم ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اور علماء عظام کی بابت یہی
دلیل ایمان لائیں اور اپنے آپ کو اس مقدمہ میں طفل نادان مکتب نشین
سے بہی کم سمجہیں اور اپنے نقصان عقل کا اعتقاد یقینی دلمیں جماکر اس مضمون کے
سمجہنے کی آرزو اپنے دل سے دہوئیں اور اپنی تسکین کے لئے مولانا روم رحمۃ اللہ
علیہ کا یہہ شعر ورد زبان رکہیں ؎ آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ ؛
بر نتابد کوہ را یک برگ کاہ ؛ غرض جیسے گہاس کی تنکے سے پہاڑ نہیں اوٹہہ
سکتا ایسے ہی عقل ناقص سے یہہ مضمون نہیں سمجہا جاتا پہر میں کیا لکہوں
اور کیا آپ کو سمجہاؤں آپ کے سمجہنے سمجہانے کی بات تو وہی ہے جو اوپر لکہہ چکا

ہوں مگر مزید تسکین کے لئے اتنی بات لکھے دیتا ہوں آدمی مکان اپنے آپ بناتا ہے
مکان خود نہیں بنجاتا تسپر پائخانہ میں بیٹھکر پائخانہ پھرتا ہے کبھی روٹی بیٹھکر
نہیں کھاتا اور دسترخوان پر دہر کر دالان میں بیٹھکر روٹی کھاتا ہے کیہ باختیار
خود لے ضرورت پائخانہ نہیں پھرتا آپ فرمائیں پائخانہ نے کیا قصور کیا ہے
وہ اپنے آپ پائخانہ نہیں بنگیا دالان اور دسترخوان نے کونسے انعام کا کام
نہیں کیا اپنے آپ دالان اور دسترخوان نہیں بن گئے یہہ ظلم اور تعدی جو
پائخانہ پر ہوتی ہے اگر اسکا یہی جواب ہے کہ اوسے اسی لئے بنایا ہے اور وہ
اسی لائق ہے تو اگر خدا کی طرف سے بھی یہی جواب قبول فرمائیں تو کیا شوا
تہی خدا کا رتبہ بانی مکان کے برابر بھی نہیں رہے مطلق اور معلق کی بات اوسکا
یہہ حال ہے کہ خدا کے حساب سے سب مطلق ہے فرشتوں اور سوائے انکی اور مخلوقات
کی نسبت یہہ فرق مطلق و معلق ہے اسکی مثال کی ضرورت ہے تو سنئے آم کی تر
پختگی کے بعد پانچ سات دن سے زیادہ نہیں ہوتی ہاں اگر سرکہ یا شیرہ یا
تیل میں اسکو ڈالدیجئے تو پھر برس دو برس بلکہ زیادہ ٹھیر سکتا ہے سو قبل اسکے
کہ سرکہ وغیرہ میں ڈالے یوں کہہ سکتے ہیں کہ آم کا پھل یوں ہی رہا تو اتنے دن
ٹھہیگا اور سرکہ وغیرہ میں ڈالدینگے تو پھر اتنی مدت تک ٹھیر لیگا مگر یہہ بات
کہ سرکہ میں ڈالدیا جاویگا یا نہیں ڈالا جاویگا مالک آم کی ولسے تو چھپا

چاہئے اوسکی دلین جو کچھہ ہوگا وہی ظہور مین آجاویگا اوسکی خلاف نہوگا سو یہہ کہنا
نہ کہنا تو تقدیر معلق کی صورت ہے مگر مالک کی دلکی حساب سی یہی مطلق حافظ
صاحب تقدیر مطلق اور معلق کو یون سمجھی ہین آپ نی جو بے کیا دلسی تقدیر مطلق
اور معلق کی معنی گھڑی ہین یہہ آپ کی غلطی ہے اس غلطی کی بہروسہ آپ نی یہ
ایک خیال کا سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح ناحق بڑہا لیا اب یہہ عرض
ہے اگر آپکو سلیقہ فہم مطلب معلوم ہے اپنی نزدیک تہا تو اور علماء کی
دستخط کی کیا ضرورت ہے جواب معقول کی طلب چاہئے تہی اور نہین تہی تو
جواب معقول کس مرض کی دوا ہے عرض مکرر یہہ ہے کہ جیسی بیمار کو قوی
غذا سے منع کرتی ہین حالانکہ قوی غذا ایک بڑی نعمت ہے ایسی ہی ان
مضامین مین خوض کرنی سی کم عقلون کو ممانعت ہے غرض تقدیر کی حق
ہونی مین کچھہ شک نہین مگر اسکی ساتہہ اکثر لوگون کی اس مضمون کی نسبت
کم فہم ہونیمین بہی کلام نہین فقط ::

جناب مولوی حافظ حاجی عبد العدل صاحب السلام علیکم از روز شنبہ
پانزدہم ماہ صیام بخت خفتہ تا بیدار شد چٹھی رسان آمد و نامہ عنایت نامہ آمیز رسانید
باری غنیمت است کہ سر یاد آوران خود دارند درین عرصہ جیاد عنایت دیرینہ بتقاضاء
محبت کہ دارم من ہم بانتظار عنایت نامہ بودم مگر الحمد للہ کہ ہم آرزوی من بر آمد

وہم خیالم راست گردید الحمد للہ کہ اہلیہ شان کہ مونس غمخوار شان است سرمایۂ
فضل الٰہی دارد یارب بقیہ مرض ہم دور گردان باعث گرانی زیادہ تر ہمین خیال
بیماری اہلیہ اوشان بود خداوندا این قران السعدین را ہموارہ ہمین طور دارد
خبر خیریت اوشان و اہلیہ اوشان این طرف موجب اطمینان شد اکنون از
حال ما نیز بشنوند تا دی شب ریزش خلشی داشت گلو وقت فرو بردن
لب ذرد میگیرد و وقت بوقت گہہ و بیگاہ سرفہ کار خود میکرد دو ہمین
است کہ این بار توفیق قرآن خوانی نصیب این بی نصیب نشد مگر الحمد للہ کہ
از دیروز بہر گونہ صحت می نماید اگر باشد اثری بس خفیف باشد کہ ادراکش
بی تامل دشوار است آری ضعف دماغ ہمان است کہ بود بار بار موہای سرم
ہمہ ریختند بہر حیثیتے کہ از ہوای سرد باشد اندیشہ این خلش است
این بار خلاف عادت یک لشتارہ لنگی بار سرم می ماند دیدہ باید انجام این
ناتوانی چہ باشد باقی ہمہ وابستگان من بخیر اند اما اہلیہ احقر راسدیہ
جانگداز دی شب بجان رسیدہ ساعتی بیشتر از صبح مولوی محمود حسن صاحب
یا یازدہ بہ معیت دیگری از دیوبند رسیدند و خبری انتقال اہلیہ مولانا محمد یعقوب
صاحب رسانیدند غرض ازین افتان و خیزان آمدن آن بود کہ سیان صمین الدین
بہ نانوتہ بودند آنجا مگر رسیدن اوشان بجنازہ بود چون دیگری کفیل

این کار نشد بحکم سعادت کہ زاید از دیگران نصیب اوشان شد بیاد حق اوستادی
برخاستند و خبر این واقعہ کہ وقت نواخت یازدہ جا گزاشتہ قریب نواخت
چار رسانید اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن افسوس کہ خانۂ مولانا ویران شد و اطفال
خورد سال اوشان پریشان مگر تقدیر خداوندی بی‌نیاز است نیازمندان برگردانیدن
نتوانند چارۂ بجز صبر نیست رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا آن شفیق ادعای حصر ثبوت افضلیت
محمدی صلی اللہ علیہ وسلم از آیۃ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ از تحذیر نقل می‌کنند و من
ہر چند یاد کردم بیادم نیامد غالباً آن شفیق بغلط افتادہ‌اند این قسم مضامین در
جوابات اعتراضات مولوی محمد علی صاحب و مولوی عبد العزیز صاحب بقلم آمدہ‌اند
ہمی اعتراض این قصہ پیش آنعزیز نقل کردہ باشد بسبب امتداد زمانہ بجالیش تحذیر
یاد نماند مگر ہرچہ یاد آمد بجواب اعتراض آنعزیز می‌باید داد عرض من ہر جا بعد ان
رحمت از مرحوم علیہم افضل باشد ونہ ہر فرد مرحوم علیہم از مصداق رحمت نہ این
قضیہ کلیہ است نہ آن صفت رحمت خداوندی کہ صفت قدیم است و واجب
لاجرم از جملہ کائنات اعنی ممکنات کہ مرحوم علیہم ہستند بالیقین افضل است
وہم چنین در رحمت اصاغر بر اکابر چنانکہ در درود می‌بینی مرحوم علیہ بالیقین از
رحمت اشرف پس چون حال نفس رحمت این است مصداق مجازی رحمت
را کہ مظہر صفت رحمت می‌باشد برین قیاس باید فرمود لیکن این وقت شاید

انتظار وجوه افضلیت ومفضولیت دل خراشیها کند لهذا پیش بندیها میکنم
وضابطه این تمیز را رقم زده قاعده کلیه بنیاد می‌نهم کار رحمت ایصال چیزی یا
بچیزی است وکار غضب سلب چیزی از چیزی اول بنفع سردارد وثانی را
بضرر سروکار والحاصل ایصال آتش بتن وجامه مخالف این معروض بنظر آمده
باشد از نظر سرسری دانند چه این ایصال موجب ازاله اجزاء محبوبه واشیاء مطلوبه
میگردد وزین وجه داخل بضرر شد ورنه نفس ایصال حرارت اگر بجمیع الوجوه از
اقسام ضرر باشد نان گرم وطعام گرم همه از منفورات عنه می بودند نه از مطلوبات
بالجمله کار رحمت ایصال چیزی یا بچیزی است مگر یکی بدیگری همان رساند که بدامان
ودست خود دارد ودرین باره میدانی که باوجود وحدت مبدأ فیاض کائنات
چنان متفاوت اند که آئینه وذره وزمین وآسمان باوجود یکتائی خورشید
در نورگیری مراتب متفاوت اوفتاده اند پس اگر آئینه بدیگران نور افشانی
کند درخور وسعت خود کند واگر ذره کند موافق حوصله خود کند واگر زمین بافاده
نشیند حسب مقدور خود توان کرد وآسمان بداد ودهش برخیزد لایق استطاعت
خود توان داد مگر هرچه بادا باد دهنده از گیرنده بحیثیت داد ودهش افضل است
گو بحیثیت دیگر قصه برعکس بود اکنون موازنه حیثیات ضرور افتاد یعنی آن
مراتب متفاوت راکه بیشتر بآن اشاره کرده‌ام می‌باید سنجید وباز باید دید اگر

ذخیرہ سابق از عطار لاحق افضل است مرحوم علیہم از مصداق رحمت افضل باشد
واگر عطار لاحق از ذخیرہ سابق افضل است مصداق رحمت از مرحوم علیہم
افضل بود مثلاً با قتران نور و آئینہ رنگین آئینہ رنگ منور شد و نور ملون
از ہر طرف داد و ستد بمیان آید مگر چون نگہہ کردیم در جانب نور ذخیرہ سابق
اعنی نورانیت از عطار لاحق اعنی رنگینی افضل است و درجانب رنگ ذخیرہ
سابق اعنی رنگینی از عطار لاحق اعنی نورانیت کمتر چون این قاعدہ ممہد شد
دیگر می باید شنید در انبیاء عطار لاحق یعنی نبوت از ذخیرہ سابق اعنی آدمیت
افضل است پس اگر نبوت فیض محمدی صلی اللہ علیہ وسلم باشد لاجرم افضلیت
محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بہ ثبوت خواہد رسید آری بایں ہمین قاعدہ از آیۃ
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ افضلیت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم برانبیاء
کرام علیہم وعلیہ السلام بلکہ بر جملہ کائنات می توان برآورد چہ اندرین صورۃ بعد
ونعشاء جملہ فیوض چہ نبوت و چہ ولایت بلکہ چہ بوجود و چہ نمود ہمہ از برکات
ذات نبوی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم باشد ورنہ اگر در فیوض تخصیصی بمیان
آید کلیۃ این قضیہ کہ از لفظ للعالمین مستفاد است منقوض گردد چہ این قدر
مسلم است کہ در کائنات ہر چہ ہست فیض خارجی است کمال ذاتی نیست
کہ این جز ذات احدیت تعالیٰ شانہ دیگر از انہ سزد پس اگر جملہ فیوض

بوساطت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نگویند لاجرم فیضی کہ از طرف دیگران و
بتوسل دیگران باشد بعالمی رسیدہ باشد اندرین صورت آن عالم از عموم
للعلمین کہ تسلیم آن بر مومنان ضروری است برون افتد وآنکہ فیضی بفردی رسیدہ
باشد نہ بعالمی درینجا کاری نمیکشاید چہ ہر ممکن عالمیت بمعنی آنکہ علم وعلامت
است بر وجود موجد خود چہ از ہر پہلو ہر ممکن اینقدر ہویدا است کہ ہرچہ از
وجود و وجودیات در بر دارد ہمہ بالعرض وخارجی است بالذات وخانہ زاد
نیست ورنہ قدم بجای حدوث جلوۂ ظہوری کرد و وجوب بمقام امکان تسلط
میداشت ممکن ممکن نبودے واجب بودے حادث حادث نبودے
قدیم بودے چنانچہ ظاہر است ومیدانی کہ وجہ تسمیہ عالم ہمین است کہ
این علامت است بر موجد خود وچون نباشد آخر ہر بالعرض را از بالذات
ناگزیر است القصہ ہر شخص عالمی است جدا وآنکہ عالم بمعنی مجموعہ مستعمل است
اول مخالف آیہ است چہ اندرین صورت جمعیت للعلمین بیکار بود دوم این
استعمال حادث است معنی لغوی کہ پس از تدبر وجہ تسمیہ وفقہ [?] اللغۃ
می برآید ہمان است کہ من عرض کردہ ام بالجملہ برین تقریر جملہ فیوض بتوسط
محمدی صلی اللہ علیہ وسلم باشد مگر این توسط ہمان توسط فی العروض باشد
نہ توسط فی الثبوت چہ کار رحمت چنانکہ گفتم افاضہ وایصال است وفہمیدی

کہ امانۃً یعنی دادن بلی بودن عطا قبل از دادن صورت نہ بندد وظاہر است کہ اینجاداد ذات نیست وادصفات است ہرچہ از عالم علوی ودرگاہ احدیت بعالم سفلی رسیدہ وجود باشد یا علم وقدرت ہمہ از قسم صفات است ذات خداوندی بکس عطا نیامد نظر برین توسط محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نیز در صفات باشد پس اگر ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم را دہند واین صفات گویم لاجرم اول اثبات جملہ صفات دران بہ نسبت ذات احدیت بالعرض تصور نمائیم بعد ازان ظہور آن صفات در دیگر کائنات بہ نسبت ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بالعرض بود چہ اندرین صورت نہ این توان گفت کہ ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم باذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ازین صفات معری است فقط مابین معدن صفات وکائنات سفیر است وبس چنانکہ رنگریز در خم نیل وجامہ سفیر محض باشد ورنہ غلو جناب باریتعالی وحبیب او تعالی صلی اللہ علیہ وسلم از صفات کمال لازم خواہد آمد ونہ این توان گفت کہ شل دست ومفتاح کہ در حرکت ہم پایہ یکدیگر باشند ہمہ در کمالات وصفات ہم پایہ جناب احدیت ودرگاہ احدی باشند ورنہ مساوات واجب وممکن وقدیم وحادث جدا لازم آید ومخالف مفہوم رحمت جدا باشد چہ کار رحمت ہمان اعطاء است کہ مکرر عرض کردہ شد وپیدا است کہ دست اگرچہ واسطہ حرکت مفتاح است مگر معطی حرکت باو نیست ورنہ

مثل سفینہ و جالس سفینہ یک حرکت بدو متحرک منسوب میشود و یک حصہ در دو شریک مشترک می گردید زیرا کہ عطاء با عطاء اند وحدت بہ تعدد دگر آید زیرا اگر درہمے بہ عمرو دہد آن درہم بعد اعطاء ہم ہمان درہم است کہ قبل اعطاء بود پس اگر صفتی از جانبی بجانبی بعطاء آید لاجرم بدو طرفش انتساب باشد مگر در صورت اعطاء بہر دو طرف انتساب بالعرض نتوان شد چہ ما حصلش بجز اخذ و گرفتن دیگر چیست و پیدائی کہ بہر گرفتن چیزی کہ میسر نبود دہندہ نیز باید یعنی آنکہ معدن و مصدر او باشد الحاصل در صورت اعطاء و عطاء یک صفت در معطی و معطی لہ مشترک باشد و در صورت سفارت اگر چیزی در سفیر ہم باشد آن دگر باشد و آنکہ دران سفارت اگر اول شان حرکت سفینہ و جالس آن است و ثانی حال حرکت دست و مفتاح دہین است کہ در جالس و سفینہ فرق سکون و حرکت و سرعت و بطو در قدر متوسط فیہما پیدا نتوان شد چہ در واحد بجز وحدت دیگر چہ باشد و از واحد احوال متضاد در وقت واحد ظہور نتواند و در حرکت دست و مفتاح فرق سکون و حرکت و سرعت و بطو مشاہدہ توان کرد آیا نمی بینی کہ بسا اوقات حرکت دست بطی باشد و حرکت مفتاح سریع و ازین قسم است آنکہ در بعض آلات مثل آلات اوقات شناسی وغیرہ سامان جر ثقیل از حرکت مستقیم حرکت مستدیر و بالعکس زاید از حرکت مدورہ

چو بین کہ زیر اعراب ہا مستدیر باشد ببین چہ سامان جالسان بحرکت مستقیم میروند
از بخار روشن شدہ باشد کہ حرکت سفینہ دیگر است و حرکت ذی واسطہ دیگر بالجملہ
در صورت رحمت ضروری است کہ از یک جانب داد و دہش بود و از جانب
دیگر اخذ و گرفتن و این را وحدت عطار ضرور و بقت وجود در معطی ضرور است
نظر برین از جملہ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اگر دربارہ اثبات افضلیت
شوند ضرور است کہ وساطت عروض را اول درجہ فیوض تسلیم کنند نبوت
یک طرف پس ہمان آتش در کاسہ ہا باشد بہمین لحاظ بخدمت مولوی عبد العزیز
صاحب رقم زدہ بودم کہ بیشتر از اثبات کلیہ افضلیت مصداق رحمت
از مرحوم علیہ اثبات افضلیت ازین آیۃ خیال خام است باز ہمان وساطت
عروضی تسلیم کردنی است کہ اکنون بہزار شدید انکار آن است بالجملہ خدا و
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت دیگر واسطہ فی العروض اند یک صفت
بہر دو طرف انتساب دارد بہ یکی انتساب قیام و مصدریت و بالذات است
و بدیگری نسبت وقوع و قبول و بالعرض از طرف اول فعل است و تاثیر و در
طرف ثانی انفعال و تاثر و از ینجا بسر وحدت وجود ہم توان رسید و استبعاد یکہ
باستماع این کلمہ بدلہا ہر خاص و عام میرسد دفع توان کرد تفصیل این اجمال آنکہ
چنانکہ در مثال سفینہ ہا و جالسان سفینہ حرکت واحد است و متحرک متعدد ہمچنین

در مثال وجود خالق و مخلوقات وجود واحد است و موجود متعدد چنانکہ سفینہ چیز
دیگر است و جالس چیز دیگر ہمچنین خالق دگر است و مخلوق دگر اصل خرابی
ازان خاستہ کہ از وحدت وجود وحدت موجود می فہمند مگر این چنان است
کہ از وحدت حرکت وحدت متحرک فہمند وہم ازین تقریر دفع آن خدشات
کہ باستماع امثلہ می خیزند متصور است یعنی آنکہ در مثال جالس سفینہ مثال مصباح
ودست بہمہ وجوہ تشارک معلوم می شد از عرض احقر مندفع شد اگرچہ غلطی
مثال در صحت قواعد قادح نمی گردد پس اگر بالفرض مثال غلط ہم باشد چہ حرج
این ہمہ بکمال عجلت عرض کردہ شد امروز چار خط کلان نوشتہ ام فرصت
تامل بیشتر نبود اگرچہ وقت فرصت ہم ہمین دوادوی حسب عادت خود می
نوشتم امیدم آن است کہ این تقریر بنام خالی از مطلب نبر آید مگر تدبر و
تدقیق نظر بکار است اگر بالفرض بنظر سرسری مطلب اصلی مفہوم نشود بشود
نیایند و بکرر بنظر ہای مکرر دیدہ مطلب بر آرند ہمہ مردمان خانہ و یاد آوران
احقر خصوصاً مولوی عبدالرب و شیخ محمد عمر و میان ظہور اللہ یعنی نوجوانی
کہ بمعیت آن عزیز مظفرنگر آمدہ بودند از من سلام رسانند اگر حافظ محمود
احمد و حافظ محمد اسحاق صاحب رونق افروز دہلی باشند بخدمت شان
نیز از من سلام معروض باد مگر بجان شروط بیاد است فقط مولوی

فخر الحسن صاحب ہنوز نہ رسیدہ اند از دہلی براد آباد و از مراد آباد برامپور رسیدہ
دربارہ تحذیر با مولوی ارشاد حسین صاحب و شاگردشان و دیگر طلبہ گفتگوہا
دند فحوای تحریرشان کہ از رامپور مورخہ ششم رمضان رسیدہ آنست کہ
مولوی فخر الحسن صاحب از ہمہ گوئی سبقت ربودند واللہ اعلم بالصواب
نوشتہ بودند کہ امروز اینجا می برآیم و براد آباد و دہلی و میرٹھ و دیوبند اتابت
دہ بنانوتہ میرسم پس از طرح مقدار اقامت یکروز در ہمہ مقامات بانتظار
شان می گذرد مگر ہنوز نرسیدہ اند مگر شاید بمقامی زاید از تخمین مالبر
آوردند مولوی محمود حسن میفرمودند کہ شاہ جی مظہر از جائی دریافتہ اند
خطی بہ سہارنپور آمد غالباً در آن چنان مرقوم است کہ نہم بمراد آباد
بودند واللہ اعلم بالصواب ؛ الحمد للہ کہ امروز تاریخ پانزدہم ماہ محرم
در سنہ ۱۳۲۲ یکہزار و سہ صد و بست و دو ہجری نبوی صلعم از نقل جملہ تحریرات
الفراغ یافتم بقلم خادم قدیم محمد ابراہیم غفرلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم مخدوما عنایت فرما۔ دریں نزدیکی محمد احمد ارشاد احسن صاحب الحمد للہ گرامی نامہ کا
سلام قبول فرمایئے اور یہ بعد ازیں آپ کا نامہ ... نہیں آیا بوجہ ... نانوتہ آیا تھا
میں مقام ... چند روز جب ... ان دنوں آداب نامہ عنایت نامہ ملا

آج تعمیل ارشاد کرتا ہون تین جزو جوابات استفسارات ڈاک مین بھیجتا ہون اور
ایک ورق اور جسپر چند سطر مرقوم ہین اور شروع مین موٹے قلم سے لفظ تنبیہ لکھا ہوا ہی
ساتھ ملفوف ہی اوس ورق کو علاحدہ نکال کر منشی عبدالرزاق صاحب کے سپرد کر دینا
شاید کسی وقت کام آئے اور کسی نیم ملا کے اعتراض کا جواب ہو جائے اور باقی اجزاء جوابات
کو مولانا محمد علی صاحب کے حوالہ کر دینا اور یہ عرض کر دینا کہ بعد مطالعہ ان اوراق پر بزرگ بند
مہر کر کے واپس فرمایئے میرے پاس اسکا مثنیٰ نہین اگر مثنیٰ ہوتا تو کچھ ضرورۃ نہی اور اگر
پسند نہ آئے تب بھی اس اصل کا لوٹا دینا ضرور ہی اگر کسی صاحب کو خیال جواب الجواب ہو
تو نقل کر لینے کا اختیار ہی مینے دو روز مین تمہید اور ۲۶ جواب لکھے ہین اور صاحب
چار روز مین نقل کر لین حد نہایہ ہفتہ مین نقل کر کے واپس فرمائین مگر مولانا کی
انصاف پرستی سے مجکو امید تسلیم ہی اندیشہ تعصب نہین آئندہ خدا جانے اگر اب بھی مولانا
محمد علی صاحب کا وہی اصرار رہا تو یون کہو قیامت آگئی جب ایسی بھولے بھالے بلکہ عالم بھی
شاگردون کے کہنے سننے سے ایسی چال چلنے لگے تو ہم کو کون رد کرنے والا ہی منشی صاحب
اگر نفسانیت عند اللہ مذموم ہوتی اور بحث مباحثہ کا انجام خراب نظر نہ آتا اور نزاع
اہل اسلام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوتا تو اب بھی ایک تماشا دکھلا دیتے
انشاء اللہ مخالفان احقر کی حقیقت معلوم ہو جاتی سب کے نشے انشاء اللہ ڈھیلے ہو جاتے

مدعیان روزگار اپنے کیے کو پہونچ جاتے ہر کیا کرون الدنیا سجن المومن اس گرفتار
ہوا وہوس کے ذمہ خدا کی طرف سی بھی درباره مداحتہ سکر لعون قید وقیود لگی
ہوئی ہین وہ نگی باز و پرس کا کھٹکا ایسے کام کرنے نہین دیتا ورنہ اس نفس کافر کیش کو
کیا کیا کچھ پہرین نہین آتی مگر اپنے اندیشون کے پتے لاچار ہو کر اس شعر کو پڑہ کر
اپنے آپ کو سمجھا لیتا ہون ؎ جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ؛ چون ندیدند حقیقت
رہ افسانہ زدند ! اور اسی لئے تحریر جواب گھبرا تا رہا اور لکھ لیا تو ارسال مین آتنا
توقف کیا اور سو طرح کے حیلہ وحجت نکالتا رہا مگر جب دیکھا سب اہل مشورہ ایک طرف ہین
ادھر آپکا عنایت نامہ بھی بطلب جوابات معلومہ پہونچا ناچار ہوکر روانہ کرتا ہون پر
شور بکری سی ڈرتا ہون اس لئے پہر بھی یہی آرزو ہی کہ جانے دیجئے مخالفون کی راہ پر آپکی
امید نہین جو موافق ہین اونکے اندیشہ برگشتگی نہین اور اگر کوئی برگشتہ بخت پہر بھی گیا
تو معتقدون کا بندہ شائق نہین تسپر جواب اعتراض جواب ہوتا ہی آداب نیاز نہین ہوتا۔
ناظران اوراق کو میری تیز قلمیان جو باوجود عزم ادب بمقابلہ تعریضات مخالفان
بی اختیارانہ سرزد ہو گئیں ہین ناگوار ہونگی اور اسوجہ سی کیا کیا کچھ برا بھلا نکہین کہیے
مگر خدا تعالے خوب جانتا ہی کہ جسکو کہتا ہون اور مولوی محمد علی صاحب کو کیسا سمجھتا
ہون مین اصل ہی خط مین لکھ چکا ہون کہ یہ استفسارات مولوی محمد علی صاحب کیطرف سے

معلوم نہیں ہوتے کسی طالب علم کا ہذیان ہی مولوی محمد علی صاحب کے نام لگا دئے ہیں
اور مولوی محمد علی صاحب نے بوجہ تسلیم طبع اور اپنے نشیب و فراز پر کچھ غور و لحاظ نہیں فرمایا بلکہ
اوروں کے اعتماد پر آپ پر رد ہو بیٹھے ہیں ورنہ اونکی وہ سلامت روی اور کم گوئی
اور اونکی وہ یکسوئی اور معصوم دشی جو پر اس ایسی باتونکی مخالف ہی اون سے ایسی حرکت
اور وہ بھی میرے مقابلہ میں ہرگز کرنے نہ دیتے اسلئے ان جوابون کے پیش کرنے مین
اول تو یونہی ڈرتا ہون اور آخر کار سے خائف ہون مبادا ملازمان شب و روز
اس قصہ کو دور ہو جائیں اور مولانا کو آمادہ جواب کریں اور ادھر بھی نفس پر پیش
اپنیون پر آجاوے اور محبت اور ملاقات سب خاک میں مل جائے اور میں سنتا ہون
کہ کہیں کہیں اور بھی استفسارات مولانا کے جواب کا فکر ہی سو کہیں ورسی اگر کوئی
جواب آگیا ہو یا آج کل میں آجاوے تو پھر کاہلکو ان جوابون کو پیش کیجیے بلکہ بنظر
مصلحتہا دیگر ہی پر تو پیش کرنا ہی مناسب ہے اگر پیش ہی کرنا ہوگا تو جب پیش
کرینگے جبکہ مخالفان احقر اور دن کے جواب سے فارغ ہو لیں گے نیز اگر آپ کی
بھی رائے ہو کہ جوابات مرسلہ پیش ہی کرنے چاہیں تو بعد استخارہ اختیار ہے لیکن
خاص آپ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی محمد علی صاحب کے یہاں سے اس تحریر کا واپس آنا
معلوم جس طرح ہو سکے اس کی نقل کرا کر اون کی خدمت میں بھیجئے گا ورنہ یہ تحریر

بالیقین کم تر سی جاتی رہیگی اور قطع نظر تاسف احباب جو اسکی نقل کے مشتاق ہیں
اگر خدانخواستہ اس طرف سے بھر کچھ جبر اجبار ہوئی تو احقر کو وقت جواب مشکل ہو جائیگی
مگر بہرحال کسی کسی کے سامنے اتنا کہہ دینا ضرور ہی کہ قاسم کے پاس سے بھی جواب آگئے ہیں
اور نقض دور روز میں سب استفسار دن کے دو دو جواب مع تمہید و خاتمہ لکھکر فراغت
پا بیٹھا تھا بعد مکرر یہہ عرض ہی کہ یہہ تحریر گم نہو جائے آپ کی غفلت شعاریاں میرے دل آزاری کا
سبب نہو جائیں میرے دل دکھانیکے لیے یہی مفتیان دہلی کا غل و شور کافی ہی آپ
زیادہ تکلیف نفرمائیں منشی عبد الرزاق بیگ صاحب کی خدمت میں بعد سلام ضرور یہہ
کہدینا کہ آپ بھی مضمون واحد تصور فرمائیں مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بعد
سلام و نیاز میری طرف سی یہہ عرض کر دینا کہ اب آپ کو انصاف فرمانا ضرور ہی میں
نہیں کہتا کہ آپ میری رو رعایت کریں اور کیوں ہی کہ کیا ہوتا ہی اگر میری رعایت
ہوتی تو یہہ نوبت ہی کیوں آتی بر حق کی طرف داری کیلیے خدا کی طرف سی جسقدر تاکیدیں
ہیں سب آپ کو معلوم ہیں اور اس باب میں جسقدر وعد و وعید ہیں آپ خوب جانتے ہیں
خدا کو یاد کر کے محاکمہ فرمائیے گا زیادہ کیا عرض کروں والسلام ؛

حُجّة الاسلام

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی شانِ علمی اور حکمت و بصیرت پر مبنی چند اہم مضامین جو کہ حضرت کی سوانح کا تتمہ ہیں

حکمتِ قاسمیہ

تحریر لطیف: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی علیہ الرحمہ

عنوانات: مولانا مدثر جمال

حضرت حکیم الاسلام کا ایک نایاب مقالہ جو ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کے علوم کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ مقالہ مجلس معارف القرآن کی ابتدا کے وقت لکھا گیا تھا۔ (نعمان)

دین عقیدہ وعمل کا مجموعہ ہے:

دین عقیدہ وعمل کے مجموعے کا نام ہے۔ عقیدے سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدے کا رسوخ ہوتا ہے، جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ وبار کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ مجموعۂ عقاید کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام، اور ان دونوں کے مجموعے کا نام دین ہے۔ ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے، اور اسلام برگ وبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے:

الایمان سر والاسلام علانیة

”ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے“۔

مذاہب کے ردّ وقبول کا حقیقی معیار عقائد ہیں:

ایمانی عقائد اعمال کے ردّ وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی ردّ، نا قابلِ قبول اور اکارت ہے، اور یہی کسی مذہب کے حق و باطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں، کیوں کہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو۔ اس لیے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالفِ عقل تو نہیں ہیں؟ نیز صاحبِ شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟ اس لیے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ان کے ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو اور دین اور شریعت پر خواہ اصول کا حصہ ہو یا کلیات کا سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے۔ اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اس میں دخل نہ ہو تو اسے ''صورتِ ایمان'' تو کہا جا سکتا ہے لیکن ''حقیقتِ ایمان'' باور نہیں کیا جا سکتا۔

ایمانِ تحقیقی اور ایمانِ تقلیدی پر ایک نظر:

اسی بنا پر محقق علما میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہوا ہے کہ ایمانِ تقلیدی جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو، معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمانِ تقلیدی معتبر ہی نہیں، جب تک کہ وہ دلایل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بنا پر قرآن حکیم نے دین و ایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجود باجود اور ان کا مثالی ایمان ہے، جو صاحبِ شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیے ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ
اتَّبَعَنِیْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ

(سورۂ یوسف: ۱۰۸)

"بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں سے"۔

پھر صحابۂ کرامؓ کے بارے میں اولیت کے ساتھ اور ان کے مابعد کے لوگوں کے بارے میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ، لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (سورۂ فرقان:۷۳)

"اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھائیے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہوکر۔"

اس کلام خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی، اس کی بنیاد بصیرت و تحقیق پر ہوتی ہے، گو اس کے درجات حسب استعداد متفاوت اور مختلف ہوں، جس کا ثمرہ فراست ایمانی ہے، جو ہر مومن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے، اسی لیے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله

"مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بہ قدر ایمان بصیرت و فراست اور نورِ حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہوسکتی، کہ بے بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہوسکتی، جس کا حاصل وہی ایمان تحقیقی ہے نہ کہ سنا سنایا ایمان۔ اسی لیے اس دین میں عقل و بصیرت کی عظمت و فضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے، اور اسی لیے قرآن حکیم نے جگہ جگہ آیات الٰہی میں غور و فکر اور تدبر و تذکر اور حجۃ طلبی کی طرف بلایا ہے، جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت و یقین کے پیدا کیے جانے کا امر ہے۔ اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل و بصیرت اور تحقیقی حجت لیے ہوئے ہو، آیات و روایات میں کہیں حلاوت ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں طعم ایمان سے، کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہم سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ قوت یقین و اطمینان اور تحقیقی ایمان ہے (خواہ وہ ظاہری دلائل سے قائم ہو یا باطنی حجتوں سے)، جس کے ہوتے ہوئے ایک

انسان ایمان کے بارے میں ریب وشک سے بالاتر، محفوظ اور ضلالت وگم راہی سے مامون ہوسکتا ہے، پھر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ پہاڑ کا اپنی جگہ سے سرکا دیا جانا ممکن ہے لیکن اس مرد مومن کو ایمان سے ڈگمگا دینا یا کسی خلاف ایمان بات پر اسے پھسلا دیا جانا ممکن نہیں ہے۔ ایک حقیقی اور مبصر مومن اس قسم کی ساری ترغیبی اور تخویفی قوتوں کو اپنی ایمانی طاقت سے پرکاہ کی طرح پھونک مار کر اُڑا دیتا ہے اور اس کے ایمان پر یہ بیرونی شکوک واوہام ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف صالحین کی مثالی استقامت:

صحابۂ کرامؓ اور اسلاف صالحین کی پاک زندگیاں اس پر شاہد ہیں کہ قرن اول میں انہیں ایمان لانے کے جرم میں کیا کیا ایذائیں نہیں دی گئیں اور کیا کیا سختیاں ان پر نہیں کی گئیں۔ انہیں ننگے بدن دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا، کوڑوں کی ماریں دی گئیں، پا بجولاں (پیروں میں بیڑیاں ڈال) کر کے حبس وقید کی سزائیں انہیں بھگتنی پڑیں، دانہ پانی بند کر کے انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا لیکن ان کے سچے اور پاک قلوب جن میں ایمانی بصیرت اور وعدہ ہائے الٰہی پر یقین واطمینان کی طاقت گھر کر چکی تھی، رتی برابر ان آزمائشوں سے متاثر یا دل تنگ نہیں ہوئے اور اپنے ایمان کو دنیا ومافیہا سے بڑھ کر عزیز متاع جان کر اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں سرکے۔

وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ

(سورۂ آل عمران: ۱۴۶)

''اور وہ نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں، اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے''۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ ان کا ایمان محض تقلیدی یا سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ علیٰ وجہ البصیرۃ دلایل وبراہین کی اساس پر قایم شدہ حقیقت تھی، جس نے ایمان کو ان کے حق میں غیب محض نہیں بلکہ مثل مشاہدہ کے آنکھوں دیکھا بنا دیا تھا، جس سے دنیا کی ساری شک اندازی اور وحشت انگیزی کی طاقتیں تھک کر بیٹھ رہیں، لیکن ان کے بینا قلوب پر اثر انداز نہ

ہوسکیں۔ اگر عیاذاً باللہ یہ ایمان افواہی یا محض سنی سنائی بات ہوتی جس میں قوت بصیرت و شہود نہ ہوتی تو اس کا ڈھل مُل ہوجانا غیر یقینی نہ ہوتا۔

عقلی براہین و دلائل کی ضرورت کیوں پڑی؟

یہ فرق ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرن خیر کے یہ لوگ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) اپنے صفا ذہن، سلامتی عقل وفطرت، قرب عہد نبوت، فیضان صحبت نبوی، قلت اختلاف اور بہ راہِ راست صاحب نبوت سے کلام نبوت سننے کی وجہ سے اول مرحلے ہی میں نور بصیرت کے بلند مقام پر پہنچ جاتے تھے، جو سارے دلائل اور بصیرتوں کا نچوڑ تھا۔ انہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ نقل کے ساتھ مستقلاً عقلی دلائل کی تفتیش میں پڑ کر منقول کو معقول پر منطبق کرنے کی فکر میں پڑیں، جب کہ وہ نقل و وحی ہی فیضان صحبت نبوی سے ان پر عقل و معرفت کے سارے دروازے کھول دیتی تھی، جس سے ان کا ایمان تحقیقی اور عقل و نقل کے صحیح امتزاج سے جامع اور حقیقی ایمان بن جاتا تھا، لیکن زمانۂ نبوت سے جوں جوں بُعد ہوتا گیا اور فلسفیانہ موشگافیوں سے فتنۂ شبہات نے عقل نارسا کو آگے رکھ کر وحی الٰہی کے راستوں میں مداخلت شروع کی، جس سے سادہ لوح قلوب کی قوت یقین واذعان میں فرق آنے لگا تو ضرورت پڑی کہ ایمانوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے عقلی دلائل و براہین کا ذخیرہ بھی مہیا کیا جائے اور دین کے جاں باز سپاہیوں کو نقل کے ساتھ عقل صافی کے ہتھیاروں سے بھی مسلح کیا جائے، جس سے وہ شک اندازوں کی مدافعت کرسکیں اور ان بندگان عقل پر حجت تمام کی جاسکے اور ساتھ ہی ارباب نقل وروایت کے لیے بھی ان عقلی حجتوں سے مبطلوں (باطل پرستوں) کے مقابلے میں تسکین وتسلی کا سامان بہم پہنچایا جاسکے۔

فرق باطلہ کے وجود کا آغاز اور متکلمین اسلام کی کاوشیں:

ابتداً فتنۂ تشکیک نے اُمہات عقائد اور اُصول وکلیات دین کو فلسفیانہ اختراعات کی آماجگاہ بنایا اور ان کی اصولیت وکلیت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر انہیں اپنے مزعومات کے رنگ میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ وہ عقل جو خادم وحی ونقل بنا کر دنیا میں اُتاری گئی تھی اسے اصل قرار دے کر وحی الٰہی کی مرادوں میں ناجائز تصرفات ہونے لگے، جس سے اس

بائی عقل کی بہ دولت مختلف فرق باطلہ روافض، خوارج، قدریہ، جبریہ اور معتزلہ نے جنم لیا اور دین کے نام پر کتنی ہی پارٹیاں بن گئیں، جنہوں نے فتنۂ شکوک وشبہات کے بند سوت کھول دیئے اور امت کو جدال ونزاع کا شکار بنا دیا، اس لیے اکابر سلف نے قدم بڑھایا اور اصول دین کی گہرائیوں پر تا بہ حدِ ضرورت حکمت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی راہیں ہم وار کردیں، جو دین میں پہلے سے مرکوز تھیں، لیکن زیغ آور قلوب کی وجہ سے یہ فتنہ اسی حد پر نہیں رہا بلکہ آگے بڑھا اور جدید پارٹیوں نے امہات عقاید وکلیات سے گزر کر امہات مسایل میں بھی جنہیں فروعی عقاید کہنا چاہیے، وحی کی متوارث مفہومات سے الگ ہوکر اسی سرکش عقل کے بل بوتے پر رخنہ اندازی جاری رکھی، جس سے اور بھی بہت سے اسلامی مسایل ان کے فلسفیانہ مطاعن کی زد میں آگئے، تو ارباب کلام کا طبقہ پیدا ہوا۔ شیخ ابوالحسن اشعریؒ اور شیخ ابو منصور ماتریدیؒ جیسے ائمۂ کلام آگے آئے اور انہوں نے وحی الٰہی کی روشنی میں فلسفے کا بھرپور مقابلہ کرتے ہوئے عقاید ومسایل کو عقلی لباس میں دنیا کے آگے رکھا، جس سے عقل کے مدعیوں کی شک انداز راہیں بہت حد تک مسدود ہوگئیں اور منقول دین رکھنے والوں کے مقابلے میں مبطلوں کے یہ عقلی ہتھیار بے کار ہوکر رہ گئے۔ گو یہ فرقے نہیں مٹے مگر فرقے ہی سمجھے گئے اور انہیں اصل جماعت کا کٹا ہوا حصہ ہی شمار کیا گیا، پس جس طرح علمائے حق نے نقل وروایت کے میدان میں وضاعین حدیث، تلبیس کنندگان روایات کی روایتی دیسہ کاریوں کے پردے چاک کرکے رکھ دیئے تھے اسی طرح درایتی میدان میں ان مدعیان عقل کی معنوی تحریفات، جاہلانہ تاویلات اور دروغ بافیوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی، اور ان کی نارسا عقلوں بے کے وہمیات کو عقل مصفا کی حقیقی روشنی سے شکست دی، جس سے ایک طرف اگر یہ تخریبی جماعتیں تھک کر مایوس ہوگئیں تو دوسری طرف عقاید ومسایل کے ان حکیمانہ عقلی دلایل سے ایمان والوں کے ایمان کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہوتا گیا۔

لیکن فتنۂ شبہات کی جڑیں بہرحال قایم ہوچکی تھیں جو قایم رہیں۔ مختلف فرقوں اور پارٹیوں کی زیر سرپرستی ان فتنوں نے اصلیت کی صورت پیدا کرلی اور یہ مختلف مکاتب خیال نئے روپ کے مکاتب ومدارس میں مستقلاً زیر بحث لائے جانے لگے۔ اس لیے فلسفہ مزاج

پارٹیوں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اہل حق کے مقابلے میں کون سا حربہ استعمال کریں؟ خالص اصولی عقائد کا میدان چھوڑ کر اسلام کے عمومی مسائل میں ان فتنوں کا گدلا پانی پھیلانا شروع کر دیا، یعنی عام دینی مسائل میں اس عقل تنگ دتاز سے انکار وتشکیک کے فتنے کا آغاز ہو گیا، تا کہ اہل حق کو نفس دین ہی سے بدظن بنا دیا جائے اور وہ بالآخر ان ہی نو خیز پارٹیوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں، تو ارباب حکمت ومعرفت اور مفکر قسم کے ارباب فضل وکمال آگے آئے اور انہوں نے اسلام کے تمام اُمہات مسائل پر حکیمانہ اسلوب اور عاقلانہ انداز سے کلام کیا۔ عام اسلامی مسائل کے اسرار ونکات پر عقلی دلائل سے بحث کی اور مسائل کی حقیقت کھول کر فلسفے کا تار وپود بکھیر دیا۔

حکمائے اسلام کی خدامات کا اجمالی جائزہ:

امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام خطابیؒ، ملک العلماء شیخ عز الدین ابن عبد السلامؒ اور ابن عربیؒ جیسے عرفا اور دانش وران حکمت دین کھڑے ہوئے اور انہوں نے دین کی حقایق ومصالح کو عقلی براہین سے پیش کر کے نہ صرف دین کی حدود ہی کو مضبوط کیا، اور نہ صرف دین کے ہزار ہا مخفی اسرار ومستور گوشے ہی اپنی دوربین عقلوں سے کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے بلکہ عقلی مباحث کے لیے مستقل بنیادیں ہموار کر دیں۔ امام رازیؒ نے اپنی مستقل تفسیر کا موضوع ہی تفسیر بالدرایت اور تفسیر بالمعقول رکھا اور قرآنی آیات کے عقلی پہلوؤں کو واشگاف کرنا قرار دیا۔ امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" لکھ کر اصولی طور پر سرے سے فلسفے ہی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا، جس سے ملک اندازوں کے گروہ پر کاری ضرب پڑی اور انہیں سوچ پیدا ہوئی کہ وہ اب اہل حق کے مقابلے میں کون سا حربہ اختیار کریں؟ انہیں حیرانی تھی کہ امہات عقاید، امہات مسایل آیات قرآن اور روایات حدیث کے تمام دایروں میں تو عقل معاد عقل معاش کو شکست فاش دے چکی ہے تو آخر اب ان مایہ سازِ عقل ودین کے بقا کی کیا تدبیر ہے؟

بندگانِ عقل کی جزئیات مسایل میں تنگ وتاز:

اس لیے آخرکار انہوں نے امہات مسایل کا میدان چھوڑ کر فروعی مسایل میں اپنے وہم وشک کا گدلا پانی بہانا شروع کر دیا، جس سے مسایل فقہیہ میں انکار وتشکیک کے فتنے کا آغاز

ہوگیا۔ مسائل فرعیہ کی غیر معقولیت، انفرادی استبداد یا ائمۂ تفقہ کے فروعی اختلاف کو تخریب دین دکھلانے کے اتہامات سے اسلامی فقہ کو بے اعتبار بنانے کی مہم شروع کردی، تاکہ اہل حق اگر اصول سے نہیں ہٹتے تو کم از کم اس حیلے سے عملی فروعات ہی پر سے ہٹ جائیں، حتیٰ کہ فقہی مسالک کے اختلافات کو بہ صورت نزاعات اُجاگر کر کے جدال و قتال کے فتنے کھڑے کیے، تاکہ اُمت کم زور پڑ جائے اور اہل حق مغلوب ہو جائیں۔ بنیاد وہی ایک تھی کہ انہوں نے عقل کو نقل پر حاکم مان کر مسائل کا فیصلہ اپنی جزوی عقلوں کے تحت رکھا، تاکہ اگر اصول کو مضمحل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تو کم از کم فروعات فقہیہ ہی کو ناقابل التفات بنا دیں، تاکہ اہل حق پر یہ الزام عائد کیا جاسکے کہ وہ خلاف عقل اور خلاف قیاس راہوں پر چل رہے ہیں اور ان کا پورا دین معاذ اللہ غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔

فقہائے کرام کی خدمات سے جزئیات دین کا دائمی تحفظ:

لیکن انہیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ اس پورے دین فطرت میں عقل کلی بہ طور روح کے دوڑی ہوئی ہے، اور جیسے وہ بے ریب طریقے پر نقل صحیح کے ساتھ دنیا میں آیا ہے ایسے ہی عقل سلیم کی روشنی بھی ساتھ لے کر آیا ہے، اور اس میں فہم و بصیرت اور عقل و فراست کے ایسے جوہر فرد موجود رہتے آرہے ہیں جو اس دین کی معقولیت سے نمائشی عقلوں اور فرضی دینوں کی قلعی کھول سکتے ہیں۔ چناں چہ فقہی مسایل پر زد پڑتے دیکھ کر ارباب فقہ آگے بڑھے اور انہوں نے فقہی فروعات اور استنباطی مسایل میں جہاں نقول کے مآخذ پیش کیے وہیں عقلی دلایل کو بھی ان کے دوش بہ دوش لا کھڑا کر دیا۔ ''ہدایہ'' اور ''بدائع الصنائع'' جیسی لطیف کتابیں معرض وجود میں آئیں، جن میں ہر ہر فقہی مسئلے کے لیے دلائل نقلیہ کے ساتھ دلایل عقلیہ کا عظیم ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا، جس سے فقہی فروعات اور استنباطی مسایل میں بھی نصوص فقہیہ کے ساتھ عقلی براہین کی تدوین کا آغاز ہوگیا۔ ارباب دین میں علی الاطلاق نقول کے ساتھ عقلی استدلال کی راہیں ہم وار ہوگئیں، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ دین میں عقلی مصالح اور اسرار دین نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کرلی، جس سے معاندین اور فرق باطلہ کا یہ خیال کلیتاً غلط ثابت ہوگیا کہ دین عقلی مصالح سے خالی یا عقلی استدلال سے عاری ہے۔ ساتھ ہی وہ اس سے بھی

مایوس ہو گئے کہ محض اپنی عقلی وسوسہ اندازیوں سے وہ بابصیرت ایمانداروں کے ایمان پر کوئی ڈاکہ ڈال سکیں گے، جس سے وہ تردد میں پڑکر اپنے ایمانی مؤقف سے ہٹ جائیں، لیکن یہ تمام عقلی براہین ابھی تک اپنے اپنے مسائل کے ضمن میں منتشر تھے اور جس فن کا جو مسئلہ بھی مدعیانِ عقل کے یہاں ہدف بنا اسی فن میں ارباب فن نے اس مسئلے کو دلائل عقلیہ کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے مخالف اتہامات کو رد کر دیا، جس سے یہ معقول دلائل مختلف فنون میں بہ ذیل مسائل بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ مسائل کے سلسلے سے مختلف فنون میں جمع ہوتے رہے۔ خود ان کا اپنا کوئی مستقل فن نہ تھا کہ اس میں اپنے اصول وقواعد کے ساتھ مرتب طریق پر جمع ہوں اور ایک منظم فن کی صورت اختیار کر کے انضباط کے ساتھ مدافعت یا حملہ کر سکیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وسوسہ اندازوں نے بھی وسوسہ اندازی کو کسی مستقل فن کی حیثیت نہیں دی تھی، وہ صرف اپنے مزعومات کے ضمن میں اپنے مفہوم کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے اہل حق کے مفہوم کو غیر معقول ثابت کرنے ہی پر اپنی ہمت صرف کرتے رہے۔ اس لیے اہل حق بھی ان کے جواب میں انہی مسائل کی حد تک عقلی دلائل دیتے رہے، جو مختلف فنون میں بہ ذیل مسائل جمع ہوتے رہے، اور انہوں نے اسرار دین یا حکمت اسلام کو کسی مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے اسرار دین موضوع تو بن گیا مگر فن نہیں بنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ”تدوین اسرارِ دین“:

آخر کار متاخر طبقے میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کا ظہور ہوا، جبکہ یورپ اپنے الحادی ہتھکنڈوں کے ساتھ اُبھرنے کے مقام پر آ رہا تھا، ہندوستان کے لیل ونہار بدل رہے تھے، دینی لائنوں میں خود رائی اور عقل پرستی کی گھٹائیں دلوں پر چھا رہی تھیں اور وقت آ رہا تھا کہ یہ سیاہ بادل برس پڑیں اور دنیا کو سیل الحاد و دہریت میں بہا لے جائیں، تو آپ نے اپنی فراست باطنی سے ان مقدمات کو سامنے رکھ کر آخری نتیجہ سمجھ لیا اور دیکھا کہ فلسفیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔ نہ صرف یہی کہ اس ملک کی دنیا دین کی استدلالی لائنوں میں نقلی دلائل پر قناعت کرنے کیلئے تیار نہیں بلکہ اسلام پر شکوک وشبہات کا وار کرنے کیلئے یہ عقلی سفسطے

ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جن کے آثار کم و بیش نمایاں بھی ہو چکے ہیں، اس لیے انہوں نے اپنے قلب صافی کی مخفی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا:

وان الشریعة المصطفویة اشرقت فی هذا الزمان علی
ان تبرز فی قمص سابغة من البرهان (حجۃ اللہ البالغہ: ص ۳)

”اور شریعت مصطفوی اس زمانے میں اس پر ابھر رہی ہے کہ وہ (عقلی)
حجت و برہان کی مکمل اور مطابق بدن قمیصوں میں نمایاں ہو“۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ معتزلہ کا خلف رشید بن کر سامنے آ رہا ہے، جو وحی پر عقل کی حکم رانی کا قائل ہے اور نصوص شرعیہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہ ان پر ایمان لانا ہی ضروری سمجھتا ہے۔ بالخصوص دین کے ان غیبی حقائق پر جو عقول سے بالاتر اور مشاہدے سے ماورا بھی ہیں، اس لیے آپ نے اس فتنے کے دفعیے اور استیصال کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے فرمایا:

و لا سبیل الی دفع هذه المفسدة الا بان تبین المصالح و
توسس لها القواعد کما فعل نحو من ذلك فی
مخاصمات الیهود و النصاری و الدهریة و امثالهم
(حجۃ اللہ البالغہ: ص ۷)

”اور (اب) اس مفسدہ کے دفعیے کی اس کے سوا صورت نہیں کہ دین کے
(عقاید و اعمال) کی (عقلی) مصلحتیں بیان کی جائیں اور ان کے لیے (بہ
طور فن کے) قواعد وضع کیے جائیں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ، دہریہ اور ان
جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ایسا ہی کچھ کیا جا چکا ہے“۔

اس لیے آپ نے دین کے سلسلے میں عقلی دلایل و براہین کو ایک فن کی صورت سے مدوّن فرمایا، اس کے اصول و مقاصد وضع فرمائے اور اسے فن کی صورت دیتے ہوئے اس فن میں جلیل القدر کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ تصنیف فرمائی، جس میں ابواب و فصول کے تحت فن اسرار کے قواعد و ضوابط اور اصول و قوانین وضع فرما کر ہر باب میں اس کے مناسب عقلی دلایل و

براہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا۔

اس مقدس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگان عقل کی کمر توڑ دی اور ان کے لیے بندگانِ عقل بننے کے بجائے بندگان خدا بننے کا راستہ ایسے موثر انداز سے کھول دیا کہ یا وہ اس پر چلیں یا سکوت عجز کے ساتھ اپنے غم و غصے کو دبائے بیٹھے رہیں اور ختم ہو جائیں۔ آپ نے فنی طور پر ابواب دین میں عقل و نقل کا صحیح مقام واضح فرماتے ہوئے ان دونوں کی باہمی نسبت اور حقیقی توازن کی صورت واضح فرمائی۔ آپ نے عقل سے کسی عقیدے کا استفادہ کرنے کے بجائے اسے عقاید و احکام شرعیہ کے لیے موید مثبت اور دشمنانِ حق پر الزام قایم کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا، جس سے نقل کی عظمت و حکومت اور عقل کی اس کے حق میں خدمت گاری پوری طرح واشگاف ہو گئی۔ انہوں نے مدعیانِ عقل کو یہ تاثر دیا کہ جو چیز ان کے یہاں خدائی کا درجہ رکھتی ہے یعنی عقل وہ ان کے یہاں بہ حق دین محض ایک خدمت گار اور چاکر کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر اس کے تحت مسایل میں اس کے نمونے ظاہر فرمائے، جس سے بہت سی جزوی عقلوں کو ندامت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا، لیکن اس کے بعد تیرھویں صدی میں جب کہ یورپین قوتیں ہندوستان میں برسر اقتدار آگئیں اور اپنے ساتھ فلسفۂ جدیدہ اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئیں، مشینی دور کا آغاز ہوا، مشینری نے دنیا کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا، کھانا، پینا، دینا لینا، لباس اور وسایل معاش، سفر اور حضر، سواری اور مراکب، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، جنگ و صلح حتی کہ مکانوں کی ہوا اور پانی، دوا اور غذا، آوازوں کا سننا، تقریر اور خطابت، غرض ساری زندگی اور وسایل زندگی مشینی لاینوں پر رواں دواں ہونے لگی، تار اور فون پر خبریں دوڑنے لگیں، ریل، موٹر اور اسٹیمر میں بحر و بر کی مسافتیں طے ہونے لگیں، وسایل حیات فیکٹریوں اور ملوں میں ڈھلنے لگے، دور دراز کے انسان ٹیلی ویژن کے برقی پردوں پر نمایاں نظر آنے لگے، ہزار ہا میل کی مسافت کے باوجود ایک ملک دوسرے ملک کے آمنے سامنے آ کھڑا ہوا۔

خلاصہ یہ کہ بحر و بر اور خلا و فضا سب ہی مشینوں کی زد میں آ گئے، پھر ساتھ ہی سائنس نے مادے کے ہزار ہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیئے، جس سے دنیا مخفی اور پنہاں

چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی۔ بہ الفاظِ دیگر فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی، دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گزر کر محسوسات کی گرفت میں آ گئی تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

سائنس کو اسلام کے برخلاف طبعیاتی محاذ بنانے کی سعی:

اس لیے اب وہی عقل پرست طبقہ حس پرستی کا شکار ہوا اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی استدلال کی لائنوں پر آ گئی۔ اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اس وقت تک قابل سماعت نہیں رہا جب تک وہ معقولات کے ساتھ محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنابریں اسی خوگر محسوس طبقے نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیے، اس لیے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے اور طبعیاتی شکوک وشبہات کا جواب انہی طبعیاتی انکشافات کے اصول سے دیا جائے۔

سائنس کا فکری بگاڑ اور حکمت قاسمیہ کا اس سے مقابلہ:

تو اس صدی کے اوایل میں حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجے کے لیے بہ طور طبیب اور مصلح امت کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے ان بندگان سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انہی کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور ان کے دماغوں کا تنقیہ (صفائی) شروع فرمایا۔

حکمت قاسمیہ میں فطری طرزِ استدلال:

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزا نے (جو حضرت والاؒ کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقایق پر گہری الٰہیاتی اور خالص عقلی دلایل کی روشنی ڈالی وہیں وہ پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقایق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد ونظایر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی

مقاصد اور دین فطرت کے مبانی واصول اس حسیاتی رنگ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس ومشاہد نظر آنے لگے۔ ذات وصفات خداوندی، مبدأ ومعاد، توحید ورسالت، عقائد وشرائع، برزخ اور قیامت، سزاء جزاء حشر ونشر، وزن اعمال، میزان عمل، جنت ونار، ملائکہ وجنات، عرش وکرسی، لوح وقلم وغیرہ ان عقائد اور ان سے متعلقہ اعمال کا صفات خداوندی سے ربط و علاقہ، کلیات دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط پھر شرائع وعقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرز استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگ گئے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر دل میں ٹھونسنا نہیں چاہتے بلکہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد واحکام فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہیں، جن کا وجود اسی طرح قابلِ تسلیم ہے جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود۔ جس سے ایک فہیم انسان جبری انداز سے نہیں بلکہ طبعی تقاضوں سے انہیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لیے بہ طوع ورغبت جھکنے کیلئے تیار ہو جائے۔ حضرت والا رحمہ اللہ کے اس نئے طرزِ اثبات سے اس پورے دین کا محض دین عقلی ہونا ہی نہیں بلکہ دین فطرت ہونا نمایاں ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت والا رحمہ اللہ کی کتابوں میں ان کی تقریرات استدلال سے واضح ہوگا۔

ساتھ ہی حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ کا یہ علم بلاشبہ لدنی ہے، درسی یا کتابی نہیں۔ الہامی اور وجدانی ہے، جس کا بہ ظاہر دوسرے کے وجدان کیلئے حجت ہونا ضروری نہیں تھا۔ لیکن آپ کا طرز بیان خالص استدلالی اور منطقی ہوتا ہے جو مطیع ومنکر دونوں کیلئے یکساں حجت ہو۔

حقائق سب کی سب منقول لیکن پیرایۂ بیان بلا حوالہ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹیفک۔ گویا عقل وطبع دونوں کی صحیح معنی میں حضرت رحمہ اللہ نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا کان پکڑا اور دین کے جس گوشے کی چاہی ان سے خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل وطبع دونوں کا مؤقف بھی خود بہ خود کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے عمیق علم کی ایک نادر خصوصیت:

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایۂ بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور غامض ہیں، لیکن طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں بلکہ سہل ممتنع۔ مقدمات کی ترتیب طبعی کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بہ خود نکلنے کیلئے اُبھر رہے ہیں۔ تقریر استدلالی نہایت مرتب جو ذہن کو اپیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے، اور ساتھ ہی حضرت والا رحمہ اللہ کا شاخ در شاخ بیان مسئلے کے تمام شقوق و جوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجے واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیرِ بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اس کے سینکڑوں امثال جو اس کی زد میں آجائیں، خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں، اس اصولی طرز بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں، بلکہ قلوب پر کتنے ہی علوم و معارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں جن سے نئے نئے مسائل کا راستہ ہموار ہوتا جاتا ہے۔

اس صورت حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزیے کی پشت پر کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے اور کتنے کلیے اور عقلی اصول اس ایک جزیے میں اپنا عمل کر رہے ہیں، جس سے وہ عقلی ہی نہیں طبعی نظر آنے لگتا ہے

مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا ارشاد:

بہ قول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوّلین صدر مدرس دار العلوم دیوبند:

> "حضرت والاؒ کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی، اس لیے بلا اختیار ان کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آسکتی تھیں، جس سے ان کے یہاں جزوی مسایل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا، اور اس سے وہی ایک جزیہ نہیں بلکہ اس جیسے سیکڑوں جزیے حل ہو جاتے تھے، اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کھل جاتا تھا جس سے اس جزیے کا نشوونما ہوا ہے"۔

بعض ایسے جزوی مسایل جنہیں فقہائے امت خلاف قیاس امر تعبدی کہہ کر گزر گئے

ہیں، حضرت والا رحمہ اللہ کے یہاں وہ بھی قیاس جلی سے پیدا شدہ عقلیاتی ہیں۔ چونکہ آپ کے نزدیک شریعت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی سے جزوی مسئلہ بھی غیر قیاسی یا مخالف عقل تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً قہقہہ ناقض وضو ہونا تمام فقہا کے نزدیک ایک خلاف قیاس اور بہ الفاظ دیگر غیر عقلی ہے، اس لیے وہ اس کی کوئی عقلی دلیل نہ پا کر اسے تعبدی کہتے گئے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عقل کے خلاف محض ایک امر شرعی ہے، جسے صرف بہ وجہ ایمان ہی تسلیم کیا جائے گا، لیکن حضرت والا رحمہ اللہ نے اسے بھی عقلی قرار دے کر اس پر عقلی دلائل پیش فرمائے ہیں اور بتلایا ہے کہ جس کلیے سے یہ جزیہ پیدا ہوا ہے جب وہ عقلی ہے تو جزیے کے غیر منقول ہونے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ اپنے موقع پر اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

بہر حال شرعی جزئیات کو ان کے عقلی کلیات کی طرف راجع کرنا اور کلیات سے نادر جزئیات اور مقاصد دین کا استخراج کر لینا یا متعدد جزئیات کے تتبع و استقرا سے ایک کلی اصول قائم کر کے ہزاروں جزئیات کا اس سے فیصلہ کر دینا آپ کا خاص علم اور علم کا خاص امتیازی مقام ہے۔

ہر منقول جزئی کی معقول تطبیق اور اس کی مثالیں:

اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت ناک یہ ہے کہ عامتاً قیاس و استنباط کا تعلق احکام سے ہوتا ہے نہ کہ اخبار اور واقعات سے۔ عقلی طور پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم معقول ہے، لیکن عقلی استدلال سے یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعہ معقول اور عقلی ہے اور اسے عقلاً بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرت والاؒ کے یہاں شرعی واقعات بھی اصول عقلیہ سے باہر نہیں ہیں، اور آپ کا خداداد علم اور فراست اخبار اور واقعات کی عقلی لمیات میں بھی اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح وہ احکام اور اوامر و نواہی کی حقائق بیانی میں کار فرما ہے۔

ظاہر ہے کہ واقعات اور حوادث کو کسی عقلی اصول سے جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ واقعہ عقلاً بھی یوں ہی پیش آنا چاہیے تھا جس طرح کہ وہ واقعہ پیش آیا، بلا شبہ علم و فراست اور قلبی ذکاوت کی ایک نادر مثال ہے۔

دنیا میں کعبۂ معظمہ (بیت اللہ) کا وجود ان کے یہاں محض تکوینی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے، یعنی بیت اللہ عقلاً بھی اسی محل میں ہونا چاہیے تھا جس میں وہ واقع ہے، پھر بیت اللہ کا اول

بیت ہونا جو قرآنی دعویٰ ہے اُن کے یہاں محض تاریخی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے کہ اسے عقلاً بھی اول بیت ہی ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ وہ ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کے چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھے جانے کی یہ اربعینی مدت بھی عقلی ہے، اقصیٰ کی تاسیس عقلاً بھی کعبے کے چالیس ہی سال بعد ہونی چاہیے تھی۔ اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کعبۂ محترمہ اور مسجد اقصیٰ کا درمیانی فاصلہ جو تقریباً ڈھائی تین سو میل ہے یہ بھی ان کے اصول پر محض تاریخی یا جغرافائی نہیں، صرف اس لیے کہ وہ شرعی دعویٰ ہے اور ان کے اصول حکمت میں شریعت کا کوئی دعویٰ مخالف عقل و قیاس نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ''قبلہ نما'' میں اس کی تفاصیل دیکھی جاسکتی ہیں۔

قرآن حکیم کے پنہاں معقول حقایق کا حکمتِ قاسمیہ میں انکشاف:

قرآن حکیم نے کاینات کے مشاہدات زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، جمادات، نباتات اور ہواؤں کی شمالی، جنوبی رفتاروں سے بہت سے غیبی حقایق پر استدلال کیا ہے، جو بلاشبہ فطری اور طبعی طرز استدلال ہے۔ حضرتؒ نے ان مکونات کے اندرونی مکونات کی گہرائیاں طبعی انداز میں کھول کر ان استدلالات کو عقلی سے زیادہ طبعی بنا دیا ہے، اس اصول پر کہ یہ خدا کے افعال ہیں، اور اس کے افعال سے زیادہ اور کس کے افعال فطری ہوسکتے ہیں؟ آپ نے یہ دلایل واضح کیا ہے کہ قرآن کے یہ استدلالی مقدمات کن کن گہری اور فطری حقایق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں، جن سے یہ مسایل ثابت ہو رہے ہیں۔ اس لیے قرآن کے یہ سب مسایل محض عقلی ہی نہیں بلکہ سایٹفک بھی ہیں۔ مثلاً: قرآن حکیم نے عالم کے جزیاتی تغیرات سے قیامت کے ثبوت پر استدلال کیا ہے جو اس کا مخصوص شرعی انداز ہے۔ حضرتؒ نے اسے کھولتے ہوئے کہا ہے کہ جب عالم کے یہ جزیاتی تغیرات طبع اور سایٹفک ہیں جو سائنس کا دعویٰ ہے تو عالم کا کلی تغیر یعنی مجموعۂ عالم کی موت بھی طبعی ہے، جسے قیامت کہتے ہیں۔ پس قیامت کو عقلی دلایل سے الگ ثابت کیا ہے جو فلسفے کا موضوع ہے اور طبعی، اور مادی شواہد سے الگ نمایاں کر دیا ہے جو سائنس کا موضوع ہے۔

اس طرزِ استدلال سے جہاں تکوین وتشریع کے مسایل طبعی انداز میں ثابت ہوتے ہیں وہیں ان حقایق اور دقایق سے قرآن حکیم کا معجزہ ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خدا ہی کے کلام

میں ایسی گہرائیاں ہوسکتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس سے بلاشبہ مومن کا قرآن حکیم پر ایمان نہ صرف تازہ بہ تازہ بلکہ علی وجہ البصیرۃ ہو جاتا ہے، جو مقصود اصلی ہے، اور ان عقلی اور طبعی حقائق کے کھولنے سے ہی ممکن ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنی حقائق جب اس عقلی اور طبعی انداز سے سامنے آئیں اور جب کہ وہ کسی دور میں بھی خلاف واقعہ نہیں ثابت ہوں گے اور نہ ہوسکتے ہیں تو یہ محض اعجاز قرآن ہی کی بین دلیل نہ ہوگی؟ بلکہ اس پر لائے ہوئے ایمان کی مضبوطی کی بھی ایک مستقل حجت ہوگی، جو حقائق بیانی کا ایک زبردست اور عظیم مفاد ہے کہ ایمان علی وجہ البصیرۃ ہو جائے، جو حقیقتاً ایمان تحقیقی ہو جانے کی صورت ہے۔ اب اگر یہی حقائق اغیار کے سامنے آجائیں تو عقلاً کوئی وجہ نہیں رہتی کہ وہ ایمان لانے کی طرف نہ جھکیں، البتہ تعصب وعناد دوسری بات ہے جو زیر بحث نہیں ہے۔

بہر حال حکمت قاسمیہ میں بہ یک وقت عقلی اور طبعی دلایل ساتھ ساتھ چلتے ہیں تاکہ ایک طرف اگر دینی مقاصد کا اثبات فطری طور پر عقلی رنگ میں ہو تو دوسری طرف ان کا ثبوت حسی اور مشاہداتی طور پر طبعی رنگ میں بھی ہو، اور اس طرح آپ نے دین کے اثبات میں نظریاتی اور حسیاتی دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر مبائی فلسفہ اور مبادی سائنس دونوں ہی سے خدمت لی ہے، تاکہ ایک طرف تفلسف مزاج لوگوں کے شبہات اور اشکالات فلسفیانہ انداز سے حل ہوں اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے سائنسی شکوک وشبہات حسیاتی انداز سے مرتفع ہوں، کہ اس کے بغیر اس دور کے مادہ پرستوں کی اصلاح کا دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس لیے بے جھجک کہا جاتا ہے کہ اس قرن کے یہ عرفا اور حکما اور بالخصوص حضرت والاؒ اس دور کے مجدد تھے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے دایروں میں وقت کے تقاضوں کے مطا[بق] تجدید دین اور اصلاح امت کے فرایض انجام دیئے۔

منقول حقایق اور معقول دلایل کے ساتھ فصاحت بیانی:

اس پر بیان کی بلاغت وفصاحت کا یہ عالم ہے کہ آج سے سو برس پہلے کی اردو کو سا[منے] رکھ کر دیکھا جائے، حضرت والاؒ کے حکیمانہ بیانات کی اردو آج سو برس بعد کی اردو سے دو

نہیں محسوس ہوتی۔ محاورات کا فرق جداگانہ چیز ہے جو حسب تقاضائے وقت بدلتے رہتے ہیں، لیکن طرز ادا اور اسلوب بیان آج کے معیار ادب کے لحاظ سے بھی اونچے درجے کی فصاحت اور بلاغت سے گرا ہوا نہیں، جس سے آج کا ادیب بھی نہیں اُکتا سکتا۔

مضمون کی بلندی اور حقایق کی گہرائیوں کی وجہ سے اگر کسی قلیل المناسبت یا کم استعداد کو ان عالی مضامین کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو وہ بیان حکمت کا قصور نہیں ہے بلکہ ناظر و مستمع کی علمی استعداد کا قصور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلم اور غیر مسلم اُدبا اور اردو داں حضرات کے سامنے حکمت قاسمیہ کے ادیبانہ اور بلیغ بیانات نفسِ بیان وتقریر کے لحاظ سے بھی اک مثالی درجہ رکھتے تھے، جس کا اپنوں اور پرایوں بلکہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔

حکمتِ قاسمیہ کی اعجاز بیانی کا اعتراف:

چناں چہ مباحثۂ شاہ جہان پور میں جو عیسائی پادری عیسائیت کے عمومی فروغ کے منصوبے لے کر شریک مباحثہ ہوئے، یا جو ہندو اپنے مذہب کی ترویج عام کے جذبات لے کر مجلس بحث میں حاضر تھے انہیں حضرت والاؒ کے یہ اعجازی بیانات اور فلسفیانہ اور حکیمانہ تقریرات استدلال سن کر سکوتِ عجز کے ساتھ ان بیانات کی تاثیر وتصرف کا لوہا بھی ماننا پڑا۔ انقیاد و طاعت جداگانہ بات ہے جو توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔

پادری اینک نے کہا، جو مباحثۂ شاہ جہان پور میں شریک اجلاس تھے:

> ''کیا پوچھتے ہو؟ ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ وہ حق کہتے تھے (گو اس حق کا جواب دینے اور اپنا مفروضۂ حق واضح کرنے سے عاجز بھی رہے، جیسا کہ انہیں خود بھی دوسرے مواقع پر اس کا اعتراف کرنا پڑا) پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے''۔ (میلۂ خداشناسی)

اسی پادری اینگ نے مباحثے کے آغاز میں علمائے اسلام کو پہلو تہی کا طعنہ دیا تھا، لیکن حضرت والا رحمہ اللہ کی تقریریں سن کر اس طعنے کے خلاف رطب اللسان تھے۔

مولوی عبدالواہاب صاحب بریلوی رحمہ اللہ نے حضرت رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ یہ پادری (اینگ) بعد اختتام مباحثہ ملنے آیا تھا اور حضرت کی تقریروں کی تعریفیں کرتا تھا، جیسا کہ میلۂ خدا شناسی میں یہ تفصیل مرقوم ہے۔

ماسٹر جویل نے جو شاہ جہان پور کالج میں مدرس (پروفیسر) تھے، کہا:

''مسلمانوں میں ایک ہی عالم دیکھا''۔ (میلۂ خدا شناسی)

ایک اور پادری سے سید ظہور الدین صاحب شاہ جہان پوری نے پوچھا: تم اس دن (یوم مباحثہ) میں کچھ نہ بولے؟ انہوں نے کہا کہ

''ہم کیا کہتے؟ مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) نے کوئی بات چھوڑ دی تھی جو ہم بولتے؟ ہمارے پادری نولس (جو یوم مباحثہ میں پادریوں کے سربراہ اور قاید تھے) ہی کو جواب نہ آیا''۔ (میلۂ خدا شناسی)

جانکی داس جوگی (جو اس مباحثے میں شریک جلسہ تھا) نے خود حضرت والاؒ سے کہا:

''جب تم نے بولی ماری (تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا (پادری نولس) کا اتنا سر یہ سوکھ گیا تھا (یعنی روح ہوا ہو گئی تھی)''۔ (میلۂ خدا شناسی)

اسی طرح دوسرے ہندوؤں کے مقولے بھی اس کتاب میں اسی قسم کے نقل کیے گئے ہیں، کہا گیا کہ

''جب میلہ برخاست ہونے لگا اور سب اہل اسلام وہاں سے روانہ ہوئے، میلے کے ہندوؤں وغیرہ (ان) مناظرانِ اسلام (میں سے حضرت والاؒ) کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں یعنی (حضرت والاؒ)، جنہوں نے پادریوں کو عاجز کیا اور شکست دی''۔ (میلۂ خدا شناسی)

جانکی داس جوگی نے کہا:

''سچ ہے مولبی (یعنی یہی حضرت والاؒ)، جنہوں نے آج سب سے اپنا لوہا

منوالیا"۔(میلۂ خداشناسی)

ختم مباحثہ پر حضرت والاؒ نولس کے خیمے میں خود ملنے تشریف لے گئے اور نصائح فرمائیں۔فرمایا کہ دینِ عیسوی سے توبہ کیجیے اور دینِ محمدی اختیار کیجیے۔دنیا چندروزہ ہے،عذاب آخرت بہت سخت ہے۔پادری صاحب نے کہا:بے شک!اور چپ ہورہے،اور آخر میں پادری نولس نے کہا کہ

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا"۔(میلۂ خداشناسی)

بہر حال حضرت والاؒ کی صداقت کمال لیاقت اور بیان کی بلاغت غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔حکیمانہ دلایل اور فلسفیانہ براہین جداگانہ چیز ہے۔یہی تقریر و بیان کے تاثرات تھے کہ اگر یہ سننے والے غیر مسلم اگر اسلام نہیں بھی قبول کرتے تھے تو معترف ضرور ہو جاتے تھے اور اس طرح ان پر خدا کی حجت قایم ہو جاتی تھی۔

حکمتِ قاسمیہ اور دورِ حاضر کے ہمہ گیر اعتقادی فتنوں کا سدباب:

یہ تو اغیار کا قصہ ہے جو عرض کیا گیا،لیکن خود مسلمان کہلانے والے ایسے فضلا بھی جن کی آنکھوں کو فلسفۂ جدید اور سائنس نے خیرہ کر دیا تھا وہ بھی جب یہ بیانات سنتے تھے یا آج علمائے دیوبند سے ان کی ترجمانی کو سنتے ہیں تو وہ نہ صرف مرعوب ہی ہوتے ہیں بلکہ ان کے خیالات کی دنیا میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ان دلایل قاہرہ کے بعد عقاید و افکار دین کے بارے میں آخر وہ کس طرح اپنے اس طبعیاتی یا سائنسی موقف کو قایم رکھیں اور کیوں کر نہ اعتراف حق کریں؟

اس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ اس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجویٹوں سے خطاب ہوا اور مناسبِ موقع حضرت والاؒ کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی تو بارہا یہی اعتراف و اقرار کا منظر دیکھنے میں آیا۔اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار و الحاد اور دہریت و زندقہ کا قرار واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے تو اسی حکمت قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے،جو آج کی فلسفے و سائنس کے مسلمات اور نئے نئے

انکشافات ہی کے اصول سامنے لاکر اسلام کی صداقت کا لوہا منوا سکتی ہے اور جس میں حقیقی طور پر اتمامِ حجت کی شان موجود ہے۔

یہ حکمت گو اپنی معقولیت اور شیوہ بیانی کے لحاظ سے واضح سلیس اور دلوں میں اُتر جانے والی حقیقت ہے، اور اس کی تاثیرات و تصرفات گو آفتاب سے زیادہ روشن اور اغیار اور اغیار نما اپنوں تک پر اثر انداز ثابت ہوئی، لیکن پھر بھی مضامین کی دقت اور مستفیدین کی استعدادوں کی قلت بالخصوص جب کہ بے توجہی سے اس کی اغلاط آمیز طباعت نے اس کی دقت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہو، کچھ علمی حلقے اس سے دہشت زدہ نظر آتے ہیں، بلکہ ان بلند پایہ اور گہری حقائق کی نسبت سے بعض قلیل المناسبت علماء بھی اس سے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے، لیکن حکمت بہرحال حکمت ہے اور مسائل کی نسبت سے گو دلائل مشکل بھی ہوتے ہیں، بالخصوص جب کہ وہ فلسفیانہ اور گہرے حقائق پر مشتمل ہوں، لیکن سطح پسند لوگوں کی وحشت سے اہلِ فہم نہ کبھی متاثر ہوئے نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کی طلب حکمت کی دوڑ کسی دور میں بھی ختم ہوگئی۔ کلام کی دقت یا رفعتِ مقام کا تقاضہ اسے حل کرنا ہے نہ کہ اس سے بھاگنا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس وقت کے باوجود اس سے کامیاب ہونے والے کامیاب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔

حکمتِ قاسمیہ کے مستند ترجمان:

جماعت دار العلوم اور علما میں ہزاروں ہزار نکلیں گے جنہوں نے اس حکمت سے سبق لیا، لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی ان میں پہلے ملنے میں حضرت اقدس مرشدی و مرشدِ عالم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے درسِ حدیث کا طغرائے امتیاز ہی یہ علوم قاسمیہ تھے۔ آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اس کے اوّلین ترجمان تھے۔ انہیں ان علوم و معارف کے لحاظ سے ''قاسم ثانی'' کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے۔ حسب روایت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ نے حضرت والاؒ کی بعض ادق کتابیں جیسے ''آبِ حیات'' وغیرہ حضرت والاؒ سے درساً پڑھی تھیں، اس لیے ان ابحاثِ قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرما سکتے تھے وہ اوروں سے ممکن نہ تھی۔

دوسرے ترجمان حکمت اس طبقے کے ایک فرد کامل حضرت اقدس مولانا سید احمد حسن امروہی رحمہ اللہ تھے، جن کی درسی اور غیر درسی تقریریں اسی حکمت سے مملو ہوتی تھیں۔ پھر اسی طبقے میں تیسرے ترجمان میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنہیں اس حکمت کے مضامین پر اس درجے عبور حاصل تھا کہ وہ حضرت والا رحمہ اللہ کی کتب کے صفحے اور سطر تک کے حوالے سے یہ مضامین ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جلالین شریف ،مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف میں جو آخر میں ان کے درس کی خاص کتابیں تھیں، اکثر و بیشتر موقع بہ موقع ان علوم کی ترجمانی فرماتے رہتے تھے۔ راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمتِ قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انہیں کے درس کا طفیل ہے، جب کہ مشکوٰۃ و مسلم احقر نے انہی سے پڑھی ہیں، اور ان میں حضرت مرحوم آیات واحادیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزا سے کام لیتے تھے، جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا تھا۔

ان کے بعد دوسرے طبقے میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے ترجمان تھے، جنہیں اس حکمت پر پورا عبور حاصل تھا اور انہوں نے یہ علم اوّل کے دو بزرگوں کے درس سے حاصل کر کے اپنے دل کی گہرائیوں تک پہنچایا اور پھر تصانیف قاسمیہ کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ ان کا مقولہ تھا، جس کے سننے والوں میں یہ حقیر راقم الحروف بھی شامل ہے کہ اگر میری نظر ان کتابوں پر نہ ہوتی تو نہ معلوم میں اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا؟ حضرت ممدوحؒ کے درس حدیث وتفسیر کا طغرائے امتیاز یہی علوم قاسمیہ تھے، جنہیں وہ احادیث کے سلسلے سے درسی تقریروں، نیز اپنے مواعظ وخطبات میں بیان فرمایا کرتے تھے، اور یہی ان کی تقریروں میں جاذبیت کا ایک بنیادی سبب تھا۔ آپ نے اپنی شرح مسلم ''فتح الملہم'' میں بالخصوص کتاب الایمان میں اپنی تقریرات استدلال کو انہی علوم سے آراستہ کیا اور ان علوم کو خاص طور پر اس کتاب میں سمویا ہے اور جگہ جگہ حضرت والاؒ کے حوالے دیئے ہیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ قدس سرہٗ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند بھی اس حکمت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان حقایق کی ترجمانی شروع فرمائی، حتیٰ کہ آپ نے طلبا کی ایک مخصوص جماعت کو خارج اوقات میں ''شفا'' شروع کرائی، جس میں یہ ناکارہ

بھی شامل تھا۔اس میں جگہ جگہ کلامی مسائل کے ضمن میں حضرت والا رحمہ اللہ کی تقریریں نقل فرماتے تھے اور انہی کے اصول سے فلاسفہ کا رد بھی کرتے جاتے تھے۔اسی دوران میں حضرت ممدوح رحمہ اللہ نے ایک کلامی قصیدہ بہ نام "ضرب الخاتم فی حدوث العالم" بھی موزوں فرمایا، جس کے حاشیے میں جابہ جا حضرت والا رحمہ اللہ کے حوالوں سے حضرت کے یہ کلامی علوم نقل فرمائے ہیں۔

حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمیہ پر مولانا سندھی رحمہ اللہ کا التفات:

اس طبقہ ثانی میں خصوصیت سے حضرت علامہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمی ہی کو اپنا موضوع زندگی ٹھہرالیا تھا۔ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کا کما حقہ فہم اور شعور تصانیف قاسمیہ کے مطالعے کے بغیر میسر ہی نہیں آ سکتا، اور اسی بنا پر انہوں نے لاہور میں "محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی، جس کے ذریعے انہوں نے ان علوم کی اشاعت وترویج میں پوری ہمت صرف فرمادی۔مولانا ممدوح نے احقر کی عرض داشت پر دار العلوم میں اس ناکارہ کو "حجۃ اللہ البالغہ" بھی پڑھانی شروع کی، اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمت قاسمیہ اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقایق تشریح کے ساتھ نقل فرمائے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دار العلوم میں پہنچ کر اپنے اوایل ایام میں حضرت والاؒ کی تصانیف میں سے "تقریر دل پذیر" کا درس شروع کرایا تھا، لیکن سیاسی مشاغل کے غلبے کے سبب وہ نبھ نہیں سکا اور چند ہی اسباق کے بعد ختم ہوگیا۔

آج دار العلوم کے قدیم اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ العالی اس حکمت کے امین ہیں، جو حکمت قاسمیہ پر کافی نظر رکھتے ہیں اور درس حدیث میں موقع بہ موقع ان کو طلبا کے ذہنوں تک پہنچاتے رہتے ہیں، جس سے دار العلوم کے علمی حلقے میں اک حد تک یہ ذوق موجود ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حکمت قاسمیہ کتنی ہی دقیق سہی، مگر آج کے دور الحاد کے گہرے شبہات کا علمی حل بھی اس کے سوا دوسرا نہیں، اس لیے اس کے دقیق ہونے کا ثمرہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان جواہر ریزوں سے روگردانی یا بے توجہی برتی جائے، ورنہ یہ ذکر کردہ طبقہ جو اس حکمت کا حامل تھا

پیدا ہی نہ ہوتا، بلکہ یہ ہے کہ ان غامض اور نادر علوم سے آج کے دور کی سطحیت اور سطح پسندی کا علاج کیا جائے، جس کی وجہ سے ذہن اس غامض حکمت سے بعید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

حکمت قاسمیہ پر تسہیلی انداز سے خدمت کی ضرورت:

آج اس کی ضرورت ہے کہ اس حکمت کو نہ صرف یہ کہ اچھے اسلوب سے مرتب اور منضبط کر کے محفوظ ہی کر دیا جائے بلکہ ضروری حد تک تشریح و توضیح اور امکانی حد تک تسہیل و تیسیر سے اسے دنیا کے ذہنوں سے قریب کرنے کی بھی سعی کی جائے، تا کہ یہ دقت و غموض وغیرہ کے عذرات باردہ لوگوں کے لیے اس سے ترک استفادہ کا حیلہ نہ بن سکیں، پھر بھی اگر کوئی اس نظری قرابادین سے اپنا یا دوسروں کا علاج نہ چاہے تو یہ اس کی قسمت کی بات ہوگی، قاسمی حکمت کی بات نہ ہوگی۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآن عظیم) دارالعلوم دیوبند نے بہ نام خدا اس حکمت کو اعلیٰ کتابت و طباعت، خوش اسلوب تسہیل اور عمدہ ترتیب کے ساتھ علمی حلقوں کے سامنے پیش کرنے کا عزم باندھا اور علمی قدم اٹھایا ہے۔ اس کا عزم اور منصوبہ ہے کہ نوادر اسرار قرآنی پر مشتمل حکمت قاسمیہ اور حضرت والاؒ کی تصانیف کو ایک خاص ترتیب و تشکیل سے ایک ہی سائز پر سلسلے کے ساتھ پیش کیا جائے، اور ساتھ ہی حضرت والاؒ کی تصانیف کے اصل متن کو بحالہ قائم رکھ کر درمیان میں تشریحی نوٹ کے ذریعے اجمالات کی تفصیل اور اصطلاحی الفاظ کی توضیح کی جائے۔ نیز ہر کتاب کے دقیق مضامین میں حضرتؒ کے بیان سے پہلے اولاً انہیں سہل تعبیر میں سمجھا دیا جائے، جس میں اصطلاحی الفاظ نہ ہوں، اور پھر حضرت والاؒ کے کتابی متن کی اصل عبارت لکھی جائے، تا کہ ایک ناظر کتاب نفس مسئلہ اور مدعا کو پہلے سے سمجھ کر جب حضرت والاؒ کا بیان اور اس کے دلایل و براہین پڑھے گا تو نہ صرف یہ کہ پہلے سے حل شدہ مضمون حضرت والاؒ کی عبارت سے بھی اس کے ذہن میں آ جائے گا بلکہ حضرتؒ کی بلیغ اور جامع تعبیرات سے اس کی حقایق فہمی کا لطف بھی دوبالا ہو جائے گا، اور وہ ان حقایق و معارف تک پہنچ سکے گا جہاں حضرت والاؒ اسے پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تجزیۂ مضامین کے نقطۂ نظر سے ہر مضمون پر جامع عنوانات قایم کیے جانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، تا کہ بلند

مضامین کے الگ الگ ٹکڑے متمیز ہو کر بہ تدریج ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں اور پھر ان عنوانوں سے کتاب کی فہرست بھی سہولت کے ساتھ بنائی جا سکے، جو کتاب کے مضامین کا آئینہ ہو۔

مولانا اشتیاق احمد صاحب اور خدمت حکمت قاسمیہ:

اس عظیم و جلیل مہم کے لیے ''مجلس معارف القرآن'' کی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب دام مجدہ استاذ دار العلوم پر پڑی، جو دار العلوم کے قدیم فضلا میں سے ہیں، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ہیں، ذی استعداد عالم اور اک صاحب ذوق علمی مفکر ہیں۔

حضرت شمس الاسلام نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ چناں چہ حضرت والاؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''مصابیح التراویح'' پر جامع عنوانات لگا کر اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں، جو دار العلوم کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔

نیز آپ ہی نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی تصنیف لطیف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کے ترجمے کی تکمیل فرمائی ہے، جسے حضرت اقدس مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے شروع فرمایا تھا، مگر ایک ہی جلد کا ترجمہ ہونے پایا تھا کہ وفات ہو گئی۔ مولانا موصوف نے اس کی تکمیل فرمائی، جس کی تین ضخیم جلدیں تکمیل ہو کر ایک جزو شایع بھی ہو چکا ہے اور دوسرا زیر کتابت ہے (۱)۔

نیز اور بھی بعض تاریخی اور ادبی کتب کے آپ مترجم ہیں۔ اس طرح حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمیہ دونوں سے آپ کی نگاہیں آشنا ہیں۔ ساتھ ہی آپ سلسلۂ نقش بندیہ کے مجاز طریقت اور صاحب سلسلہ بزرگ بھی ہیں، اور علم کے ساتھ باطنی اور عرفانی ذوق بھی بہم ہے، جو ان ہی صفات و حسنات کے پیش نظر حکمتِ قاسمیہ کی خدمت کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جو الحمد للہ صحیح ثابت ہوا، اور آپ نے اس چھ سات ماہ کی مختصری مدت میں حضرت شمس الاسلام ہی کی تین کتابیں ''حجۃ الاسلام''، ''جواب ترکی بہ ترکی'' اور ''انتصار الاسلام'' بہ طرز مذکور مکمل فرمائیں، جو پریس کو جا چکی ہیں اور عن قریب ہدیۂ ناظرین ہونے والی ہیں، اور چوتھی کتاب کا آغاز فرما رہے ہیں۔

---

(۱) بعد میں مکمل بھی شایع ہو گیا۔ پاکستان میں دست یاب ہے۔ (نعمان)

ان کتابوں میں مولانا موصوف کے قلم سے جو خدمت انجام پائی ہے اس میں اہم چیز یہ ہے کہ آپ نے ان تینوں کتابوں کا تاریخی پس منظر، ان کی تصنیف کے وجود واسباب اور وقت کے متقضیات، ان میں باہمی تقدم تاخر کی نوعیت اور ان کے اجزائے مسایل کی ترتیب سے متعلق قابل قدر تاریخی معلومات بھی فراہم فرما کر ان کتابوں کے مقدمہ وتمہید میں درج کردی ہیں، جس سے ان کتابوں کے علوم کی عظمت کے ساتھ اس دور کے تاریخی ماحول پر خاصی روشنی پڑجاتی ہے، جس سے ان کتابوں کی افادیت دوبالا ہوگئی ہے۔ سابق میں ''حجۃ الاسلام'' کے مضمون کے دو ٹکڑے الگ الگ اور بے ربط وترتیب شایع شدہ تھے، آپ نے انہیں یک جا کر کے ''حجۃ الاسلام'' کو مکمل فرمادیا ہے، اس لیے ٹائیٹل پر بھی اس کا عنوان ''حجۃ الاسلام مکمل'' ہی رکھا گیا ہے، دوسرا نمبر ترتیب مضامین کے لحاظ سے ''براہین قاسمیہ'' کا رکھا گیا ہے، جس کی وجہ ممدوح نے مقدمے میں ہی ظاہر فرمائی ہے، اور تیسرا نمبر اسی علمی ترتیب پر ''انتصار الاسلام'' کا ہے، بقیہ سلسلوں میں بھی اسی طرح علمی ترتیب ان شاء اللہ ملحوظ رہے گی۔

علوم قاسمیہ کی دیگر زبانوں میں ترجمانی:

اسی کے ساتھ حکمت قاسمیہ کی اس علمی اور تاریخی اہمیت نے کہ وہ روایت ودرایت کے ایک جامع مکتب فکر کی اساس ہے، عالم اسلام کے غیر اردو داں علمی طبقات کو بھی غیر معمولی طور پر اس کا مشتاق بنادیا ہے، جس کا دار العلوم میں تشریف لانے والے ممتاز علمائے عرب وعجم نے اظہار فرمایا۔ ''مجلس معارف القرآن'' نے علمائے ملت کی اس آرزو کا کما حقہ احترام کرتے ہوئے حکمت قاسمیہ کے ان بیش قیمت شہ پاروں کو عربی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کرنے کو مقصدی درجہ دیا ہے، جس کا آغاز حضرت اقدس نانوتویؒ کی بیش قرار قرآنی تحقیق ''تفسیر المعوذتین'' (عربی) سے کیا جاچکا ہے، جو ٹایپ کے حروف میں نہایت مزین انداز سے شایع ہوچکی ہے، اور دیگر کتب کی تعریب بھی پروگرام میں شامل کرلی گئی ہے۔

ضرورت ہے کہ ارباب علم وفضل اور بالخصوص فرزندان دار العلوم دیوبندان جواہر ریزوں سے خود بھی فایدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ان نادر علوم کی اشاعت کریں کہ اس دور کے فلسفیانہ الحاد کا زہر اسی تریاق سے دفع ہوسکتا ہے۔

اس لیے ان علوم کی اشاعت نہ صرف ان کے لیے نافع ہی ہے بلکہ بہ تقاضائے وقت ان کا فریضہ بھی ہے، کیوں کہ دار العلوم دیوبند محض ایک درس گاہ ہی نہیں بلکہ ایک مستقل مکتب فکر بھی ہے، اور وہ فکر یہی ہے جو ان سفینوں اور ساتھ ہی مستفیض سینوں میں متوارث طریق پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دیوبندی طرزِ فکر کے دو امام:

اس طرز فکر کے حقیقتاً دو امام ہیں۔ ایک ابتدائی اور ایک انتہائی۔ ابتدائی سرے پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور انتہائی سرے پر حضرت شمس الاسلام نانوتویؒ ہیں، جنہوں نے اس دور کے الحاد اور اسلامی سینوں کی سرد مہری کے دفعیے کا مکمل سامان بہم پہنچادیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ولی اللہی حکمت میں جو امور کشف و وجدان کے انداز سے ظاہر فرمائے گئے ہیں وہی اُمور حکمت قاسمیہ میں بہ رنگ استدلال و برہان پیش کیے گئے ہیں، جو اغیار پر بھی حجت بن سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ولی اللہی فکر نے نظری طور پر تجدید دین کے اسلحے کا میگزین تیار کیا اور قاسمی فکر نے برہانی اور مشاہداتی طور پر اسے ترتیب دے کر مجاہدانہ اسپرٹ سے لشکر سازی کی۔ اگر ان دونوں نقاط فکر کے یہ اسلحے سینوں میں سجا کر دل والے میدان میں آتے رہیں گے تو بہ قول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ: اس صدی کا فلسفہ کتنے ہی روپ بدل بدل کر میدان میں آئے، یہ قاسمی فکر فوراً ہی اس کا انداز قد پہچان کر دم کے دم میں اس کی قلعی کھول دے گا اور فلسفے کی ساری ملمع سازیاں کافور ہوتی رہیں گی:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم

محمد طیب غفرلہٗ

صدر مجلس معارف القرآن

مہتمم دار العلوم دیوبند

۲۸ رمحرم الحرام ۱۳۸۷ھ

۸ رمئی ۱۹۶۷ء

الإمام محمد قاسم النانوتوي رحمه الله وأسانيده السماعية في الحديث

بقلم : شمس الدين الصديقي

الحمد لله وكفى، والصلاة والسلام على عباده الذين اصطفى، لا سيما النبي المصطفى، وعلى آله وصحبه الذين بهم زهق الباطل واختفى، ومن تبعهم بإحسان وآثارهم اقتفى.

أما بعد: فلطالما كنت أكثر من مطالعة تراجم علماء ديوبند وأعتني بأسانيدهم. ولم يكن يدور في خلدي أن أكتب مقالة حول أسانيدهم.. لكني لقلة ما لدي من الكتب والمراجع الأساسية كنت أتعب في التنقيب عن خبايا زوايا تراجمهم وأسانيدهم. ولا زالت كتب مشايخ ديوبند تظهر في عالم المطبوعات حول سيرة الإمام الهمام.. حجة الإسلام، العلامة الألمعي- مولانا محمد قاسم بن أسد علي، النانوتوي ثم الديوبندي.. وكتبت حولها رسائل ومقالات.. وألفت صفحات.. ما بين كتيب صغير إلى كتب ذات مجلدات.

بيد أنهم أغفلوا تفاصيل أسانيده السماعية وشيوخه الحديثية، فتراهم يقتصرون عند ذكر مشايخه في الحديث على الشاه عبد الغني المجددي والشيخ أحمد علي السهارنفوري، ومنهم من اقتصر على الأول دون الثاني، فلا يخفى ذلك من تفصيل للسماعات.

وقد يخطر على بال أحدنا.. لماذا أغفلوا أسانيده السماعية؟ فالجواب من وجوه:

الأول: أنه درس أكثر الكتب الحديثية لدى أستاذ واحد، فالتفصيل في ذلك إطناب بلا ضرورة.

الثاني: استفاضة دراسته الكتب الحديثية بين الناس تغني عن ذكره.

الثالث: التنصيص على أمر بديهي[1] يحط من شأن الكاتب.

الرابع: تقديم سند الإجازة على سند القراءة والسماع للاحتياط في ذلك[2].

الخامس: وهو أهمه: ما قاله الشيخ أشرف عليه التهانوي[3]:

اعلم أن هذه الأسانيد المتصلة من أساتذتنا إلى جامعي هذه الكتب ليس بشرط لإثبات أحاديثه؛ فإن نسبتها إلى أصحابه ثابت بالاستفاضة والتواتر، وأسانيدهم إلى رواة هذه الأحاديث الشريفة مذكورة في تصانيفهم، وذلك كاف في ثبوت تلك الأحاديث.انتهى كلامه. فذلك الذي حملهم على ألا يتعمقوا في تفصيل أسانيدهم.

وأنا أعتقد أن الأسانيد من خصائص أمة محمد ﷺ وأستدل لذلك أولا: بما قال الإمام محمد بن أحمد الأصفهاني: «بلغني أن الله خص هذه الأمة بثلاثة أشياء، لم يعطها من قبلها الإسناد والأنساب والإعراب»[4]. وثانيا: بما قال الإمام محمد بن حاتم بن المظفر: «إن الله أكرم هذه الأمة وشرفها وفضلها بالإسناد. وليس لأحد من الأمم كلها، قديمهم وحديثهم إسناد»انتهى.

ألا، وإن عدم خوض أقران الإمام النانوتوي في أسانيده حمل بعض الناس على الطعن في سماعاته وإنكار أمر بديهي لدى أهله، وإنه لهو الجذر الأساسي للفكرة الديوبندية التي هي نموذج صالح للاعتدال والطريق الوسط بين الإفراط والتفريط، والحق الذي كان ينبغي أن يعتني أهله بأسانيده عناية تامة فقد كان له سماع للكتب الستة وموطأ مالك بروايتي يحيى بن يحيى الليثي ومحمد بن الحسن الشيباني، وشمائل الترمذي، وذاك الذي حملني على الكتابة في هذا الموضوع.

وها أنا شمرت عن ساعدي الجد في ذلك، لعل الله ينفع به قارئا فيدعو لي ويكون لي ذخرا في ميزان حسناتي يوم القيامة، وإن العلم الذي ينتفع به مما لا ينقطع أجره بعد موت صاحبه.

وكنت أقرأ "ثبت الكويت" الذي جمعه محمد زياد تكلة، فلفتت نظري عبارة في حاشيتها، وهي قوله: "والتنبيه: فقد رأيتهم يروون البخاري من طريق محمود حسن [الديوبندي] عن شيخيه: محمد قاسم النانوتوي ورشيد الكنكوهي، كلاهما عن الشاه عبد الغني الدهلوي، عن الشاه محمد إسحاق. وعلى نزوله فـ[ثبوت] في جلاء اتصاله سماعا محل بحث عندي. لأن أخذ محمود حسن عن النانوتوي: مجمل بالقراءة والسماع والإجازة، ولم أقف- في ضوء مراجعي- على تفصيل في المسموعات بينهما.

وأما رواية محمود حسن عن الكنكوهي فهي بالإجازة كما في الازدياد السني، وقرأ الكنكوهي ثلث البخاري فقط على عبد الغني، وجميع أبي داود وباقي الكتب يرويها بالإجازة؛ كما في إجازته من عبد الغني المذكورة في مقدمة لامع الدراري(1/ 218)، وقرأ النانوتوي شيئا من الصحاح على الشاه محمد إسحاق (كما هي عبارة المصدر السابق)، وظاهرها قراءة الأطراف، وذكر هناك أن النانوتوي أيضا قرأ الستة على مملوك العلي النانوتوي، وهو على رشيد الدين الكشميري، وهو على عبد العزيز الدهلوي، وظاهر العبارة السماع في كل الطبقات".اهـ

وفيه نظر؛ كما سيأتي، وقوله: "وقرأ النانوتوي..." ليس هو الشيخ محمد قاسم النانوتوي بل هو الشيخ محمد مظهر النانوتوي شيخ العلامة خليل أحمد الأنصاري رحمه الله، وقد التبس عليه بكونه نانوتويا. ولم يقرأ الشيخ محمد قاسم النانوتوي شيئا على الشاه محمد إسحاق الدهلوي، نعم، قد صرحوا بأن الشيخ محمد قاسم النانوتوي قرأ على الشيخ مملوك العلي جميع الكتب المتداولة غير الحديث.

فأرجو أن يوفقني الله للقيام بجلاء اتصال سماعات مشايخ ديوبند، ولا سيما العلامة الفهامة الدراكة حجة الإسلام العلامة الهمام مولانا محمد قاسم النانوتوي - رحمه الله- وليس مقصودي استيعاب ترجمته من جميع النواحي؛ فقد خدم هذا الميدان؛ بل المقصود من مقالتي هذه استيعاب أسانيده السماعية من شيوخه الحديثية، ولكن قد يكون بعض الأمور بديهيا لبعض ونظريا لآخرين، فأذكر ترجمته مختصرة من نزهة الخواطر[5]، ثم أثني بذكر شيوخه وما درسه على كل واحد منهم، وبالله التوفيق.

ترجمة الإمام محمد قاسم النانوتوي

هو الشيخ الإمام العالم الكبير محمد قاسم بن أسد علي بن غلام شاه بن محمد بخش الصديقي النانوتوي، أحد العلماء الربانيين، ولد بنانوته سنة ثمان وأربعين ومائتين وألف [1248هـ]، ودخل سهارنبور في صغر سنه، وقرأ المختصرات على الشيخ محمد نواز السهارنبوري.

ثم سافر إلى دهلي، واشتغل على الشيخ مملوك العلي النانوتوي، وقرأ عليه سائر الكتب الدرسية، ثم أخذ الحديث عن الشيخ عبد الغني بن أبي سعيد الدهلوي، ولازمه مدة، وأخذ الطريقة عن الشيخ إمداد الله العمري التهانوي وصحبه واستفاض منه فيوضا كثيرة.

واشتغل في المطبعة الأحمدية بدهلي للشيخ أحمد علي بن لطف الله السهارنبوري، وكان الشيخ في ذلك الزمان مجتهداً في تصحيح صحيح البخاري وتحشيته، ففوّض إليه خمسة أجزاء من آخر ذلك الكتاب، وكانت تلك الأجزاء عسيرة سيما في مقامات أورد فيها البخاري على أبي حنيفة، فبذل جهده في تصحيح الكتاب وتحشيته، وبالغ في تأييد المذهب حتى استوفى حقه.

وكان أزهد الناس وأعبدهم، وأكثرهم ذكراً ومراقبة، وأبعدهم عن زيّ العلماء ولبس المتفقهة: من العمامة والطيلسان وغيرهما، وكان في ذلك الزمان لا يفتي ولا يذكر بل يشتغل في ذكر الله سبحانه ومراقبته، حتى فتحت عليه أبواب الحقائق والمعارف، فاستخلفه الشيخ إمداد الله المذكور ومدحه بأن مثل القاسم لا يوجد إلا في العصر السالف. ثم تزوج بأمره الشريف وصعد المنبر بتكليف الشيخ مظفر [حسين] بن محمود الكاندهلوي فذكّر أحسن تذكير.

ولما ثارت الفتنة العظيمة بالهند سنة ثلاث وسبعين [1273هـ/1857م] اتهموه بالبغي والخروج على الحكومة الإنكليزية، فاختفى عن الناس برهة من الزمان ثم ظهر فأنجاه الله سبحانه، وبرّأه مما قالوا، فسافر إلى الحجاز، ومعه [الشيخ محمد] يعقوب بن مملوك العلي النانوتوي، وجمع من رهطه سنة سبع وسبعين، فحج وزار وحفظ القرآن في ذلك السفر.

وعاد إلى الهند وأقام ببلدة "ميرته" برهة من الدهر، وكان يسترزق بتصحيح الكتب في المطبعة المجتبائية لممتاز علي خان، وكان ببلدة "ميرته"، إذ أسس الشيخ الحاج عابد حسين الديوبندي[6] المدرسة الإسلامية بديوبند فاستحسنها وصار من أعضاء المدرسة وأيّدها حقّ التأييد، ثم سافر إلى الحرمين الشريفين سنة خمس وثمانين [1258هـ] فحج وزار ورجع إلى الهند وسكن بميرته.

وله مشاهد عظيمة في المباحثة بالنصارى والآرية، أشهرها المباحث التي وقعت ببلدة شاهجهانبور سنة ثلاث وتسعين وأربع وتسعين فناظر أحبار النصارى وعلماء [أي رهبان] الهنادك غير مرة، فغلبهم وأقام الحجة وظهر فضله في المناظرة، فصّلها الشيخ فخر الحسن الكنكوهي في كتابه "انتصار الإسلام" وفي "گفتگوئے مذہبی" وفي "مباحثة شاهجهانبور" وغيرها من الرسائل.

ومن مصنفاته: رسالة عجيبة في الهندية [أي الأردية] سماها "قبله نما" وله "تقرير دلپذير" و"آب حيات" و"حجة الإسلام" و"الدليل المحكم" و"هدية الشيعة" و"تحذير الناس" و"الحق الصريح في بيان التراويح" و"تصفية العقائد" و"اللطائف القاسمية" و"التحفة اللحمية" و"قاسم العلوم".

مات يوم الخميس لأربع خلون من جمادى الأولى سنة سبع وتسعين ومائتين وألف بديوبند كما في رسالة الشيخ [محمد] يعقوب بن مملوك العليّ النانوتوي. انتهى كلامه.

وبما أنه ليس المقصود من مقالتي ذكر الإفاضة في ترجمته بل في شيوخه الحديثية وأسانيدهم السماعية. فأقول وبالله التوفيق.

شيوخه في الحديث الشريف

1- الشاه عبد الغني المجددي.

هو الشاه عبد الغني بن أبي سعيد بن صفي القدر الفاروقي المجددي الدهلوي من ذرية المجدد الألف الثاني الشيخ أحمد السرهندي. قال الشيخ عبد الحي الحسني: ولد في شهر شعبان سنة خمس وثلاثين ومائتين وألف بمدينة دهلي، وحفظ القرآن، وقرأ النحو والعربية على مولانا حبيب الله الدهلوي ثم أقبل على الفقه والحديث إقبالاً كلياً.

وسمع الحديث عن الشيخ إسحاق بن أفضل الدهلوي سبط الشيخ عبد العزيز وقرأ على والده كتاب الموطأ لمحمد بن الحسن الشيباني وقرأ مشكاة المصابيح على مخصوص الله بن رفيع الدين الدهلوي، وأخذ الطريقة عن أبيه، وسافر معه إلى الحرمين الشريفين سنة تسع وأربعين، فحج وزار، وأسند الحديث عن الشيخ محمد عابد السندي وأبي زاهد إسماعيل بن إدريس الرومي، ثم رجع إلى الهند، واشتغل بالحديث، وأخذ عنه خلق كثير من العلماء[7].اهـ

وقال الشيخ عاشق إلهي الميرتهي: قرأ الشاه عبد الغني موطأ مالك ومسلماً وأبا داود والترمذي والنسائي وابن ماجه بالاستيعاب على والده[8]، بل والبخاري على والده أيضاً.اهـ

قوله: "وسمع الحديث عن الشيخ إسحاق..". قال في إجازته للشيخ محمد قاسم النانوتوي: وسمعت على الناسك المهاجر الشيخ محمد إسحاق رحمه الله تعالى البخاري والترمذي وغيرهما.

وقوله: وغيرهما: الظاهر أن المراد به الكتب الستة كاملاً، لأنه أملى على الشيخ محمد قاسم النانوتوي وغيره عند دراستهم عليه أسانيد الكتب الستة عن طريق الشاه إسحاق[9]، فهو إذن قرأ كتب الحديث كلها أولاً على والده الشيخ أبي سعيد المجددي الدهلوي؛ ثم أعاد قراءة الكتب الستة على الشاه إسحاق وسببه أن والده من تلاميذ الشاه إسحاق كذلك، وقد قرأ عليه الكتب الستة بأكملها كما يدل عليه سند الشيخ المفتي محمد شفيع لابن باز رحمهما الله. [10]

هذا، ويبرهن على إعادة قراءته على الشاه إسحاق قول الشيخ عبد الحي الحسني آنفا: وسمع الحديث على الشيخ إسحاق.

وقوله: "وأسند الحديث عن الشيخ محمد عابد السندي"، أي بسماع صحيح البخاري إلى كتاب الغسل وقراءة باقيه كاملاً وإجازة بقية الكتب كما ذكر في إجازته للشيخ محمد قاسم النانوتوي ولفظه: "وكذلك حصل لي الإجازة من محدث دار الهجرة الشيخ عابد السندي فإني قرأت عليه البخاري، وسمعت منه إلى كتاب الغسل، وأجازني ببقية الكتب".اهـ

وقد استوعب أسانيده الشيخ عبد الحي الكتاني إجمالاً، فأذكره بطوله لفائدته. قال الكتاني: الشيخ عبد الغني الدهلوي: هو بهجة المحدثين وزينة المسندين، العالم العامل العارف الشيخ عبد الغني، ابن العارف الكبير الشيخ أبي سعيد، نجل العارف الكبير الشيخ صفي القدر شبل العارف الكبير الشيخ عزيز القدر فرع العارف الكبير الشيخ محمد عيسى، نتيجة العارف الكبير الإمام محمد معصوم، نجل الإمام المجدد الشهاب أحمد بن عبد الأحد العمري السهرندي الدهلوي المدني المهاجر الحنفي الأثري المذهب النقشبندي الطريقة. حلاه شيخنا أبو الحسن ابن ظاهر بـ" حامل لواء أهل الرواية والأثر في بلدة سيد البشر". اهـ

ولد بدهلي في شعبان سنة 1235، هاجر إلى المدينة سنة 1272، وبها مات عام 1296، بعد أن صار المحدث بين لابتيها حتى قال عنه تلميذه الترهتي في " اليانع الجني في أسانيد الشيخ عبد الغني ": " هو اليوم عذيقها المرجب والمحدث بين لابتيها، لا تكاد تسمع أنتاك عند غيره فيها حدثنا الزهري عن سالم عن أبيه إلا قليلاً ". اهـ. إلى أن قال:

أجاز للمترجم والده بكل ما وصله عن أشياخه وحافظ الحجاز محمد عابد السندي بعد أن سمع عليه مسلسلات ثبته، وذلك سنة 1250هـ والمترجم إذ ذاك ابن خمس عشرة سنة، وأبو زاهد إسماعيل بن إدريس الاسلامبولي ثم المدني، أخذ عنه أيضاً في التاريخ المذكور، وهما عمدته في الرواية وكتبا له إجازة حافلة، وعندي صورة إجازتهما له، والعجب من عدم إدراجها في "اليانع الجني في أسانيد الشيخ عبد الغني".

ويروي سماعاً وإجازة أيضاً عن محدث الهند الشيخ محمد إسحاق الدهلوي والشيخ مخصوص الله بن رفيع الدين الدهلوي العمري.

ويروي عن والده الشيخ أبي سعيد عن خاله العالم العارف سراج أحمد عن أبيه محمد مرشد عن أبيه محمد أرشد عن أبيه المولوي محمد فرخشاه عن أبيه خازن الرحمة محمد سعيد محشي " مشكاة المصابيح " عن أبيه مجدد الألف الثاني أحمد بن عبد الأحد السهرندي عن مولانا يعقوب الكشميري عن الشهاب ابن حجر الهيتمي.

ويروي أيضاً عن والده عن القطب عبد الله غلام علي الدهلوي عن شيخه مظهر جانانان عن محمد أفضل السيالكوتي عن سالم بن عبد الله البصري وعبد الأحد ابن خازن الرحمة محمد سعيد الأخير عن أبيه عن جده المجدد [الألف الثاني]، والعجب إهمال صاحب " اليانع الجني" لمثل هذه الأسانيد المسلسلة بالأقارب مع نفاستها وأهميتها، وقد ظفرت بها في إجازة الشيخ عبد الغني لشيخي محمد عبد الحي اللكنوي.

ويروي الشيخ عبد الغني أيضاً عن السيد عبد الله الميرغني مفتي الحنفية بمكة، كما ذكر ذلك الشيخ خضر الرضوي في إجازته لي عنه وهو يروي عن عبد الملك بن عبد المنعم القلعي بسنده.

وأشهر أسانيد الشيخ عبد الغني عن أبيه ومحدث الديار الهندية الشيخ محمد إسحاق، كلاهما عن جد الأخير لأمه الشيخ عبد العزيز الدهلوي عن أبيه ولي الله عن أبي طاهر الكوراني عن أبيه الملا إبراهيم عالم المدينة ومسندها عن النجم الغزي عن أبيه البدر عن أصحاب الحافظ ابن حجر.

لا أتقن ولا أوثق في سلاسل المتأخرين من هذه السلسلة، لأنها مع علوها مسلسلة بأئمة الأعصار والأمصار، وأقطاب السنة ورجال العلم والعمل، ولذلك إذا أردتُ [الاتصال به، و]رويتُ عن الوالد عَن الشيخ عبد الغني بها كأني أقول بالنسبة لزماننا والقرون الأخيرة حدثني مالك عن نافع عن ابن عمر فأجد لهذا السياق من الحلاوة والقبول [ما لم أجد لغيره]. انتهى[11].

قال الراقم: وما بين المعقوفتين مني، زدته لإيضاح المبهمات، وهو أجل مشايخ علماء ديوبند كالشيخ محمد قاسم النانوتوي والشيخ رشيد أحمد الجنجوهي والشيخ محمد يعقوب النانوتوي والشيخ ملا محمود الديوبندي والسيد أحمد الدهلوي، وغيرهم.

دراسة الشيخ محمد قاسم النانوتوي الحديث عليه:

درس عليه حجة الإسلام تفسير الجلالي، والموطأين لمالك ولمحمد، والكتب الستة غير أبي داود. وقد ذكر بعضهم الكتب الستة بكمالها لكن الصواب أنه لم يقرأ عليه سنن أبي داود.

قال الشيخ محمد يعقوب النانوتوي[12]: "وهكذا كان الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي، وقد كان صديقه [أي صديق الشيخ محمد قاسم النانوتوي] وصاحبه وزميله في الدراسة منذ ذلك، حتى درسا كتب الحديث على الشاه عبد الغني - رحمه الله - معًا"۔ ثم قال بعد أسطر: وقد أكمل [أي الشيخ محمد قاسم النانوتوي] كتب الحديث دراسةً على الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي. انتهى.

قال الراقم: وكتب الحديث التي كانت تدرس هي الكتب الستة والموطآن وغيرها، وهذه العبارة أوثق وثيقة على أنه درس هذه الكتب كلها على الشاه عبد الغني المجددي، لأن الشيخ محمد يعقوب النانوتوي كان صاحبه في الدراسة.

وقال الشيخ محمد عاشق إلهي الميرتهي في تذكرة الرشيد(1/28) عند ذكر الشيخ مملوك العلي النانوتوي: "الأستاذ البارع الذكي يبحث عن التلميذ الذكي، والتلميذ الذكي يبحث عن الأستاذ البارع الذي يشفي غليله. فاجتمعت أسباب الراحة القلبية من كلا الجانبين، وتزامل الشيخان الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي والشيخ محمد قاسم النانوتوي في الدراسة لديه بعد قليل ولم يفترقا حتى في الآخرة"۔ ثم قال بعد قليل: "أما الحديث فدرسا على قدوة العلماء وزبدة الأصفياء حضرة مولانا المولوي الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي.

وقال أيضا(1/30): "والمشهور أن أحب تلامذة الشاه عبد الغني المجددي إليه هو الشيخ محمد قاسم النانوتوي والشيخ رشيد أحمد الجنجوهي".

وقال أيضا(1/35): الخلاصة أنه [أي الشيخ رشيد الجنجوهي] قرأ أكثر كتب المعقول والمنقول سوى الصحاح الست على الشيخ مملوك العلي النانوتوي، وأما الصحاح الست كلها تقريبا حرفا حرفا درس على الشاه عبد الغني المجددي رحمه الله.انتهى. وقال شيخ الحديث محمد زكريا رحمه الله: وكان معه في هذه الدراسات مولانا محمد قاسم النانوتوي رحمه الله.

وقال الشيخ مناظر حسن الكيلاني في سوانح قاسمي(1/253) ما ترجمته: "أما علم الحديث فهو وإن قال المصنف الإمام [أي الشيخ محمد يعقوب النانوتوي]: "درسا كتب الحديث في خدمة الشاه عبد الغني المرحوم" إلا أن الظاهر الذي يفهم منه أنهما قرأ كتب الحديث كلها على الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي، وخصوصا ما كتب الشيخ محمد عاشق إلهي المرحوم عن الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي أنه درس الصحاح الست كلها تقريبا حرفا حرفا على الشاه عبد الغني المجدّدي رحمه الله.

فلو قبلنا دراسة سيدنا الإمام الكبير [أي العلامة محمد قاسم النانوتوي] كذلك الكتب الستة عليه لدوام تعلقهما ومصاحبتهما لساندنا في ذلك ظاهر اقتضاء الحال؛ لكن الذين ترجموا له وكتبوا حوله هم فصّلوا في دراسة كتبه للحديث، ومما يعلم من ذلك أنه فاته على الشاه عبد الغني كتاب واحد من الكتب الستة ألا وهو سنن أبي داود، فلم يستطع الإمام أن يدرس عليه، وهذا الكتاب الوحيد الذي لم يكونا [أي النانوتوي والجنجوهي] فيه زميلين لسبب من الأسباب، وما هي تلك الأسباب؟

لم أعثر له على جواب مع طول البحث عنه، ولم أجد لذلك جوابا إلا أنه نص على ذلك تلميذه مولانا منصور علي خان الحيدر آبادي - رحمة الله عليه - في كتابه "مذهب منصور"(1/181)، وأن الشاه عبد الغني هاجر من دهلي إلى المدينة المنورة بعده. قال الشيخ منصور علي خان: إن مولانا المرحوم [الشاه عبد الغني] أستاذ حديث للشيخ محمد قاسم ولم يدرس النانوتوي الصحيحين البخاري ومسلم وماسواهما من السنن الثلاثة: الترمذي والنسائي وابن ماجه إلا عليه"اهـ

قال الشيخ منصور علي خان(1/182): أما سنن أبي داود التي فاته [على الشاه عبد الغني] فلم يمنع حياؤه وشهرته القراءة على الشيخ أحمد علي السهارنفوري. وهذا هو التفصيل لدراسة كتب الحديث التي ذكره مصنف "سوانح مخطوطة" [وهو تلميذه الشيخ فخر الحسن الكنكوهي] مجملا. وقد عبر عنها بالألفاظ التالية: "إن الشيخ محمد قاسم النانوتوي درس كتب الحديث على الشاه عبد الغني الدهلوي قدس الله سره العزيز ومولانا أحمد علي المرحوم السهارنفوري"..

ثم قال الشيخ مناظر حسن(1/261) والظن أنه قرأ سنن أبي داود على الشيخ أحمد علي السهارنفوري بعد رجوع الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي إلى وطنه.[أي بعد 1265هـ] انتهى كلامه.

قال العبد الضعيف: لقراءة الحديث في ديار الهند طرق ثلاثة. سماع الطالب من الشيخ، قراءة الطالب على الشيخ، والقراءة على الشيخ وهو يسمع، وكان من عادة مشايخنا - ومنهم الشيخ عبد الغني المجددي الدهلوي- لا يذكرون هذا الثالث إلا مع تقييد اسم القارئ معه لئن تنكر وإلا أبهم.

وهذا نص إجازة الشاه عبد الغني للشيخ محمد قاسم النانوتوي

الحمد لله أولا وآخرا، والصلاة والسلام على نبيه وصفيه دائما وسرمدا، وعلى آله وأصحابه أبدا أبدا.

أما بعد: فأقول وبعون الله أصول وأحول - وأنا أضعف عباد الله القوي عبد الغني بن أبي سعيد المجددي الدهلوي-: إن الأخ الصالح الكاظم أصلح الله شأنه وأكمل إيمانه قد قرأ علي الصحيح لأبي الحسين مسلم بن حجاج القشيري النيسابوري، وجامع [illegible] عيسى الترمذي إلا القليل من الكتابين فإنه سماع غيره، والثلث الآخر من صحيح البخاري بالقراءة والسماع [أي لباقيه]، وموطأ مالك بن أنس سمع بعضه بقراءة ابن أخي الـ[illegible] الذي قرأ علي.

فلما رأيت تأهله لدراسة الحديث لكمال فطانته وتمام ذهانته مع صلاحية الحال في الأعمال والأقوال، والأفعال أجزت له ما تيسر لي من حصول الإجازة من والدي ومرشدي عن الشيخ عبد العزيز المحدث رحمة الله عليهما، وكذلك حصل لي الإجازة من محدث دار الهجرة الشيخ عابد السندي، فإني قرأت عليه البخاري، وسمعت منه إلى كتاب الغسل، وأجازني ببقية الكتب قراءة لبعضها، وسمعت على الناسك المهاجر الشيخ محمد إسحاق رحمه الله تعالى البخاري والترمذي وغيرهما. صورة الخاتم: والله الغني وأنتم الفقراء[13].

وهذا نص إجازة الشاه عبد الغني للشيخ رشيد أحمد الجنجوهي

بسم الله الرحمن الرحيم.

الحمد لله أولا وآخرا، والصلاة والسلام على رسوله دائما وسرمدا، وعلى آله وأصحابه كذلك.

أما بعد: فأقول - وأنا ملتجئ إلى الحرم النبوي، عبدالغني بن أبي سعيد المجددي الدهلوي، سامحه الله تعالى بلطفه الخفي -:

إن الأخ الصالح المولوي رشيد أحمد النعماني أما والأنصاري أبا توجه إلى زيارة شفيع المذنبين صلوات الله وسلامه عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين، وقد كان قرأ علي الثلث من صحيح أبي عبد الله محمد بن إسمعيل البخاري، وجميع السنن للإمام أبي داود سليمان بن أشعث السجستاني رحمة الله عليهما، وطلب مني الإجازة لبقية الأمهات الست وغيرها، فأجزت له بجميع ما يجوز لي الرواية فيه، والذي حصلت من مشايخ الحرمين الشريفين ومشايخ الهند. فأجزت له. وهو إن شاء الله أهل لذلك، وذلك ظني به والله حسيبه.

وأوصيه أن لا ينساني من صالح دعائه وأنا أدعو له أن يثبته الله تعالى على القول الثابت حيث لا يخاف في الله لومة لائم، وأن ينتفع به المسلمون، ويكون ذاكراً لله تعالى على كل حال دائم، وحشرني الله تعالى وإياه في زمرة الصالحين بجاه سيد المرسلين صلوات الله وسلامه عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين، قاله بفمه وكتبه بقلمه عبدالغني بن أبي سعيد في المسجد النبوي، يوم الجمعة سنة 1270هـ، 9- محرم. انتهى كلامه[14].

وملخص التفصيل هكذا: الشيخان يرويان عن الشيخ عبد الغني المجددي الدهلوي الكتب الستة والموطأ برواية يحيى ومحمد، والجلالين[15]، وأنه حصل للشيخ محمد قاسم النانوتوي القراءة في الثلث الآخر من البخاري ومسلم والترمذي كاملين إلا القليل من الكتابين فإنه سماع لهما من قراءة غيره على الشاه عبد الغني وهما يسمعان. وأنه حصل للشيخ رشيد أحمد الجنجوهي قراءة الثلث الأول من البخاري وسنن أبي داود كاملا.

وقد تقدم أن الشيخ محمد قاسم النانوتوي كان غائبًا عند قراءة سنن أبي داود لعارض، وأنه قرأ سنن أبي داود على الشيخ أحمد علي السهارنفوري. وأما الثلث الأوسط من البخاري وسنن النسائي وابن ماجه والموطأ لمحمد فقد قرأه غيرهما وهما يسمعان، وأما الموطأ لمالك فسمعا بعضه بقراءة الشيخ مظهر بن أحمد سعيد المجددي ابن أخي الشاه عبد الغني، وأما الباقي منه فبقراءة غيره وهم يسمعون.

وكان الشيخ محمد قاسم النانوتوي يسند كل الكتب عن الشاه عبد الغني، وقد ذكر الشيخ محمد يعقوب النانوتوي إملاءات الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي لأسانيده في كتابه "مكتوبات وبياض يعقوبي"(1/177) جمع تلميذه الشيخ أشرف علي التهانوي، ونص عنوانه هكذا: سند الكتب الحديثية بخط الفير. ويعني بالفير الشيخ محمد قاسم النانوتوي كما أشار إليه الشيخ أشرف علي في آخره بعد ذكر الأسانيد كلها قال: هذه (أي التي كتبت قبل) خط شيخنا لشيخنا.اهـ

والمراد بشيخنا الأول: هو الشيخ محمد قاسم النانوتوي وشيخنا الثاني الشيخ محمد يعقوب النانوتوي.

وذكر فيه أسانيده عن طريق الشاه إسحاق للكتب الستة وعن طريق أبي سعيد المجددي الحصن الحصين ودلائل الخيرات، ثم قال الشيخ الأجل مولانا محمد قاسم النانوتوي: إنه قال شيخي وأستاذي قدوة العلماء، مقتدى الفضلاء، صاحب البركات، مولانا عبد الغني بن قطب الوقت الحافظ أبي سعيد النقشبندي: إنه قال الشيخ العلامة وحيد العصر فريد الزمان الشيخ محمد عابد السندي:

- أروي عن مولانا الإمام الرباني الشيخ يوسف بن محمد بن علاء الدين المزجاجي عن والده الشيخ محمد عن والده الشيخ علاء الدين عن الشيخ عبد الله بن سالم البصري والشيخ أحمد النخلي والشيخ حسن العجيمي والشيخ إبراهيم الكردي، وقال مولانا محمد قاسم: فكل إسناد أذكره سردا فيما بعد فهو من أحد هذه الشيوخ الأربعة هكذا. ثم ذكر أسانيد الكتب الستة وسنن الدارمي والسنن للدارقطني والمسلسل بالأولية والموطأ للإمام مالك ومسند الإمام أبي حنيفة للحارثي. وهذه الكتب غير الدارمي والدارقطني داخل في منهج علماء ديوبند والشاه ولي الله للدراسة العلمية".

وقال الشيخ نفيس الحسيني في كتابه قاسم العلوم والخيرات(1/86): الشيخ محمد قاسم النانوتوي تخرج في دروة الحديث عند الشاه عبد الغني سنة 1265هـ/1840م وكان عمره 17 عاما، وهذه نفس السنة التي تخرج فيها الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي، وقد تواتر لدي إكماله الكتب الستة على الشيخ عبد الغني والشيخ أحمد علي السهارنفوري من مصادر متعددة، لكني أعرضت عن ذكرها كلها إيثارًا للاختصار.

2- الشيخ أحمد علي السهارنفوري.

قال الشيخ عبد الحي الحسني في نزهة الخواطر(7/ 907): الشيخ العالم الفقيه المحدث أحمد علي بن لطف الله الحنفي الماتريدي السهارنبوري أحد كبار الفقهاء الحنفية، ولد ونشأ بمدينة سهارنبور وقرأ شيئاً نزراً على أساتذة بلدته، ثم سافر إلى دهلي وأخذ عن الشيخ مملوك العلي النانوتوي.

وأسند الحديث عن الشيخ وجيه الدين السهارنبوري عن الشيخ عبد الحي بن هبة الله البرهانوي عن الشيخ عبد القادر بن ولي الله الدهلوي، ثم سافر إلى مكة المباركة فتشرف بالحج وقرأ الأمهات الست على الشيخ إسحاق ابن محمد أفضل الدهلوي المهاجر المكي سبط الشيخ عبد العزيز بن ولي الله، وأخذ عنه الإجازة.

ورحل إلى المدينة المنورة، وسعد وتبرك بالاقامة في جوار النبي صلى الله عليه وسلم، ثم رجع إلى الهند، وتصدر بها للتدريس مع استرزاقه بالتجارة، وكان عالماً صدوقاً أميناً ذا عناية تامة بالحديث، صرف عمره في تدريس الصحاح الست وتصحيحها لا سيما صحيح الإمام البخاري، خدمه عشر سنين، فصححه وكتب عليه حاشية مبسوطة. توفي بالفالج لست ليال خلون من جمادى الأولى سنة سبع وتسعين ومائتين وألف بمدينة سهارنبور فدفن بها.انتهى كلامه.

قراءة الشيخ محمد قاسم النانوتوي عليه:

قد تقدم أنه قرأ عليه سنن أبي داود كاملا، وذكر الشيخ عارف جميل القاسمي في مقدمة كتاب"الإمام النانوتوي كما رأيته" (1.26) والشيخ أس محمد المظفر نكري في مقالته المسماة: "الإمام محمد قاسم النانوتوي رحمه الله شخصية عبقرية قامت بإنشاء حركة المدارس الدينية، وريادة النهضة الإسلامية في شبه القارة الهندية" وطبعت في مجلة الداعي الشهيرة الصادرة عن دار العلوم في جمادى الأولى 1436 هـ – فبراير - مارس 2015م ، العدد : 5 ، السنة : 39 فذكرا أن الشيخ النانوتوي قرأ سنن النسائي وجزءا من الموطأ أيضا على الشيخ أحمد علي السهارنفوري.

ونقل الشيخ مولانا عبد الحفيظ البلياوي عن شيخه شيخ الهند محمود الحسن الديوبندي في كتابه تقارير شيخ الهند عند تقرير جامع الترمذي(1/23): "حصلت جامع الترمذي على الشيخ محمد قاسم وهو أخذه على الشيخ محمد قاسم النانوتوي، وهو أخذه على أحمد علي السهارنفوري وسنده إلى أبي الفتح مذكور في الترمذي المطبوع من المطبعة الأحمدية "انتهى كلامه. وهذا يدل على أن الشيخ محمد قاسم النانوتوي درس جامع الترمذي على الشيخ أحمد علي السهارنفوري أيضًا.

وسند الشيخ خير محمد الجالندهري يدل على أنه قرأ عليه البخاري أيضا فقال ما نصه : "مولانا محمود حسن الديوبندي عن شمس الإسلام قاسم العلوم والحكم مولانا محمد قاسم النانوتوي عن المحدث العارف بالله الغني الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي، وعن مظهر الخفي والجلي الشيخ أحمد علي السهارنفوري عن الشيخ المشتهر في الآفاق الشيخ محمد إسحاق الدهلوي"انتهى كلامه[16]. وقد كان يدرس صحيح البخاري ومتن الترمذي.

بل نص الشيخ عبد الحق الحقاني في كتابه حقائق السنن(1/84): أن الشيخ محمد قاسم النانوتوي قرأ عليه صحيح البخاري كاملًا۔ وذكر سببه أنه كان بينه وبين الشيخ أحمد علي اختلاف في بعض المسائل۔ فأراد أن يناظره فجلس في درسه لصحيح البخاري۔ فأخذ يعترض عليه والشيخ السهارنفوري يجيب۔ واعترف الشيخ أحمد علي في بعض المسائل أن الحق مع الشيخ محمد قاسم النانوتوي حتى أكمل عليه۔اهـ

وقال الشيخ أشرف علي التهانوي في السبع السيارة كما في الازدياد السني [1/ 34] عند ذكر إسناد صحيح البخاري، أنه روى بعضه عن الشيخ الأجل المولى محمد يعقوب النانوتوي، رحمه الله رحمة واسعة، عن الشيخ عبد الغني عن أبيه الشيخ أبي سعيد، وبعضه عن الشيخ الشهير في الزمن، المولوي محمود حسن [الديوبندي]، سلمه الله تعالى، عن نخبة الأكارم، مولانا محمد قاسم [النانوتوي] عن عن المحدث الجليل، المولى أحمد علي السهارنفوري، عن الشيخ أبي سليمان إسحاق، كلاهما عن الشيخ عبد العزيز المحدث الدهلوي....الخ.

وقال في صحيح مسلم: أرويه عن الشيخين الجليلين المذكورين، شفعًا شفعًا، بسنديهما الذين مر ذكرهما في البخاري إلى الشيخ عبد العزيز...

وقال في سنن الترمذي: أروي كله - فيما أذكر- عن شيخي العلامة الشيخ محمد يعقوب، أو بعضه عن شيخي محمود حسن، بإسناديهما الذين مرا في مسلم إلى الشيخ عبد العزيز... ـ

وقال في إسناد كتاب المجتبى للنسائي: أرويه عن الشيخ المولى محمود حسن، بإسناده المذكور في البخاري إلى الشيخ عبد العزيز۔

وقال في إسناد كتاب السنن لابن ماجه: أرويه عن شيخي محمود حسن، بإسناده المذكور في البخاري إلى الشيخ عبد العزيز۔ الخ. انتهى.

والشيخ أشرف علي التهانوي رحمه الله تعرض لذكر شيوخه وأسانيدهم السماعية، ولم يذكر أسانيده الإجازية، فهي أعلى منها بثلاث طبقات كما هو معروف، فهذا يدل على أن الشيخ محمد قاسم النانوتوي قرأ هذه الكتب على الشيخ أحمد علي السهارنفوري أيضًا.

فالنتيجة التي وصلت إليها: أن الشيخ محمد قاسم النانوتوي قرأ كتب الحديث كلها مرتين، مرة على الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي، ثم أعاد ثانيا على الشيخ أحمد علي السهارنفوري.

قال الشيخ محمد إسحاق بهتي في كتابه "فقهاء بند وپاک" [فقهاء الهند وباكستان] في ترجمة الشيخ محمد قاسم النانوتوي (1/239): حصّل الشيخ النانوتوي علم الحديث على الشيخ أحمد علي السهارنفوري والشاه عبد الغني المجددي.

وقال: تخرج على الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي عام 1265هـ وصحبه الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي في الدرس أربع سنوات.

وقال الشيخ المفتي محمد شفيع في الدر المنضود(1/9) في ترجمة الشيخ أحمد علي السهارنفوري: وممن قرأ عليه بعد تكميل الحديث وتدريسه حضرة مولانا محمد قاسم النانوتوي، قدس الله أسرارهما.

3- الشيخ أحمد سعيد المجددي الدهلوي.

قال الشيخ عبد الحي الحسني في نزهة الخواطر(7/ 906): الشيخ العالم الكبير الفقيه أحمد سعيد بن أبي سعيد بن الصفي العمري الدهلوي، أحد المشايخ المشهورين، ولد غرة ربيع الثاني سنة سبع عشرة ومائتين وألف بمدينة رامبور وانتفع بوالده وبخال والده الشيخ سراج أحمد وسمع منه المسلسل بالأولية، وقرأ بعض الكتب الدرسية على المفتي شرف الدين ثم دخل لكهنؤ، وقرأ بعض الكتب على الشيخ محمد أشرف وبعضها على العلامة نور الحق، ثم سافر إلى دهلي وأخذ عن الشيخ فضل إمام الخير آبادي والشيخ رشيد الدين الدهلوي.

وكان يختلف في أثناء تحصيله إلى الشيخ عبد القادر والشيخ رفيع الدين والشيخ عبد العزيز أبناء الشيخ الأجل ولي الله بن عبد الرحيم الدهلوي تارة لتحقيق المسائل وتارة لسماع الدرس فاستفاد منهم، وحصلت له الإجازة من الشيخ عبد العزيز المذكور للصحاح الست والحصن الحصين ودلائل الخيرات والقول الجميل وغيرها.

وقرأ على الشيخ غلام علي العلوي الدهلوي الرسالة القشيرية والعوارف وإحياء العلوم ونفحات الأنس والرشحات عين الحياة والمثنوي المعنوي والمكتوبات لجده الإمام الرباني رحمه الله قراءة وسماعاً، وبايعه، وكان الشيخ المذكور يحبه حباً مفرطاً، ويلاطفه ملاطفة الآباء للأبناء، ويحرضه على تحصيل العلوم، ويأمره بجمع الحال والقال، ويتوجه إليه بالهمة الصادقة القوية، حتى بلغ رتبة الكمال.

ولما توفي أبوه تولى الشياخة وجلس على سجادة الشيخ غلام علي المذكور، فرزق حسن القبول، واجتمع الناس لديه من كل فج عميق ومرمى سحيق إلى أن بلغ السابعة والخمسين من عمره مفيداً مفيضاً، فبينما هو كذلك إذ ثارت الفتنة العظيمة بدهلي في السادس عشر من رمضان سنة ثلاث وسبعين.

وعمت البلوى في أقطار الهند وسفكت الدماء ونهبت الأموال وخربت البلاد وهلك العباد، لا سيما في مدينة دهلي، وهو لم يزل مستقيماً في الخانقاه الزاوية حتى مضت عليه أربعة أشهر، وغلبت الحكومة الإنكليزية مرة ثانية على الثوار، واتهموه باقتفاء الخروج على الحكومة، وأرادوا أن يفعلوا به وبعشيرته ما فعلوا بالمحاربين من قتل ونهب فشفع فيه رئيس الأفاغنة الذي به غلبت الحكومة على الهند فكفوا أيديهم عن المؤاخذة.

حتى خرج الشيخ مع عشيرته كلها من دهلي، وأراد أن يسافر إلى الحرمين الشريفين، فحصل له الرئيس المذكور جواز السفر من الحكومة، وجهز له الزاد والراحلة، حتى بلغ إلى مكة المشرفة، وتشرف بالحج ثم ذهب إلى طابة الطيبة، وسكن بها، وكان خرج من دهلي في آخر محرم سنة أربع وسبعين ودخل مكة المباركة في شوال من تلك السنة.

وله رسائل في الفقه والسلوك منها الفوائد الضابطة في إثبات الرابطة ومنها تصحيح المسائل في الرد على مائة مسائل ومنها الأنهار الأربعة في شرح الطرق الجشتية والقادرية والنقشبندية والمجددية، وله غير ذلك.

توفي يوم الثلاثاء بعد صلاة الظهر لليلتين خلتا من ربيع الأول سنة سبع وسبعين ومائتين وألف بالمدينة المنورة، فدفن بالبقيع عند قبة سيدنا عثمان رضي الله عنه.اهـ

وقال الشيخ عبد الستار الدهلوي في فيض الملك المتعالي(1/2): وكان قد قرأ كتب الحديث [أي الكتب الستة وغيرها] على الشيخ إسحاق ابن بنت الشيخ عبد العزيز الدهلوي(3)، المعروف۔ برامفور على ثماني مراحل من دهلي.اهـ

ثبوت قراءة الشيخ محمد قاسم النانوتوي عليه:

لقد ذكر الشيخ حسين أحمد المدني في إجازته للشيخ عبد الحليم النعماني أنه حصلت للشيخ محمد قاسم النانوتوي القراءة والإجازة عن الشيخ أحمد سعيد المجددي الدهلوي، ولم أعثر على تفصيل في ذلك، إلا أن القراءة عليه كانت قليلة جدًا، والتفصيل في "تذكرة الرشيد"۔ والذي يغلب على الظن أنه قرأ عليه الأوائل السنبلية والمشكاة والمسلسلات كما تدل عليه بعض أسانيد الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي.

وهذا نص الشيخ حسين أحمد المدني في إجازته: "ويروي الشمسان [النانوتوي والكنكوهي] الموما إليهما سابقًا كتب الحديث والتفسير قراءةً وإجازةً عن أئمة أعلام؛ أجلهم شيخ مشايخ الحديث الإمام الحجة العارف بالله الشيخ عبد الغني المجددي الدهلوي ثم المدني وعن الشيخ أحمد سعيد المجددي الدهلوي ثم المدني ومولانا أحمد علي السهارنفوري، قدس الله أسرارهم، كلهم عن الشهير في الآفاق، مولانا الإمام الحجة محمد إسحاق الدهلوي" انتهى كلامه.

وهذا ما أردت إيراده، ولله الحمد على ذلك، وقد تتبعت الكتب الكثيرة من أجله، وهذا ما وصل إليه تحقيقي أنه قرأ كتب الحديث التسعة: الصحيحين والسنن الأربعة والموطأين والشمائل على الشاه عبد الغني المجددي الدهلوي ثم أعاد هذه الكتب على الشيخ أحمد علي السهارنفوري، فإن يكن صوابًا فمن الله، وإن يكن خطأً فمني ومن الشيطان، وما كنت لأتجاسر على مثل هذا إلا لما رأيت من الإبهام وطعون الجاهلين في سماعاته وقلة الخائضين غمار هذه المسألة مع أهميتها، حيث إن العلامة الإمام حجة الإسلام مولانا محمد قاسم النانوتوي عمود الحركة الديوبندية الأساسي وباني جامعة دار العلوم الإسلامية بديوبند ومؤسسها.

قراءة شيخ الهند مولانا محمود الحسن الديوبندي عليه:

لقد قرأ شيخ الهند مولانا محمود حسن الديوبندي - رحمه الله - الكتب الستة والموطأين والشمائل للترمذي وغيرها ضمن الجامع.

إن أول شخصية تولى مشيخة الحديث وصدارة المحدثين في جامعة دار العوم ديوبند هو الشيخ محمد يعقوب النانوتوي وقد نص على هذا غير واحد منهم الشيخ محمد عاشق إلهي البرني في العناقيد الغالية۔ وكان كل مشايخي يروون عن شيخ الهند محمود حسن الديوبندي عن الشيخ محمد قاسم النانوتوي ولا يذكر أحد روايته عن الشيخ محمد يعقوب النانوتوي في الحديث۔ فكنت أبحث برهة من الزمان حتى أجد نصًا على قراءة شيخ الهند الكتب الستة على النانوتوي أو الشيخ محمد يعقوب النانوتوي۔ ثم تبين لي بعد مدة طويلة أن دورة الحديث بدأ في دار العلوم بديوبند عام 1390هـ وقد كان الشيخ محمود حسن أكمل دراسته بها عام 1386هـ ولازم الشيخ محمد قاسم النانوتوي في كتب الحديث وغيره حتى فرغ منها عام 1389هـ وإليك بعض النصوص في ذلك۔

قال شيخ الهند مولانا محمود حسن الديوبندي في رسالته إلى أخيه كما في حياة شيخ الهند للشيخ أصغر حسين الديوبندي(1/269): سند العبد العبد الضعيف في الكتب الحديثية عن الشيخ محمد قاسم النانوتوي وهو عن الشاه عبد الغني المهاجر المدني ومولانا أحمد علي السهارنبوري كلاهما عن الشاه ولي الله ۔اهـ

وقد تعرض هنا لذكر أسانيده السماعية. وإلا فيروي شيخ الهند إجازة عن شيخي شيخه محمد قاسم قراءة لأوائل الكتب وإجازة.

قال الشيخ أصغر حسين الديوبندي تلميذ شيخ الهند في كتابه حيات شيخ الهند(1/13) والشيخ سعيد الرحمن في تجليات رحماني(1/55) والشيخ عبد الحق الحقاني في حدائق السنن(1/84) -واللفظ للأول-: أما الصحاح الستة وغيرها أكملها دراسة بدأها على الشيخ محمد قاسم النانوتوي وكان الشيخ النانوتوي آن ذاك يقيم في "ميرت" في مطبعة منشي ممتاز علي ويصحح الكتب ثم انتقل إلى مطبعته في دهلي. فلازمه هنا وهناك وفي السفر والحضر - وقد ساعده في ذلك شفقة أستاذه عليه وكمال تحقيقه - حتى تخرج عليه عام 1289هـ بيد أن كتب دورة الحديث وغيرها استغرقت أربعة أعوام من 1386هـ إلى 1389هـ والسنتان الأخيرة منها كانتا في ديوبند.اهـ وزاد الشيخ عبد الحق فقال: وأكثر كتب الموقوف عليه أيضًا درس على الشيخ محمد قاسم النانوتوي.اهـ

قال الراقم: وكتب دورة الحديث هي الكتب الستة والموطآن لمالك ومحمد وشرح معاني الآثار للطحاوي وشمائل الترمذي. ومن كتب الموقوف عليه مشكاة المصابيح.

وقال الشيخ محمد عاشق إلهي الميرتهي وليس هذا البرني البلند شهري مؤلف العناقيد الغالية - في تذكرة الخليل(1/177) واللفظ له- والحكيم محمد إسلام الأنصاري في "ملت إسلام كى محسن شخصيات"(1/173) والشيخ حسين أحمد المدني في نقش حيات(2/137) والسيد نفيس شاه الحسيني في قاسم العلوم والخيرات(1/86): قرأ شيخ الهند الكتب الستة وغيرها على العلامة محمد قاسم النانوتوي حين كان يعمل في مطبعة أحمدي.اهـ قال الراقم: وكان من زملائه في الدراسة الشيخ أحمد حسن الأمروهي والشيخ فخر الحسن الكنكوهي والشيخ عبد الحق والشيخ عبد العلي الميرتهي.

هذا، وذكر الشيخ المفتي محمد شفيع العثماني في الازدياد السني(1/46) أنه حصل لشيخ الهند القراءة والإجازة عن الشيخ أحمد علي السهارنفوري ومولانا محمد مظهر النانوتوي ومولانا القاري عبد الرحمن البانيبتي قال الراقم: والمراد بالقراءة هنا قراءة أوائل الكتب الستة. وحصل لشيخ الهند أيضًا قراءة الأوائل وإجازة عن الشيخ رشيد أحمد الجنجوهي والشاه عبد الغني المجددي الدهلوي وقد نص على ذلك غير واحد.. والله أعلم. وهذا آخر ما أردت إيراده. وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب.

شمس الدين الصديقي

---

[1] أي دراسته الكتب الحديثية فهو عمود أساسي لعلماء ديوبند. وبجهوده الجبارة حفظ الله دينه في ديار الهند فكيف بعلم الحديث الذي هو من الأسس التي بني عليها الدين الحنيف؟!

[2] فإن الطالب قد يغفل أثناء القراءة أو السماع. ولا بد من تقييده. وأما الإجازة فهي الإذن بالرواية وهي جائزة. ولا يبنى عليها أحكام شرعية.

[3] في حاشيته على "مكتوبات وبياض يعقوبي" صفحة رقم (1/177) طبعة دار الإشاعت كراتشي

[4] رواه الخطيب في شرف أصحاب الحديث للخطيب البغدادي (1/40).

[5] نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر أو الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام للشيخ عبد الحي الحسني، طبعة دار ابن حزم(7/ 1067).

[6] وهذا غير صحيح بل الإمام محمد قاسم النانوتوي هو الذي أسس هذه المدرسة، ولكنه كان بعيدا عن المناصب الدنيوية والشهرة، فجعل الحاج محمد عابد مدير المدرسة واختار الشيخ محمد يعقوب النانوتوي رئيسا للمدرسين. والتفصيل في أنوار قاسمي وتذكار اكابر.

[7] قاله الشيخ عبد الحي الحسني في نزهة الخواطر(7/ 1024)

[8] قاله في تذكرة الرشيد(1/29)، وأثبت سماع البخاري في تذكرة الخليل(1/49) وظاهر عبارة اليانع الجني تدل على ذلك.

[9] وهي في مكتوبات وبياض يعقوبي المطبوعة من دار الإشاعت(1/177).

[10] وهي مطبوعة ضمن رسائل وإجازات الشيخ بن باز رحمه الله الجزء الثاني صفحة (76)

[11] في فهرس الفهارس والأثبات ومعجم المعاجم والمشيخات والمسلسلات للشيخ عبد الحي بن عبد الكبير الكتاني المغربي المطبوعة في دار الغرب الإسلامي(2/758).

[12] في كتابه: "سوانح عمري حجة الإسلام مولانا محمد قاسم نانوتوي"، وهي مطبوعة في بداية "سوانح قاسمي" للشيخ مناظر حسن الكيلاني طبعة مكتبة رحمانية لاهور (1/28) وقد ترجمه الشيخ محمد عارف جميل القاسمي المباركفوري باسم "الإمام محمد بن قاسم النانوتوي كما رأيته" (1/53).

[13] نقله الشيخ محمد يعقوب النانونوتوي في أخر كتابه "مكتوبات وبياض يعقوبي" (1/186).

[14] نقله شيخنا الشيخ عبد الحليم النعماني في كتابه "حضرت مدنى اور ان كى سندات" فأنقلهما برمته، وفي لامع الدراري على صحيح البخاري للشيخ زكريا الكاندهلوي، وقد مر ذكره.

[15] لأن هذه الكتب في منهج الشيخ ولي الله ويقرأه على الأقل كل من قرأ دورة الحديث، انظر صفحة رقم(1/20) من كتاب حيات الشاه محمد إسحاق المحدث الدهلوي لمولانا حكيم سيد محمود أحمد بركاتي

[16] ذكره الشيخ أنوار الحسن الشيركوتي في مقالته المسماة: "حجة الإسلام حضرة مولانا محمد قاسم النانوتوي وجهوده الأدبية" وقد طبعت ضمن رسائل "ياد گار اكابر"(1/469).

الامام محمد قاسم النانوتویؒ

''علمی خدمات''

از

محمد شمشاد رحمانی قاسمی

استاذ دار العلوم وقف دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حق جل مجدہ نے ہر دور میں ایسے رجالِ کار پیدا کئے جنہوں نے دین متین کی صحیح تشریح وتوضیح امت کے سامنے پیش کی اور دین اسلام کی تصویر کو دھندلا کرنے اور اس کے صاف چہرہ کو مسخ کرنے والوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی ذات گرامی بھی ہے، جنہیں اللہ رب العزت نے اہم دینی، علمی، اصلاحی خدمات کے لئے پیدا فرمایا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں کی بساط باضابطہ لپیٹی جا چکی تھی، مسلمان ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے انقلاب ۱۸۵۷ء تک کی مسلسل شکست خوردگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم وجارحیت نے مسلمانوں کو لاچار، بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ایک طرف مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے بازیافت کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کے ایمان ویقین کی حفاظت کا۔ حضرت نانوتویؒ نے دونوں مسئلوں پر توجہ فرمائی، چنانچہ جہاد شاملی اگر پہلے مسئلہ کے حل کے لئے تھا تو قیامِ دارالعلوم دوسرے اہم مسئلہ کے لئے بنیادی ستون۔

''دارالعلوم'' محض ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ وہ ایک تحریک تھی، جو دیوبند کے گمنام بستی سے اٹھی اور اقصائے عالم میں پھیل گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ اسے اسلامی چھاؤنی قرار دیتے تھے، اسے محض ایک درسگاہ کی شکل میں دیکھے جانے کے قائل نہ تھے۔ اگر آج دارالعلوم کی شکل میں تحریک مدارس کا آغاز نہ کیا جاتا اور لارڈ میکالے کا منہ توڑ جواب نہ دیا جاتا تو آج ہندوستانی مسلمان سب کچھ کے باوجود مسلمان نہ ہوتے، ان کے گھروں سے قرآن کی آواز کے بجائے بائبل کی آواز آتی۔ اللہ تعالیٰ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی قبر پر شبنم افشانی کرے انہوں نے ایسے جاں گسل اور مشکل

حالات میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی رہنمائی فرمائی جہاں دور دور تک اس کی حفاظت کا کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔

حضرت نانوتویؒ کا ایک امتیازی وصف بے پناہ کسرنفسی اور فنائیت ہے، دارالعلوم قائم کیا، اسے دین کا مضبوط قلعہ بنایا، لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھا اور چھپانے کی کوشش کی۔ بنیاد رکھی تھی تو کسی اور بزرگ کے ہاتھ رکھوائی، انتظام واہتمام کا شعبہ کسی اور بزرگ کے حوالے کیا، تدریس کسی اور کے حوالے مگر فرمانِ رسول ﷺ "من تواضع للہ رفعہ اللہ" جو اپنے آپ کو بچھاتا اور چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ آج دارالعلوم دیوبند کی پیشانی پر آپ کا نام سنہرے حروف سے کندہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے، عیسائیت کا فتنہ ہو یا آریہ سماجی یا کوئی اور باطل تحریک۔ انہوں نے اہل سنت والجماعت کے باہمی فروعی اختلاف کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ افسوس کہ ہم ان خصوصیات قاسمی سے محروم ہوتے جارہے ہیں، دفاع عن الاسلام کی طرف ہماری توجہ کم ہوگئی ہے اور باہمی اختلافات کی طرف ہماری توجہ بڑھ گئی ہے۔ تواضع وسادگی وتوکل کی راہ چھوڑ کر ہم عہدہ واقتدار اور خودنمائی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

الغرض حضرت نانوتویؒ کی شخصیت اتنی متعدد الجہات اور ہمہ گیر ہے کہ آپؒ کی خدمات کا مختصر تعارف بھی ایک طویل دفتر کا محتاج ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے ان تمام محاذوں پر انقلابی انداز سے محنت کی جن پر توجہ کی اس وقت ضرورت تھی۔ آپؒ نے اپنی شبانہ روز محنتوں سے خدمات اور کارناموں کا جو عظیم دفتر تیار کیا ہے موجودہ دور کے تناظر میں ان تمام کارناموں کو جدید تقاضے کے مطابق امت اسلامیہ کے سامنے لانے کی ضرورت تھی، یہ وہ عظیم ہدف ہے جسے بروئے کار لانے کے لئے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ نے ۱۴۳۴ھ میں انقلابی قدم اٹھایا اور دارالعلوم وقف دیوبند میں

"حجۃ الاسلام اکیڈمی" قائم کی اور اس کا ڈائریکٹر اپنے لائق و فائق اور فعال حفید محترم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کو بنایا۔اب یہ اکیڈمی موصوف کی نظامت میں اپنے مقاصدِ جلیلہ کی طرف بحمد اللہ رواں دواں ہے۔
اکیڈمی نے ۱۴۳۵ھ میں یہ فیصلہ کیا کہ دورِ حاضر کے تناظر میں مختلف عناوین پر محاضرے تیار کئے جائیں۔"عالم اسلام کے مشہور مفکرین" موضوع پر محاضرہ لکھنے کی ذمہ داری احقر کے سپرد کی، یہ محاضرہ دراصل اسی حکم کی تعمیل ہے۔

محاضرہ کی وسعت کے پیش نظر اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا محاضرہ بنام "الامام محمد قاسم النانوتویؒ حیات وتحریکات" تھا جو اسی سال ماہ جمادی الاولیٰ میں منظر عام پر آگیا تھا اور اب دوسرا محاضرہ بنام "الامام محمد قاسم النانوتویؒ علمی خدمات" آپ کے ہاتھوں میں ہے جو چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: "حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت محدث"

دوسرا باب: "حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت فقیہ"

تیسرا باب: "حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت مدرس"

چوتھا باب: "حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت مصنف" ہے۔

تیسرا اور چوتھا محاضرہ بھی انشاء اللہ جلد منظر عام پر آئے گا۔جو حضرت الامامؒ کے دعوتی وتجدیدی کارناموں پر مشتمل ہوگا۔

دعاء فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس حقیر سی کاوش کو شرفِ قبولیت سے نواز کر احقر کے لئے ذریعۂ نجات بنائے۔آمین یارب العالمین

محمد شمشاد رحمانی قاسمی

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

۲رذیقعدہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۴رجون ۲۰۲۰ء

❁ ❁ ❁

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

بحیثیت محدث

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تو تمام ہی علوم میں خواہ وہ علوم عقلیہ ہوں یا نقلیہ بڑا دسترس رکھتے تھے، آپ کے علوم میں عمق اور گہرائی تو ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے، لیکن خاص طور پر علم حدیث سے آپ کو زیادہ شغف تھا، آپ نے بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، مؤطا امام مالک حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے پڑھیں اور ابوداؤد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سے پڑھی۔

حضرت نانوتویؒ کی سند حدیث:

آپ کی سند پچیس واسطوں سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

آپ نے حدیث کی سند شاہ عبدالغنیؒ سے اور انہوں نے شاہ محمد اسحٰقؒ سے انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے، انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے، انہوں نے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنیؒ سے، انہوں نے (اپنے والد) شیخ ابراہیمؒ کردی سے، انہوں نے شیخ احمد قشاشیؒ سے، انہوں نے احمد بن عبدالقدوس ابوالمواہب الشناویؒ سے، انہوں نے شیخ شمس الدین رملیؒ سے، انہوں نے شیخ احمد زکریا انصاریؒ سے، انہوں نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ سے انہوں نے ابراہیم بن احمد تنوخیؒ سے، انہوں نے

ابوالعباس احمد بن ابی طالبؒ سے، انہوں نے سراج الحسین بن مبارک زبیدیؒ سے، انہوں نے شیخ ابوالوقت عبدالاول ہرویؒ سے، انہوں نے شیخ ابوالحسن عبدالرحمٰن بن مظفر داؤدیؒ سے، انہوں نے ابومحمد عبداللہ بن احمد سرخسیؒ سے، انہوں نے ابوعبداللہ محمد بن یوسفؒ سے، انہوں نے امام بخاریؒ سے انہوں نے شیخ ابوالیمانؒ سے، انہوں نے شیخ شعیبؒ سے انہوں نے شیخ ابوالزنادؒ سے، انہوں نے شیخ العربیؒ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے انہوں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔(۱)

طلب حدیث کی غیر معمولی تڑپ:

آپ باوجود کامل ہونے کے دوسرے اہل کمال سے استفادہ کرنے میں نہ شرم محسوس کرتے تھے اور نہ ہی کسی طرح کی جھجک، سفر میں حضر میں جب جہاں کسی محدث کا علم ہوتا ان کے درس میں پہنچ کر ان سے استفادہ فرماتے۔

ارواحِ ثلاثہ میں ایک واقعہ امیر شاہ خان صاحب کی زبانی سنئے لکھتے ہیں:

''حضرت نانوتویؒ سفر حج میں تھے اس سفر میں ان کا جہاز یمن کی ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا اور مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند روز قیام کرے گا پھر آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب کی بستی میں ایک معمر عالم اور محدث رہتے ہیں اس لئے آپ جہاز سے اتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہوگئے، جب ان کی خدمت میں پہونچے اور گفتگو ہوئی تو مولانا کو ان کی شہرت علم کی تصدیق ہوگئی اور آپ نے ان سے حدیث کی سند کی درخواست کی ان عالم نے دریافت کیا کہ تم نے کس سے حدیث پڑھی ہے

(۱) انوار قاسمی: ص۱۱۹ تا ۱۲۱، ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور

مولانا نے فرمایا کہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے وہ عالم شاہ عبدالغنی کو نہ جانتے تھے، اس لئے دریافت کیا کہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے کس سے پڑھی ہے، مولانا نے فرمایا: (شاہ محمد اسحاق صاحبؒ پھر پوچھا انہوں نے کس سے پڑھی تو مولانا نے فرمایا) شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے وہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے واقف تھے، جب ان کا نام سنا تو فرمایا کہ اب میں تم کو سند دے دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ ''شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، پس جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے مولانا کو حدیث کی سند دے دی خان صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ میں نے خود مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ سے سنا ہے۔''(۱)

بخاری شریف سے خصوصی مناسبت:

یوں تو حدیث کی ہر کتاب پر آپ کی گہری نظر تھی، لیکن خصوصیت سے بخاری شریف کے علوم سے آپ کو خاص مناسبت تھی اور آپ طرزِ تصنیفِ بخاری سے بے حد متأثر تھے، اس لئے فرماتے تھے کہ:

''تین کتابیں الیلی ہیں: ایک کلام اللہ، دوسری بخاری شریف، تیسری مثنوی شریف کہ ان کا کسی سے احاطہ نہیں ہو سکا، بخاری شریف کے تراجم کی دلالت کہیں خفی کہیں جلی، سچ یہ ہے کہ اس کا کسی سے احاطہ نہ ہوا، ایسے ہی قرآن شریف اور مثنوی شریف کا بھی''۔(۲)

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۶۴، نعیمیہ دیوبند (۲) ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۱۲، نعیمیہ، دیوبند

زمانہ طالب علمی میں عبقریت:

جس زمانہ میں آپ دہلی میں بخاری شریف پڑھ رہے تھے اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ دہلی کی کسی گلی سے گذر رہے تھے اور ہاتھ میں بخاری شریف کا نسخہ تھا ایک صاحب نسبت بزرگ حافظ عبدالقادر مجذوبؒ سے ملاقات ہوگئی، اس مجذوب بزرگؒ نے آپ کے ہاتھ سے بخاری شریف کا نسخہ لے لیا، اور آگے بڑھ گئے آپ نے اس خیال میں کہ نہ معلوم مجذوب صاحب کتاب کہاں ڈال دیں گے پیچھے پیچھے ہولیا راستہ میں ایک دکان ملی وہیں بیٹھ کر ورق گردانی شروع کردی اوراق الٹتے جاتے تھے اور زبان سے من من کہے جاتے تھے، آپ سامنے کھڑے ان حرکتوں کو دیکھتے رہے آخر میں حافظ صاحب مجذوب نے کتاب بند کی اور حضرت نانوتویؒ کو واپس کرتے ہوئے خطاب فرمایا:

"جا تو بڑا عالم ہے"۔

بخاری شریف پڑھنے کے زمانہ میں ہی بڑے عالم ہوجانے کی اطلاع کشفی راہ سے جسے مل چکی تھی اس کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سے ابوداؤد صرف اتصال وتصحیح سند کی غرض سے پڑھی تھی تو بے جا نہ ہوگا (۱)

محدث سہارنپوری کی تعریف وتحسین:

اس کی تائید مولانا منصور علی خاں حیدرآبادی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت نانوتویؒ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے درس ابوداؤد کے دوران ایسے نکات حدیث بیان کرتے کہ خود محدث سہارنپوریؒ مزے لے کر سنتے اور اسے نوٹ فرماکر مجالس ومجامع میں تذکرہ فرماتے اور مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی

---

(۱) سوانح قاسمی: ج ۱ ص ۲۴۷، ملخصاً

(صاحب سوانح) کے الفاظ ہیں:

''ایسے نکاتِ حدیث وقتِ درس کے (سیدنا الامام الکبیر) نے بیان کیے کہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام طلبہ فارغ التحصیل کے روبرو ان توجیہات مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔''(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درس بخاری:

ارواح ثلاثہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے جس سے زمانہ طالب علمی ہی سے علم حدیث میں آپ کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

''پنجلاسہ (پنجاب) میں ایک بزرگ راؤ عبدالرحمانؒ خان تھے جو انتہائی صاحب کشف تھے دردزہ کے لئے تعویذ لینے کیلئے کوئی آتا تو تعویذ کے ساتھ کہہ دیا کرتے تھے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی، بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے تو بولے کیا کروں پیدا ہونے والے بچے کی صورت سامنے آجاتی ہے، اکابر دیوبند سے ان کے گہرے روابط تھے خصوصاً حضرت حاجی صاحبؒ سے ان کے بڑے تعلقات تھے حضرت نانوتویؒ بھی ان سے ملنے کیلئے جایا کرتے تھے پہلے سفر حج کے موقعہ پر رخصت ہوتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے دعا کی درخواست کی تو بزرگ نے فرمایا۔

''تمہارے لئے کیا دعا کروں میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہاں کے بادشاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے''۔(۲)

---

(۱) مذہب منصور: ص ۱۸۲، سوانح قاسمی: ج ۱ ص ۴۲۶

(۲) ارواح ثلاثہ: ص ۱۹۳، نعیمیہ، دیوبند

درس حدیث:

تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے باضابطہ کسی مدرسہ میں بیٹھ کر درس نہیں دیا اور نہ ہی اس کیلئے ملازمت اختیار کی بلکہ ذریعہ معاش تو مطبع میں رہ کر تصحیح کتب کو بنایا (جو خود ایک بڑا علمی کام تھا آج کے زمانے کی پروف ریڈنگ نہ سمجھا جائے)

اور مطبع کی چہار دیواری میں ہی وقت کے علماء وفضلاء جو پروانہ وار آپ کے پاس آتے انہیں حدیث کی کتابوں کا درس دیتے آپ بالخصوص صحاح ستہ کی تعلیم دیتے تھے بہت سے علماء جنہوں نے علمی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی، اسی میرٹھ کے مطبع میں ہی حضرت نانوتویؒ سے حدیث کی کتابیں پڑھی تھیں، دارالعلوم کے اول صدر المدرسین حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ تو باضابطہ اسی مطبع میں بغرض تعلیم ملازم ہی ہو گئے تھے اور آپ کے درس میں شرکت کرتے تھے اور بہت سے مشاہیر علماء جو عالم اسلام کے افق پر چمکے، انہیں حضرت نانوتویؒ کے درس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

درس حدیث کا طریقہ:

حدیث کا جو طریقۂ درس حضرت شاہ عبدالغنیؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ کا طرۂ امتیاز تھا وہی طریقۂ درس حضرت نانوتویؒ کے یہاں بھی تھا، سید محبوب رضوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''درس حدیث میں مذہب حنفیہ کے اثبات وترجیح کا وہ طریقہ اور تنقیحات وتشریحات کا وہ انداز جو آج دارالعلوم دیوبند کا طرۂ امتیاز ہے اور کم وبیش مدارس عربیہ میں مروج ومتداول ہے اسے فروغ دینے میں حضرت نانوتویؒ کا بڑا حصہ ہے، تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک درس حدیث میں صرف حدیث کا ترجمہ اور مذاہب اربعہ بیان کر دینا کافی سمجھا

جاتا تھا مگر جب اہل حدیث کی جانب سے احناف پر شد و مد کے ساتھ یہ
الزام لگایا گیا کہ ان کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے تو حضرت محمد
اسحاق صاحبؒ دہلوی اور ان کے بعض تلامذہ نے مذہب حنفی کے اثبات
وترجیح پر توجہ فرمائی، دارالعلوم میں حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور
دوسرے حضرات نے اس کو یہاں تک فروغ دیا کہ آج حدیث کی کوئی
معروف درس گاہ اس سے خالی نظر نہیں آتی''۔(۱)

خصوصیات درس:

حکیم منصور علی خاں صاحب مرادآبادی جو آپ کے خاص شاگردوں میں ہیں انہوں نے آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ جب کسی اہم اور مشکل مسئلہ کو
جمہور کے تصورات کے خلاف ثابت فرماتے تو بڑے بڑے ارباب علم
وفضل حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے تھے جو حکم ظاہر میں قطعاً بے دلیل
وبرہان معلوم ہوتا وہ تقریر کے بعد عقل کے عین مطابق معلوم ہونے لگتا تھا
آپ کے پیش کردہ دلائل کے خلاف بڑے بڑے ارباب علم وفضل کو
جرأت نہ ہوتی تھی۔''(۲)

اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جسے مشہور مصلح ومرشد قطب عالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ (جنہوں نے میرٹھ میں حضرت نانوتویؒ کے ایک درس میں شرکت فرمائی تھی) نے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) تاریخ دارالعلوم: ج۱ رص۱۱۲

(۲) مذہب منصور: ج۲ رص۱۷۸، بحوالہ تاریخ دارالعلوم: ص۱۱۳

"طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، حدیث پڑھی گئی حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی جس سے کلیتہً شافعی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی طلبہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہی کا مسلک صحیح ہے اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے، تب میں نے دیکھا کہ مولانا نانوتویؒ کا رنگ بدلا اور فرمانے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں جو تم سن چکے ہو، اب سنو! امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی بنیاد یہ ہے اس کے بعد مولانا نانوتویؒ نے پھر اس طرح تقریر کی کہ لوگ مبہوت بنے سنتے رہے ابھی جس مسلک کے متعلق ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہوسکتا تھا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہؒ نے منقح فرمایا ہے"۔(۱)

علم حدیث میں مذاقِ قاسمی:

(۱) ترجیح کے بجائے تطبیق

علماء احناف کہتے ہیں کہ اگر روایات باہم متعارض ہوں اور روایات کی تقدیم وتاخیر کا علم ہوجائے تو مقدم روایت کو منسوخ مانیں گے، ورنہ ترجیح کا راستہ اختیار

---

(۱) سوانح قاسمی: ج ۲ /ص ۴۳-۲۴۲

کریں گے اور اگر وجہ ترجیح بھی نہ ملے تو تطبیق کی صورت اختیار کریں گے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو توقف اختیار کریں گے، لیکن حضرت نانوتویؒ کا خیال یہ ہے کہ ترجیح کے بجائے تطبیق کا راستہ اختیار کریں گے اور دونوں حدیثوں پر عمل کریں گے، حتی الامکان کوشش ہو کہ کوئی حدیث عمل سے نہ رہ جائے، آپ کا یہ مذاق آپ کی تصانیف سے بھی ظاہر ہے، خصوصاً ''الحق الصریح'' اور ''توثیق الکلام'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حدیث ضعیف پر عمل:

اور آپ کا یہ مذاق آپ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے، ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ نے حاضرین مجلس سے فرمایا کہ:

> ''مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو گلاب سے زیادہ محبت تھی، جانتے ہو کیوں تھی؟ ایک صاحب نے عرض کیا کہ ایک حدیث ضعیف میں آیا ہے کہ گلاب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عرق مبارک سے بنا ہوا ہے، فرمایا: ہاں گرچہ حدیث ضعیف ہے مگر ہے تو حدیث (از تحریرات بعض ثقات)۔''(۱)

(۲) احکام منسوخ پر عمل:

حضرت نانوتویؒ کا یہ بھی نقطۂ نظر ہے کہ جو احکام منسوخ ہیں اگر فی نفسہ ان کی مشروعیت باقی ہو تو اس کو بھی مستحب کے درجہ میں رکھا جائے، تاکہ ان پر فی الجملہ عمل ہوجائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کی فی الجملہ اتباع ہوجائے، چنانچہ آپ کی رائے ہے کہ ''گو پچاس نمازیں منسوخ ہیں، لیکن استحباب کے درجہ میں ہنوز باقی ہیں'' پھر ایک نکتہ لکھا ہے کہ تتبع سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) بحوالہ ارواح ثلاثہ: ص ۲۱۶ر حکایت: ۲۳۲

یہ معمول شب وروز میں پچاس رکعت پڑھنے کا تھا۔(۱)

(۳) نسخ کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر:

نسخ کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر وہی تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا تھا کہ نسخ کم سے کم مانا جائے اور اس پر یہ دلیل پیش فرماتے تھے کہ نسخ خلاف اصل ہے، خود حضرت نانوتویؒ کے الفاظ ہیں:

"نسخ خلاف اصل ہے تا مقدور اس سے احتراز مناسب ہے"۔(۲)

(۴) نص کے ظاہر پر عمل:

اسی طرح آپ نص کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے کو بمقابلہ اس کی تاویل وتوجیہ کے انسب خیال کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل نسخ ہے زیبا نہیں۔"(۳)

(۵) احادیث سے استدلال میں درایت کا غلبہ:

حضرت نانوتویؒ کے یہاں احادیث سے استدلال میں درایت کا پہلو غالب ہے، جو ایک مشکل عمل ہے، کیونکہ روایت کیلئے نقل وحکایت ہے اور درایت کے لئے اس موضوع کی تہہ تک پہونچ کر اپنی بات کہنا اور اپنی قوت فکر کا استعمال کرنا ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے اس بات کی طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے:

"قوتِ روایت باعتبار قوتِ درایت سند سے بڑھ کر ہے"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قوتِ درایت قوت روایت سے مقدم ہے" اسی لئے حضرت

---

(۱) الامام الکبیر: ص ۳۱۱　(۲) ایضاً　(۳) مجموعہ ہفت رسائل: ص ۳۳۵

نانوتویؒ کی رائے ہے کہ ایسے روات جو تفقہ میں فائق ہوں ان روایوں پر ترجیح رکھتے ہیں، جو صرف سند اور رجال سے تعلق رکھتے ہوں، چنانچہ فرماتے ہیں "یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہاء کا زیادہ سند میں اعتبار ہوا اور کیوں نہ ہو روایت بالمعنی اکثر ہوتی ہے اور اس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے"۔(۱)

اعلیٰ درجہ کی قوت استنباط:

آپ نے حدیث کے موضوع پر مستقل کوئی تصنیف تو نہیں فرمائی مگر آپ کی دیگر تحریرات میں یا سوالات کے جوابات میں جو آپ نے لکھا ہے اس سے آپ کی استنباطی قوت وصلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، لگتا ہے کہ علوم کا دریا رواں ہے، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ نے لکھا ہے کہ:

"وہ صرف تیراک نہ تھے بلکہ غواص تھے ان کے یہاں یافت سے زیادہ دریافت ہے آپ کی جو بھی تحریر دیکھی جائے اس میں نقل وحکایت کم ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے منجانب اللہ علوم ومعارف کا ورود ہو رہا ہے۔"(۲)

اس کے لئے آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف تحذیر الناس کو اٹھا کر دیکھا جا سکتا ہے جو آپ نے صرف حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اثر "إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ سَبْعَ أَرْضِيْنَ، فِيْ كُلِّ أَرْضٍ آدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوْحٌ كَنُوْحِكُمْ، وَإِبْرَاهِيْمُ كَإِبْرَاهِيْمِكُمْ، وَعِيْسَى كَعِيْسَاكُمْ، وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ "(۳) پر ہونے والے سوال کا جواب تحریر

---

(۱) الامام الکبیر، ص: ۳۱۳ (۲) الامام محمد قاسم النانوتویؒ، حیات، افکار، خدمات، ص: ۲۸۹

(۳) حاکم نیشاپوری، محمد بن عبداللہ، مستدرک علی الصحیحین، تحقیق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا (لبنان: دار الکتب العلمیہ، بیروت: ط۱، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء، رقم الحدیث: ۳۸۲۲، ج: ۲ / ص ۵۳۵)

فرمایا ہے جو ۹۶ رصفحات پر مشتمل ہے، (جو بحمد للہ ابھی ایک سال قبل حجۃ الاسلام اکیڈمی سے تحقیق وتخریج سے مزین ہو کر شائع ہوئی ہے) محبین علوم نانوتوی کیلئے خصوصاً اور تمام اہل علم کے لئے عموماً سرمہ چشم کا درجہ رکھتی ہے۔

اسی کتاب سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے علم حدیث کی توضیح وتشریح میں آپ کا طرز نمایاں ہوگا۔

مثال:(۱)

آپ نے حدیث رسول "علمت علم الأولین والآخرین" (۱) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ اس ارشاد سے ہر خاص وعام کو یہ بات واضح ہے کہ علوم اولین اور ہیں اور علوم آخرین اور؛ لیکن وہ سب علوم رسول اللہ ﷺ میں مجتمع ہیں۔ سو جیسے علم سمع اور ہے، اور علم بصر اور، پر بایں ہمہ قوت عاقلہ اور نفس ناطقہ میں یہ سب علوم مجتمع ہیں۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیائے باقی کو سمجھئے۔ پر ظاہر ہے کہ سمع وبصر اگر مدرک وعالم ہیں، تو بالعرض ہیں؛ ورنہ مدرکِ حقیقی اور عالم تحقیقی وہ عقل اور نفس ناطقہ ہی ہے۔ اسی طرح سے عالم حقیقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور انبیائے باقی، اور اولیاء اور علمائے گزشتہ ومستقبل اگر عالم ہیں، تو بالعرض ہیں۔

نبوت کمالاتِ علمی میں سے ہے:

مگر اس کے ساتھ یہ بھی اہل فہم جانتے ہیں کہ نبوت کمالات علمی میں سے ہے، کمالاتِ عملی میں سے نہیں۔

---

(۱) روح المعانی: ص ۲۵۳ رج ۳

الغرض کمالاتِ ذوی العقول کل دو کمالوں میں منحصر ہیں:

(۱) ایک: ''کمالِ علمی''

(۲) دوسرا: ''کمالِ عملی''

اور بنائے مدح کل انہیں دو باتوں پر ہے۔ چناں چہ کلام اللہ میں چار فرقوں کی تعریف کرتے ہیں:

(۱) ''نبیین'' (۲) اور ''صدیقین''

(۳) اور ''شہداء'' (۴) اور ''صالحین''

جن میں سے انبیاء اور صدیقین کا کمال تو ''کمالِ علمی'' ہے، اور شہداء اور صالحین کا کمال ''عملی''۔ انبیاء کو تو منبع العلوم اور فاعل، اور صدیقین کو مجمع العلوم اور قابل کجھیے، اور شہداء کو منبع العمل اور فاعل، اور صالحین کو مجمع العمل اور قابل خیال فرمایئے۔(۱)

مثال نمبر (۲)

''أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسَى؛ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ''. أَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ''.(۲)

جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس باب میں کافی؛ کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہونچ گیا ہے، پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہوگیا۔ گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں۔

ختم نبوت زمانی کا منکر کافر ہے:

سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا، جیسا تواتر تعداد

---

(۱) تحذیر الناس: ص ۱۸-۱۹

(۲) امام بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، تحقیق مصطفیٰ دیب البغا باب غزوۃ تبوک رقم الحدیث ۴۱۵۴ ج ۴ ص ۱۶۰۲

رکعات فرائض ووتر وغیرہ، باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں۔ سو جیسا اس کا منکر کافر ہے، ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔(۱)

مثال:(۳)

"سَيِّدُ السَّمٰوَاتِ السَّمَاءُ الَّتِي فِيهَا الْعَرْشُ، وَسَيِّدُ الْأَرْضِينَ الَّتِي أَنْتُمْ عَلَيْهَا". (۲)

اس حدیث سے ایک تو مماثلتِ زائدہ معلوم ہوئی، یعنی جیسے وہاں اوپر کا آسمان افضل ہے؛ کیوں کہ عرش اس میں ہے، یعنی اس سے متصل ہے۔ یہاں اوپر کی زمین، یعنی یہ زمین افضل ہے۔ دوسرے بدلالتِ التزامی یہ ثابت ہوا کہ اوپر کے آسمان والے نیچے والوں پر حاکم؛ کیوں کہ افضلیت سماوات ظاہر ہے کہ باعتبارِ افضلیتِ سُکّان ہے۔ سو نوع میں افضلیت اس بات کو مقتضی ہے کہ فرد افضل واکمل موصوف بالذات ہو؛ کیوں کہ موصوف بالذات کی طرف سے تو نوع واحد میں تفاوت افراد ممکن نہیں؛ اس لیے کہ وہ ایک ہوتا ہے، اور جہاں دو نظر آتے ہیں، بایں نظر کے نوع واحد میں تعدد ترکیب کو مقتضی ہے، تاکہ اتحاد امرِ مشترک کی طرف راجع ہو، اور تباین امورِ متباینہ کی طرف۔ پھر انجام کار وحدت لازم آتی ہے۔(۳)

مثال نمبر(۴)

"مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا"(۴)

غرض شہادت اس صورت میں عوارضِ ہمت اور قوتِ عملی میں سے ہوئی۔

---

(۱) تحذیر الناس: ص۲۹-۳۰

(۲) سیوطی، جلال الدین، اسرار الکون، (بیانات غیر مکتوب)، (باب) صفات السموات السبع، ج:۱، ص:۶)

(۳) تحذیر الناس: ص۴۳

(۴) امام بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، تحقیق: مصطفیٰ دیب البغا، (لبنان: دار ابن کثیر، الیمامہ، بیروت، ط.۳، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء)، ج:۶، ص:۲۷۱۴، رقم الحدیث: ۷۰۲۰

اور شہید اول درجہ کا آمر بالمعروف اور ناہی عن ا   ہوا، اور اسی وجہ سے شاید شہید کو شہید کہتے ہیں، یعنی بروز قیامت وہ شاہد ہوگا کہ فلاں شخص حکمِ خدا مان گیا تھا اور فلاں نے نہیں مانا؛ کیوں کہ اس بات کی اطلاع جیسی آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر کو ہوسکتی ہے، اتنی اوروں کو نہیں ہوسکتی۔ اور اس کی گواہی اس باب میں ایسی سمجھیے، جیسے کسی مقدمہ میں ملازمانِ سرکاری کی گواہی۔ چناں چہ اس امت کے حق میں یہ فرمانا:

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ". (۱)

اور ادھر یہ ارشاد:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ". (۲)

غور کیجیے تو اسی جانب مشیر ہے۔(۳)

اثر ابن عباسؓ کی تشریح حضرت نانوتویؒ کی زبانی:

ہر زمین میں اس زمین کے انبیاء کا خاتم ہے، پر ہمارے رسول مقبولِ عالم ﷺ ان سب کے خاتم۔ آپ ﷺ کو ان کے ساتھ وہ نسبت ہے، جو بادشاہِ ہفت اقلیم کو بادشاہانِ اقالیمِ خاصہ کے ساتھ نسبت ہوتی ہے۔

جیسے ہر اقلیم کی حکومت اس اقلیم کے بادشاہ پر اختتام پاتی ہے؛ چناں چہ اسی وجہ سے اس کو بادشاہ کہا۔ آخر بادشاہ وہی ہوتا ہے، جو سب کا حاکم ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہر زمین کی حکومتِ نبوت اس زمین کے خاتم پر ختم ہو جاتی ہے۔

پر جیسے ہر اقلیم کا بادشاہ باوجودیکہ بادشاہ ہے، پر بادشاہِ ہفت اقلیم کا محکوم ہے،

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۱۰   (۲) سورۃ البقرۃ: ۱۴۳   (۳) تحذیر الناس: ص ۲۱-۲۲

ایسے ہی ہر زمین کا خاتم اگرچہ خاتم ہے، پر ہمارے خاتم النبیین ﷺ کا تابع۔

جیسے بادشاہِ ہفت اقلیم کی عزت اور عظمت اپنی اس اقلیم کی رعیت پر حاکم ہونے سے، جس میں خود مقیم ہے، اتنی نہیں سمجھی جاتی، جتنی کہ بادشاہانِ اقالیمِ باقیہ پر حاکم ہونے سے سمجھی جاتی ہے۔ ایسی ہی رسول اللہ ﷺ کی عزت اور عظمت فقط اس زمین کے انبیاء کے خاتم ہونے سے نہیں سمجھی جاسکتی، جتنی خاتمینِ اراضیٔ سافلہ کے خاتم ہونے سے سمجھی جاتی ہے۔

مگر تعجب آتا ہے آج کل کے مسلمانوں سے کہ کس تشدد سے اور خاتموں؛ بلکہ خود زمینوں سے انکار کرتے ہیں۔ تس پر ماننے والوں پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں، یا سنّی نہ ہونے کا اتہام کرتے ہیں۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ نکٹوں نے ناک والوں کو نا کو کہا تھا۔

خلاصۂ بحث

خلاصۂ مکنونِ خاطرِ منکرین اس صورت میں یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کو اتنا عظیم الشان مت سمجھو، کافر ہو جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ سے اتنی محبت نہ کرو، دیکھو! سنی نہ رہو گے، سو اگر یہی کفر و اسلام اور یہی سنت و بدعت ہے، تو اس اسلام سے کفر بہتر ہے، اور سنت سے بدعت افضل۔

امام شافعی علیہ الرحمہ نے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو محبت اہل بیت بوجہ غلو رفض سمجھتے تھے، یوں فرمایا تھا: شعر:

إِنْ كَانَ رَفْضاً حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ

فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ إِنِّي رَافِضِي

ہم ان صاحبوں کے مقابلہ میں جو رسول اللہ ﷺ کے اس قدر ازدیادِ قدر سے کہ ان کے خیال سے کہ سات گنی ہو جائے، یہ برا مانتے ہیں کہ قائلینِ ازدیادِ

قدر کو کافر، یا خارج از مذہب اہلِ سنت سمجھتے ہیں، اس شعر کو بدل کر یہ پڑھتے ہیں:

إِنْ كَانَ كُفْرًا حُبُّ قَدْرِ مُحَمَّدٍ
فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ إِنِّي كَافِرٌ

حضرت نانوتویؒ کے دلائل بمتعلقہ اثر ابن عباسؓ:

دلیلوں کا خلاصہ یہ ہے کہ در بارۂ وصفِ نبوت فقط اس زمین کے انبیاء علیہم السلام ہمارے خاتم النبیین ﷺ سے اس طرح مستفید و مستفیض نہیں، جیسے آفتاب سے قمر، کواکبِ باقیہ؛ بلکہ اور زمینوں کے خاتم النبیین بھی آپ سے اسی طرح مستفید و مستفیض ہیں؛ مگر یہ بات سات زمینوں کے ہونے اور ہر زمین میں انبیاء کے ہونے پر، اور پھر ان انبیاء کے وصفِ نبوت میں معروض اور آپ ﷺ کے واسطہ فی العروض ہونے پر موقوف ہے، جب تک یہ بات ثابت نہ ہو، تب تک ثبوتِ مطلب متصور نہیں۔

سو سات زمینوں کے ہونے پر تو ایک تو آیت: "اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوَات"، اور دوسرے حدیث مسطور، ایک جس کو من اولہ الی آخرہ نقل کر چکا ہوں۔ اور بعد ظہورِ توافقِ آیت وحدیث اس باب میں ان تفسیروں کا قول، جنہوں نے سبعِ ارضین سے سبعِ اقالیم مراد لی ہیں، یا ہفت طبقاتِ زمینِ واحد تجویز کیے ہیں؛ معتبر نہیں ہو سکتا، خاص کر اہل فہم کے نزدیک؛ کیوں کہ آیتِ مذکورہ بھی بے معونت و معائنہ حدیث مسطور تعدادِ اراضی پر، اور وہ بھی بقدر ہفت ایسی صاف دلالت کرتی ہے، جیسے آسمانوں کے سات ہونے پر لفظ سبع سماوات۔ جیسے سبع سموات کے معنی میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ: سات ٹکڑے ہیں، یا سات برج مثلاً، یا سات طبقے، ایک آسمان کے ہیں۔ ایسے ہی یہاں یہ خیال باطل نہ باندھنا چاہیے۔ اور ہر زمین میں انبیاء ہونے کی دلیل بھی قطع نظر اس ثبوت کے جو اوپر مرقوم ہوا، بدستور مضمون سابق ایک

آیت ہے اور ایک حدیث۔ آیت تو یہی:

"اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ، یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ". (۱)

اور حدیث وہ اثرِ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا۔ دلالتِ اثر تو ظاہر ہے، پر دلالتِ آیت میں البتہ اتنی تفصیل نہیں۔ سو یہ اسی پر کیا موقوف ہے، اکثر آیات اسی طرح اپنے مطالب پر دلالت کرتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ:

مَا قَلَّ وَکَفٰی، خَیْرٌ مِّمَّا کَثُرَ وَاَلْھٰی.

یا: مَا قَلَّ وَدَلَّ، خَیْرٌ مِمَّا کَثُرَ وَاَمَلَّ.

سو تمام آیات میں یہی ہے کہ الفاظ قلیل اور معانی کثیر؛ لیکن فہم ہو تو جتنا پورا پورا بیان مطالب کلام اللہ کے الفاظ میں ہوتا ہے، وتنا اور الفاظ اور بیانات تو در کنار، الفاظ حدیث میں بھی نہیں۔ پر تھوڑے سے الفاظ میں مطالب کثیرہ جو مجتمع ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے سے الفاظ جدا نہیں ہوتے، یعنی ہر ایک مطلب کے لیے جدا لفظ نہیں ہوتا؛ اس لیے ہم سے جاہلوں کو بسا اوقات معلوم نہیں ہوتے۔ ہاں بدلالتِ شرحِ صحیح جو احادیثِ صحیحۂ نبوی ﷺ ہیں؛ البتہ بڑے بڑے مطالب تھوڑے تھوڑے الفاظ سے نکل آتے ہیں۔ (۲)

حدیث "عَلَیکُم بِسُنَّتِی" کی تشریح:

تراویح کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکتوب بنام "الحق الصریح" میں حدیث مرسل کی حجیت پر قلم اٹھایا ہے اس میں ایک اعتراض جو غیر مقلد عالم کی طرف

---

(۱) سورہ الطلاق: ۱۲ (۲) تحذیر الناس ص ۷۶ تا ۷۹

سے کیا گیا ہے، کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین میں سنت خلفاء راشدین سے سنت نبوی ہی مراد ہے کیونکہ جب تکرار معرفہ ہوتو وہ متحد المعنیٰ ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے اس کا خوب مسکت جواب دیا ہے اور آیت قرآنی اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ کُمْ وَنِسَاءَ نَا وَنِسَاءَ کُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ سے استدلال کیا ہے۔

نیز اس کتاب میں تراویح اور تہجد کے دو علیحدہ نماز ہونے پر بھی کلام کیا، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ احکام شرعیہ کا ثبوت صرف صحاح ستہ ہی سے نہیں ہوتا، ضعیف اور موضوع روایتوں میں فرق ہے، فضائل اعمال میں ضعیف روایتیں معتبر ہیں اور تراویح بھی فضائل اعمال میں سے ہے۔(۱)

طوفان غیر مقلدیت کا مقابلہ:

حضرت الامامؒ نے ایک خواب دیکھا تھا:

کہ ''کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شے پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر آئی ہے جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے''۔

اس خواب کا تذکرہ حضرت نانوتویؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے فرمایا (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تعبیر خواب میں بڑے مشہور تھے) مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ:

''خواب دیکھنے والے شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہوگی''۔

اس خواب کے ذیل میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''تیرہویں صدی کے آخر میں مسلمانان ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنہ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آگیا تھا

(۱) الامام محمد قاسم نانوتویؒ حیات، افکار، خدمات: ص ۲۹۳-۲۹۴

اور قریب تھا کہ یک جہتی کا یہ شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہو جائے شتر بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ سلف کے سارے کارنامے شاید تہہ و بالا ہو کر رہ جاویں، اس کڑے وقت اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کیا کام کیا، لیکن اتنی بات تو سب کے سامنے ہے کہ فرقہ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہتے ہیں، ان حملوں کے مقابلہ میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے، انصاف کی بات یہی ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔"(۱)

حاشیہ بخاری آپ کے گوہر بار قلم سے:

اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری کے آخری پاروں پر حاشیہ تحریر کرنے کے لئے حضرت محدث سہارنپوریؒ نے آپ کا انتخاب فرمایا یہ انتخاب حقیقۃً حضرت نانوتویؒ کے جوہر اور حضرت محدث سہارنپوریؒ کے جوہر شناسی کی واضح دلیل ہے۔

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے مولانا عبدالرحمٰن صدیقی امروہوی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس موقعہ پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ حواشی صحیح بخاری کا اس قدر اہم کام ایک نوعمر لڑکے کے سپرد کر دیا، تو حضرت محدث سہارنپوریؒ نے جواباً عرض کیا تھا:

"تم لوگ بخاری کے جتنے مشکل مقامات ہوں ان پر نشان لگا لو پھر ان سے (مولانا نانوتوی) دریافت کرلو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر ان

(۱) سوانح قاسمی: ج ۱، ص ۱۳۴

مقامات کا حاشیہ منگوا کر دکھایا تو مولانا نانوتویؒ نے جو جو احتمالات پیدا کر کے
ان کے جوابات دیے تھے وہ احتمالات اور شبہات ان حضرات کے احتمالات
سے بھی زیادہ تھے یہ دیکھ کر وہ لوگ الامام الکبیر کے تبحر علمی کو مان گئے''۔(۱)

حضرت نانوتویؒ نے اس حاشیہ میں اسناد ورجال اور معانی ومفاہیم دونوں اعتبار سے بھر پور اور جامع کلام کیا ہے ان میں کئی مواقع وہ ہیں جہاں امام بخاری نے احناف کو ہدف تنقید بنایا ہے، ان مواقع پر آپ نے احناف کی طرف سے پوری وکالت کی ہے اور بخاری کے اعتراضات وتنقیدات کا علمی جواب دیا ہے جو علم حدیث میں آپ کی عبقریت پر دال ہے۔

اصول حدیث کے بعض مسائل:

لطائف قاسمیہ کا دوسرا خط جو عبدالرحیم خان صاحب کے نام ہے اس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ بیس رکعت والی مؤطا کی روایت مرسل ہے اور حدیث مرسل محدثین کے یہاں مقبول نہیں ہے، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''مؤطا کی روایت پر طعن کی بنیاد یہ ہے کہ یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا سبحان اللہ! کیا دلیل ہے اور کیا دعویٰ ہے؟ طعن کا خلاصہ یہ نکلا کہ تابعین کی مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہونا چاہئے، پہلے اس کو ثابت کرنا چاہئے پھر یزید بن رومان کی روایت کو مسترد کرنا چاہئے، تابعین کی مرسل روایات کے معتبر نہ ہونے کا اصول اگر خود تراشیدہ ہے تو اسے کون پوچھتا ہے اور اگر مراسیل صحابہ کی طرح مراسیل تابعین بھی معتبر ہیں، بلکہ سند سے زیادہ مرسل کا اعتبار ہے کیونکہ اسناد کو

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار وباقیات ومتعلقات۔ ص ۷۳-۷۴

ترک کرنا روایت پر اپنے اعتماد کی دلیل ہے اور اسناد کا ذکر کرنا سننے والے کے فہم پر چھوڑنا ہے، گویا یہ کہہ دیا گیا کہ ذمہ داری راوی پر ہے، اگر تقلید سے عار ہے تو امام ابن صلاح کا قول دیوار پر مارنا چاہئے اور اگر ابن صلاح کی تقلید جائز ہے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے کیا قصور کیا ہے۔"(۱)

اس مکتوب میں حضرت نانوتویؒ نے اصول حدیث کے اور دیگر مسائل پر بھی بڑی مبصرانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے، جس سے آپ کی اس فن پر بھی گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح تحذیر الناس میں صفحہ ۶۰/ پر شاذ اور مخالفت ثقات وغیرہ کی بحث پر بڑی جامع گفتگو کی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی آپ کے مصنفات و مکاتیب میں مختلف مقامات پر بڑی تحقیقی بحثیں ملتی ہیں، جن سے اصول حدیث میں آپ کے نہج پر مکمل روشنی ملتی ہے۔

❁ ❁ ❁

(۱) لطائف قاسمیہ: ص ۹

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت فقیہ

الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ برصغیر کی ان عظیم شخصیات میں سے ہیں، جنہوں نے اپنے دور پر اور بعد کے ادوار پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں، حضرت نانوتویؒ تحریک ولی اللہی کا امتداد تھے، فکر قاسمی کے بنیادی عناصر فکر ولی اللہی سے مستفاد وماخوذ ہیں فقہ اسلامی کے بارے میں مولانا نانوتویؒ کے رویہ اور موقف میں فکر ولی اللہی کا عکس بہت صاف نظر آتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے اپنی تعلیمی تحریک میں کتاب وسنت کی تعلیم کو ان کے شایانِ شان مقام دیا، صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں کو نصاب درس میں شامل کیا، درس کا وہ انداز اختیار کیا کہ کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا ربط ورشتہ کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے اور قرآن وحدیث قندیل کا کام دیں ان کی روشنی میں الجھے ہوئے مسائل سلجھائے جائیں، خلافی مسائل میں حضرت نانوتویؒ کے مکتوبات اور ان کی تحریریں اپنے اندر اجتہادی شان رکھتی ہیں، کتاب وسنت کی عطر بیزیاں قدم قدم پر نمایاں ہیں اور ایسے لطیف استنباط پائے جاتے ہیں جن کی نظیر فقہائے متقدمین کے یہاں بھی نہیں ملتی۔

طریقۂ استدلال:

حضرت نانوتویؒ کا طریقہ استدلال اکثر وبیشتر اصولی ہوتا ہے، مثلاً ’’قراءت فاتحہ خلف الامام‘‘ کے مسئلہ میں الامام الکبیر کا نقطۂ نظر ہے کہ نماز میں اصل حیثیت امام کی ہے مقتدی کی حیثیت محض تابع کی ہے خود انہی کے الفاظ ہیں:

"امام موصوف بالذات بالصلوٰۃ ہے اور مقتدی موصوف بالعرض"۔(۱)

اور قاعدہ ہے کہ احکام شرعیہ کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصل اور حضرت نانوتویؒ کی زبان میں موصوف بالذات ہوں، اس طرح گویا مقتدی اس آیت کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔

شانِ فقاہت:

حضرت نانوتویؒ نے "لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے متعلق ایک اور نکتہ اخذ کیا ہے اور یقیناً اس سے آپ کی شانِ فقاہت آشکارا ہوتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

> "صلوٰۃ کا اطلاق کم سے کم ایک رکعت پر ہوتا ہے گویا صلوٰۃ کا طول ایک رکعت ہے جس کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کافی ہے تو اسی طرح چونکہ مقتدی امام کا تابع ہے اس لئے امام کے ساتھ مل کر مقتدیوں کی نماز ایک نماز ہے، لہذا چونکہ اس حدیث میں ایک صلوٰۃ کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کو کافی قرار دیا گیا ہے اس لئے ان دونوں کی مجموعی نماز کے لئے ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہوجائے گی جو امام کی قراءت سے پوری ہوجاتی ہے۔"(۲)

مسئلہ جمعہ فی القریٰ پر حضرت نانوتویؒ کا استدلال:

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کتاب وسنت کے غواص ہیں اور اپنی ذہانت اور قوت اخذ واستنباط سے الفاظ کی تہہ میں جاکر ایسے ایسے معانی ڈھونڈھ نکالتے ہیں کہ عام اہل علم کو شاید اس کی ہوا بھی نہ لگے۔

"فیوض قاسمیہ" جو حضرت کے مکاتیب کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو ۱۵ر خطوط پر

(۱) الامام الکبیر: ص:۳۱۱ (۲) مستفاد: الامام الکبیر: ص۳۱۱-۳۱۲

مشتمل ہے ان میں ایک مکتوب ''جمعہ فی القریٰ'' سے متعلق ہے، اس میں سورۂ جمعہ کی ایک ہی آیت: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (۱) سے حضرت نانوتویؒ نے وجوب جمعہ اور صحت جمعہ سے متعلق شرائط کو ثابت کیا ہے اور اس آیت سے دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ میں حنفیہ کی طرف سے استدلال کیا ہے، یہ مکتوب بھی حضرت نانوتویؒ کے تبحر علمی کی ایک مضبوط دلیل ہے (اہل علم کو یہ مکتوب ضرور پڑھنا چاہیے)

مسائل شرعی کی حکمت آفرینیاں:

اس میں شبہ نہیں کہ آپ متکلم اسلام تھے مگر علم کلام میں آپ نظری اور معقولی بحثوں کے بجائے محسوسات ومشاہدات سے مابعد الطبعی امور پر ایسا استدلال کرتے تھے کہ نظری اور معقولی چیزیں محسوس ومشاہد معلوم ہونے لگتی تھیں جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں مثلاً خود نماز ہی کے احکام میں قیام، رکوع وسجود، رات میں جہری اور دن میں سری قراءت، سلام، قبلہ کی شرعی حیثیت اور اس کی مصلحت وغیرہ پر ایسی گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی جگہ غالباً ایسی دل کو چھوتی اور عقل کو قائل کرتی ہوئی بات اس فن (اسرار شریعت) کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے یہاں بھی نہیں ہے۔

فقہی ذوق ومزاج:

حضرت نانوتویؒ درساً اور عملاً حنفی تھے، بحث وتحقیق کی روشنی میں مذہب حنفی کو راجح سمجھتے تھے، لیکن دوسرے ائمہ مسالک اور فقہی مذاہب کا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے جیسا کہ مذہب منصور میں لکھا ہے:

---

(۱) سورۃ الجمعۃ: ۹

''عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے۔''(۱)

نرے مقلد اور لکیر کے فقیر نہیں تھے، بلکہ طبیعت و مزاج میں کافی توسع تھا بعض مسائل میں ان کا نقطۂ نظر فقہ حنفی کے عموی نقطۂ نظر سے مختلف تھا، مثلاً مسئلہ ''جمعہ فی القریٰ'' میں عام علماء احناف کی طرح آپ کے یہاں شدت نہیں تھی۔

مسائل فقہیہ میں اعتدال کی چند مثالیں:

مثال:(۱)

حضرت نانوتویؒ کے یہاں تمام مسائل میں مکمل اعتدال نظر آتا ہے اور ساتھ ہی استنباط واستدلال میں بھی عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے، مذکورہ بالا مسئلہ ''قراءت فاتحہ خلف الامام'' ہی کو لے لیجئے، اس مسئلہ میں سارے دلائل وبراہین کے بعد لکھتے ہیں:

''ترک قراءت فاتحہ خلف الامام قراءت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے''۔(۲)

گویا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ترک قراءت اولیٰ ہے، لیکن قراءت فاتحہ خلف الامام بھی ناجائز نہیں ہے، یہ ہے اعتدال قاسمی۔''

مثال:(۲)

دوسرا مسئلہ ''جمعہ فی القریٰ'' کا ہی لے لیجئے ابھی گذرا کہ آیت: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ الخ میں نماز جمعہ کے مسئلہ کو مذہب حنفیہ کے مطابق مدلل ومبرہن کیا اور تشفی بخش کلام کیا مگر اخیر میں یہ بھی فرمادیا ''اگر کسے در دیہے جمعہ قائم کند دست دگر یانش نہ زنند'' کہ یہ مسئلہ ظنی ہے اس لئے اگر کوئی شخص دیہات میں جمعہ کی نماز قائم کردے تو الجھنا یا جھگڑنا نہیں چاہئے۔

(۱) مذہب منصور: ج ۲ رص ۱۹۲ توثیق الکلام، ص: ۱۶

مثال: (۳)

اعتدال کی تیسری مثال میں حضرت نانوتویؒ کی اس عبارت کو پڑھئے اور دیکھئے کیا ہے کمالِ اعتدال:

''ہم کو دیکھئے باوجود توجیہاتِ مذکورہ اور استماعِ تشنیعاتِ معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریباں نہیں ہوتے، بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں؟ امام اعظمؒ بھی باوجود عظمتِ شان امکان خطاء سے منزہ نہیں کیا عجب کہ حضرت امام شافعیؒ صحیح فرماتے ہوں گے اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں''۔(۱)

مسلک احناف کی وکالت:

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ نے بخاری شریف کے آخری پانچ پاروں کا کام آپ کے سپرد کردیا، امام بخاریؒ نے اخیر کے ان پاروں میں امام ابوحنیفہؒ پر ''قَالَ بَعْضُ النَّاسِ'' کے ذریعہ اہم اعتراضات کی نشاندہی کی ہے اور اس کی جانب اشارات کئے ہیں اور امام بخاری کی روایات کا جو وزن ہے اس سے سارا عالمِ اسلام واقف ہے، اس لئے ان اعتراضات کے جوابات پورے ذخیرۂ حدیث پر طائرانہ نظر ڈالے بغیر ممکن نہیں تھا اور روایتوں کی ایسی معقول اور مدلل توجیہ پیش کرنی ضروری تھی کہ مسلک احناف کا منشاء شریعت کے مطابق ہونا ثابت ہوجائے، حضرت نانوتویؒ نے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیا اور کوئی بات بغیر سند اور حوالہ کتب کے نہیں کہی نہ روایتوں کی بے جا تاویل کی اور نہ ان سے انکار بلکہ دوسری مستند روایتوں کی روشنی میں امام بخاریؒ کی اس روایت کا ایسا مفہوم پیش کیا ہے جو مسلک احناف کے مطابق ہے

---

(۱) توثیق الکلام: ص ۱۶

اور بخاری کا درجہ استناد بھی اپنی جگہ برقرار رہ جاتا ہے۔ اس سے حدیث وفقہ دونوں میں آپ کے مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے۔(۱)

مذہب حنفی کی تقویت:

حضرت نانوتویؒ نے خواب دیکھا تھا:

''کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شئی پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر آئی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے''۔

اس خواب کو انہوں نے مولانا محمد یعقوب صاحب (برادر حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ) سے بیان کیا تو حضرت نے تعبیر دی:

''کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ہوگی اور وہ پکا حنفی ہوگا اور اس شخص کی خوب شہرت ہوگی''۔

امیر شاہ خانصاحب فرماتے ہیں کہ:

مولانا نے مجھ سے یہ خواب بیان فرمایا اس وقت میں اکیلا تھا اور حضرت کے پاؤں دبا رہا تھا اور مولانا نے بے تکلف مجھ سے اپنا نام لیا تھا۔''(۲)

ہندستان میں غیر مقلدیت کی بنیاد:

ہندستان میں غیر مقلدیت کا زور حضرت نانوتویؒ کے دور میں بڑھا تھا، اس لئے تین چار مسئلے قراءت خلف الامام، امین بالجہر، رفع یدین اور رکعات تراویح کی بحثیں اسی وقت ابھری تھیں آپ نے جزئی مسائل ہونے کی بنیاد پر توجہ نہیں دی، لیکن غیر مقلدین کا انداز جب متعصبانہ اور جارحانہ ہونے لگا اور دریدہ دہنی کی انتہا

(۱) دیکھئے: مولانا قاسم نانوتویؒ حیات اور کارنامے: ص ۷۵-۷۶

(۲) ارواح ثلاثہ: ص ۱۷۶، حکایت: ۱۶۸

ہونے لگی اور فقہ حنفی کو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ وغیرہ کی ذاتی آراء کہا جانے لگا تو آپ نے قلم اٹھایا اور ان مسائل پر اپنے مخصوص انداز میں لکھا اور صحیح معنوں میں حق ادا کر دیا، اسی کے بعد توثیق الکلام، الحق الصریح، لطائف قاسمی، الدلیل المحکم وغیرہ مکاتیب تحریر کئے گئے۔ یہ تحریرات بھی آپ کی شان فقاہت کو واضح کرتی ہیں۔

نصاب مدارس میں فقہ کی غیر معمولی اہمیت:

حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کا نصاب مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ فقہ اسلامی کا رشتہ کتاب وسنت سے خوب مضبوط ہو اور اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا مزاج پیدا ہو فقہ کا علم محض جزئیات یاد کرنے تک محدود نہ رہ جائے بلکہ اجتہاد کے سرچشموں تک پہونچا جائے اور فقہ اسلامی کے کارواں کو آگے بڑھایا جائے۔(۱)

پھر دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم دیوبند ہندستان میں فقہ اسلامی کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، یہی نہیں بلکہ یہاں سے فقہ حنفی کی تائید کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے آتے آتے اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے پورے اعتماد کے ساتھ اعلان فرمایا:

> ’’میں نے حنفیت کو اس درجہ مستحکم کر دیا ہے کہ اب انشاء اللہ سو سال تک اس کی بنیادیں غیر متزلزل رہیں گی۔(۲)

ایک غیر مقلد کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کا مباحثہ:

سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ (مشہور غیر مقلد) مولوی محمد حسین نے حضرت

---

(۱) الامام محمد قاسم نانوتویؒ حیات، افکار، خدمات: ص ۲۷۰

(۲) نقش دوام: ص ۱۷۳

نانوتویؒ کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں، چنانچہ مولانا موصوف الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، اجازت دے دی گئی، جہاں تک یاد پڑتا ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سننا چاہئے، میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر یہ حضرات بیٹھے تھے، الامام الکبیر نے مولانا سے فرمایا:

> ''دیکھئے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمائی ہو اس میں دو باتوں کا خیال رکھیں ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان کرنا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا، دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں گے وہ امامؒ ہی کا ہونا چاہئے یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شافعیؒ نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے میں ان کا مقلد نہیں''؟

آپ جیسا شخص مقلد؟

چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ بہت سے مختلف فیہ مسائل زیر بحث آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب احناف بیان فرماتے اور الامام الکبیرؒ دلائل سے اسے ثابت کرتے الامام الکبیر کی تقریروں کے درمیان مولانا محمد حسین صاحب جھوم جھوم جاتے اور بعض اوقات تو جوش میں سبحان اللہ! سبحان اللہ! کہتے کہتے کھڑے ہونے کے قریب ہو جاتے، جب گفتگو ختم ہو چکی تو

مولوی محمد حسین صاحب (مشہور غیر مقلد عالم) کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ:

"مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی بایں زور علم وفراست وقوت استنباط تقلید کے کیا معنی؟ جواب میں حضرت شیخ الہندؒ کہتے تھے: میں نے سنا الامام الکبیرؒ ارشاد فرمارہے ہیں' اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو یعنی مدعی اجتہاد ہو"۔(۱)

حاشیہ بخاری میں فقہی ابحاث:

بخاری شریف کے حاشیہ پر جو آپ نے کام کیا ہے اس میں جو مباحث فقہیہ آئی ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند یہ ہیں:

قضاء قاضی ظاہراً نافذ ہوگا یا باطناً، ص:۱۰۳۲-۱۰۶۵ پر، پڑوسی کے لئے حق شفعہ ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں احناف کا نقطۂ نظر اور امام بخاری کی تنقید کا جواب ص ۱۰۳۲ پر، حانث ہونے سے پہلے کفارۂ قسم کی ادائیگی۔ص ۱۰۱۸ پر۔قضاء علی الغائب ص ۱۰۶۴ پر، غلام مدبر کی بیع ص ۱۰۶۶ پر، صوم وصال کی ممانعت ۱۰۷۵ پر نہایت مبصرانہ ومحققانہ بحث ملتی ہے، جس سے آپ کی فقیہانہ شان سامنے آتی ہے۔

مباحث فقہیہ پر مشتمل مکتوبات

(۱) **اسرار الطهارة** (اردو) اس مکتوب میں آپ نے وضو کی حکمتیں بیان کی ہیں جو صفحہ ۴ر سے ۳۴ر تک بحث پھیلی ہوئی ہے۔

(۲) **فوائد قاسمیه**: (فارسی) اس مکتوب میں آپ نے امام کے پیچھے مقتدی پر سورۂ فاتحہ ہے یا نہیں صفحہ ۱۴۷ر سے ۱۵۴ر تک اس کی تحقیق پیش کی ہے۔

(۳) **فیوض قاسمیه**: (فارسی) مغرب، عشاء اور فجر تین نمازوں میں

(۱) سوانح قاسمی: ص ۲۲-۲۳ر ج ۲

جہری قراءت کی وجہ بیان کی ہے۔

(۴)**لطائف قاسمیہ**:(فارسی)صفحہ۲۲/تا۲۸/جمعہ کے احکام محققانہ انداز میں مدلل بیان کیا ہے۔

(۵)**مصابیح التراویح**:(فارسی)صفحہ۲/تا۸۴/تراویح کی بیس رکعات کو ثابت کیا ہے۔

(۶)**لطائف قاسمیہ**: (فارسی)صفحہ۶/تا۱۳/پر تراویح کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت کیا ہے۔

(۷)**فرائد قاسمیہ**: (فارسی)صفحہ۱۶۶/تا۱۶۹/رمضان میں جماعت کے ساتھ وتر کی نماز پڑھنے پر تحقیقی کلام کیا ہے۔

(۸)**فرائد قاسمیہ**:(فارسی)صفحہ۱۶۹/تا۱۷۲/پر سرقہ اور غصب کی حقیقت اوران دونوں کے درمیان فرق پر کلام کیا ہے۔

(۹)**فرائد قاسمیہ**:(فارسی)صفحہ۱۶۴/تا۱۶۵/پر حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کے ممانعت کی وجہ پر کلام کیا ہے۔

(۱۰)**لطائف قاسمیہ**:(اردو)صفحہ۱۹/تا۲۰/پر رہن کی زمین سے جو فائدہ اٹھایا جائے وہ سود ہے یا نہیں اس پر کلام کیا ہے۔

(۱۱)**قاسم العلوم**:(فارسی)صفحہ۱/تا۳۵/ہندوستان میں سود لینے کے عدم جواز پر کلام ہے۔

(۱۲)**فرائد قاسمیہ**:(فارسی)صفحہ۱۰۴/تا۱۲۳/مال حرام اوراس کی گندگی سے متعلق بحث ہے۔

(۱۳)**مکتوبات قاسمیہ**:(اردو)صفحہ۳۴/تا۳۸/اللہ تعالیٰ کے نظام میں تقسیم کار کی حکمت سے متعلق بحث ہے۔

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بحیثیت مدرس

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جن کا مشغلہ علم وعمل عبادت وریاضت، ارشادو تبلیغ، پند وموعظت اور جہاد واجتہاد تھا، وہ علم کے جس اونچے مقام پر فائز تھے، جوروز روشن کی طرح عیاں ہے، وہ علم کے اس بلند مقام پر پہنچ کر اگر اپنے علوم سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچاتے تو زندگی میں ایک بڑا خلا محسوس کیا جاتا، لیکن بحمد للہ آپ کی حیات میں تدریس کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں، جن کے مستفیدین اور تلامذہ وقت کے آفتاب ومہتاب اور اپنے عصر کے مرجعِ عوام وخواص نظر آتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی شان تدریس:

حضرت نانوتویؒ کے درس سے کما حقہ وہی طلبہ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو ذی استعداد اور ذکی وذہین ہوں اور پہلے سے کتاب کا بغور مطالعہ کر چکے ہوں۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

> ’’میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں حاضر ہوتا تھا اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں غایت مشکل ہوتی تھیں، شاہ صاحبؒ کے یہاں جو آخری جواب ہوتا تھا وہ حضرت اول ہی مرتبہ فرمادیتے تھے میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا۔(۱)

دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ میں چند دن چھتہ کی مسجد میں اقلیدس کا درس دیا ہے دوران درس میں جب طلبہ کو کسی شکل کے سمجھانے کی ضرورت پیش آتی تو بغیر آلات کی

(۱) ارواح ثلاثہ حکایت: ۳۴، تاریخ دارالعلوم: ج ۱ ص ۱۱۳

مدد کے انگلی سے زمین پر شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے دراں حالیکہ ریاضی اور اقلیدس کا مطالعہ آپ نے دہلی کالج میں بغیر استاذ کی رہنمائی کے بطور خود کیا تھا۔ (۱)

دقیقہ سنجی ونکتہ آفرینی:

مولانا یعقوب نانوتویؒ نے حضرت نانوتویؒ کے درس مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ایک بار مولوی صاحبؒ نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب بیان ہوتے''۔ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں پر حضرت والا مجبول ومخلوق تھے سیدھی سادی چیزوں سے بھی ان کا دل اور ان کا دماغ حیرت انگیز اور گہرے نتائج نکالنے کا عادی تھا، آپ میں ارادت وافکار کی تعبیر وتجبیر کا بھی کافی حسن سلیقہ قدرت کی طرف سے دیعت کیا گیا تھا، جس کا اندازہ آپ کی کتابوں سے ہوتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ سنگین سے سنگین حقیقتوں کو اپنی بعض کتابوں میں آپ نے موم بنا کر رکھ دیا ہے، ''حجۃ الاسلام'' اور ''تقریر دلپذیر'' اس کی مثال کیلئے کافی ہے، اسی طرح وہ موم کو پتھر کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے، جس کی عمدہ مثال ''آب حیات'' ہے۔

عمومی درس سے احتراز:

علم کے لوازم امامت وخطابت افتاء وغیرہ سے آپ کا احتراز ارادی تھا ٹھیک اسی طرح درس وتدریس کے مشغلہ سے بھی قصداً پرہیز وگریز کے لئے آپ نے ایسا رنگ اپنی تقریر کا اختیار فرمایا ہو جو کہ برتر از فہم وتعقل تھیں، اس میں بھی اضطرار سے زیادہ دخل آپ کے ارادی فیصلہ کا معلوم ہوتا ہے۔

(۱) تاریخ دارالعلوم: ج ا رص ۱۱۴ (۲) سوانح عمری، مولانا یعقوب تھانوی، ص: ۳۵

درس مثنوی مولانا رومؒ:

بہر حال آپ نے مختلف کتابوں کا مختلف موقعوں پر درس دیا جس کا ایک مختصر خاکہ پیش خدمت ہے:

مولانا یعقوب نانوتویؒ نے اپنی مختصر کتاب میں حضرت نانوتویؒ کے مثنوی مولانا روم پڑھانے کا ذکر کیا ہے کہ:

''ایک بار مولوی صاحبؒ نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی، دو چار شعر ہوتے، اور عجیب وغریب بیان ہوتے''۔(۱)

یعنی سلوک ومعرفت کے ایسے نکات وحقائق بیان کئے جاتے تھے کہ عام طور پر متصوفین کے ذہن کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔

درس آب حیات:

حضرت شیخ الہند کا بیان ہے کہ:

''میں نے آب حیات (مؤلفہ حضرت نانوتویؒ) وغیرہ حضرت سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے''۔(۲)

ان واقعات وروایات سے پتہ چلتا ہے کہ عام مدرسین کی طرح نصاب کی مروجہ کتابوں کا درس نہیں دیتے تھے، بلکہ شوقین اور شائق اہل علم کو ان کے ذوق کے مطابق درخواست کرنے پر وہ کتابیں بھی پڑھاتے تھے جن کا درسیات کے نصاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، آب حیات حضرت نانوتویؒ کی خود تصنیف ہے جس کا موضوع مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس کا انداز بحث خالص متکلمانہ ہے اور سارے اصطلاحی الفاظ وہی صغریٰ کبریٰ اور مقدمات کی ترتیب پھر ان سے نتائج کا استخراج سب کچھ وہی ہے جو

(۱) سوانح عمری، مولانا یعقوب نانوتویؒ: ص ۳۵ (۲) سوانح قاسمی: ج ۱ رص ۴۴۴

متکلمین کی کتابوں میں ہے، اس لئے کتاب اردو میں ہونے کے باوجود اس کو پڑھ کر سمجھ لینا کچھ آسان نہیں ہے، یہ کتاب ذہانت وفراست کا امتحان بن جاتی ہے۔

درس ملا جلال:

حضرت نانوتویؒ کے ایک شاگرد مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی، حیدر آبادی فرماتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتویؒ نے مجھ کو ملا جلال پڑھایا ہے''۔

درس بخاری:

انہوں نے اسی کے ساتھ یہ تفصیل بھی دی ہے کہ مجھے ملا جلال پڑھنے کا موقعہ اس زمانہ میں ملا جب آپ کا قیام نانوتہ میں تھا، اور اس زمانہ میں آپ نانوتہ میں بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے:

''مولوی محی الدین خاں مرادآبادی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا رحیم اللہ بجنوریؒ حاضر تھے، ان کے اسباق میں بھی میں ساعت کرتا تھا۔''(۱)

یہ بخاری شریف کا درس تھا جس میں شرکت کا حال خود مولانا یعقوب نانوتویؒ نے اپنی مختصر کتاب میں بیان کیا ہے:

درس اقلیدس:

''تاریخ دارالعلوم'' کے مصنف نے حضرت نانوتویؒ کے اقلیدس پڑھانے کا ذکر کیا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ:

''دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ میں چند دن چھتہ مسجد میں اقلیدس کا

(۱) سوانح قاسمی: ج ۱ ص ۴۳۴

درس دیا ہے اور اس درس میں جب طلبہ کو کسی شکل کے سمجھانے کی ضرورت پیش آتی تو بغیر آلات کی مدد کے انگلی سے زمین پر شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے"۔(۱)

مسند درس بھی کسی ایک جگہ نہیں بچھی بلکہ آپ کا حلقہ درس کبھی نانوتہ کبھی دیوبند کی چھتہ مسجد میں کبھی میرٹھ میں جہاں کچھ عرصہ قیام ہوا وہیں طلبہ کھینچ کر چلے آئے اور اسباق شروع ہو گئے، مولانا رحیم اللہ بجنوریؒ (جو حضرت کے مشہور تلامذہ میں ہیں) کا خود بیان ہے کہ میں جب حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان دنوں نانوتہ میں بخاری کا درس دیا کرتے تھے میں اس میں شریک ہو گیا ایک دن اتفاقاً مجھے وضو نہ تھا اور سبق میں جا کر بیٹھ گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ہاتھ سے منع فرما رہے ہیں اور پھر بلا کر فرمایا کہ:

''میاں! صحیح بخاری میں تو ایسا نہ چاہئے کہ بلا وضو بھی آدمی بیٹھ جائے''۔(۲)

شاگردوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ:

آپ اپنے شاگردوں کا بے حد احترام و خیال کرتے اگر کوئی طالب علم غیر حاضر ہوتا یا تعلیم کے انقطاع کی خبر ملتی آپ بے چین ہو جاتے اور اس کے گھر تک جا کر اسے منا کر واپس لاتے۔

دہلی کے مشہور مدرسہ عبدالرب کے صدر مولانا عبدالعلی کو حضرت نانوتویؒ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہے غالباً ''حمد اللہ'' یا ''شمس بازغہ'' حضرت کے یہاں شروع ہوئی، مولانا عبدالعلیؒ صاحب نے عبارت پڑھنی شروع کی حضرت نانوتویؒ کو کتاب کی پھسپھسی اور بے مغز باتوں سے ایسی گرانی ہوئی کہ چہرہ کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا،

(۱) تاریخ دارالعلوم: ج۱ص۱۱۳، حیات اور کارنامے: ص۱۰۴
(۲) سوانح قاسمی: ج۱ص۳۳۴، حاشیہ۴

جھنجھلا کر فرمایا جو کچھ پڑھایا یہ تو واضح ہے اب تم قاسم کی سنو نہ ترجمہ کرایا گیا نہ مطلب سمجھایا گیا، بلکہ اسی موضوع پر ایسی تقریر شروع فرمائی کہ تین روز تک چلتی رہی لیکن مولانا عبدالعلی کے سمجھ میں کچھ نہیں آئی الغرض چند دنوں درس سے غائب ہو گئے جب حضرت کو معلوم ہوا ان کے گھر عبداللہ پور ضلع میرٹھ تشریف لے گئے اور روٹھے ہوئے شاگرد کو منا کر واپس لایا۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کی کفش برداری واقعی کفش برداری کی ہمت اپنے اندر رکھتے تھے، ارواح ثلاثہ میں مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے:

''جس طالب علم اور شاگرد کے اندر تواضع دیکھتے تھے تو اس کے جوتے اٹھالیا کرتے تھے۔(۱)

اپنے ایک شاگرد مولانا فخرالحسن صاحب کو خطاب کر کے ایک خط میں لکھا کہ:

''زیر قلم کشیدہ نزد آں عزیز رسانم شاید بدعائے یادم کنند''۔(۲)

تعلیم کے ساتھ تربیت پر خصوصی توجہ:

جیسا کہ یہ بات گذر گئی کہ مولانا رحیم اللہ بجنوری بغیر وضو حلقہ درس میں بیٹھ گئے تو آپ نے تنبیہ فرمائی، ٹھیک اسی طرح جہاں متواضع طلبہ کی آپ خود جوتیاں اٹھالیا کرتے تھے وہیں بغرض تربیت ایسے طلبہ سے جوتیاں اٹھواتے بھی تھے جن کے اندر کبر و بڑائی پاتے تھے، لکھا ہے کہ:

''جس طالب علم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اس سے کبھی کبھی جوتے اٹھوایا کرتے تھے''۔(۳)

---

(۱) ارواح ثلاثہ: ص ۲۰۶، سوانح قاسمی: ج۱/ ص ۳۳۲

(۲) ایضاً (۳) سوانح قاسمی: ج۱/ ص ۴۴۰

اصلاح وتزکیہ کا ایک اہم واقعہ:

مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ جو امروہہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے اور ناز ونعمت میں پلے ہوئے تھے، وہ خود اپنا واقعہ نقل کرتے ہیں جب میں تعلیم کے لئے حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جولاہہ نے حضرت سے دعوت قبول کرنے کی فرمائش کر کے عرض کیا کہ فقیر کے غریب خانہ کو رونق بخشی جائے اس زمانہ میں مسلمانان ہند کی ذہنیت شرافت ورذالت کی گھناؤنی گندگیوں سے اس حد تک ماؤف ہو چکی تھی، کہ غریب جولاہہ کے گھر جا کر کھانا کھانے کی درخواست کی منظوری سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس وقت صادر ہوئی، تو مولانا احمد حسن کا بیان ہے کہ:

> ''مجھ کو اتنا ناگوار ہوا کہ جیسے کسی نے گولی ماردی'' مگر تلاوت آیات وتعلیم حکمت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی سیدنا الامام الکبیر کے سپرد ہوا تھا، اسی وقت سے مولانا احمد حسن کے اندر اُترنے والی اس گولی کی طرف سے فکر پیدا ہوئی، فراست ایمانی سے حضرت والا نے مولانا امروہوی کے اس تأثر کو بھانپ لیا کہتے تھے کہ اس دن کے بعد سے یہ قاعدہ ہی حضرت نے مقرر کرلیا کہ دعوت کرنے والوں سے یہ شرط بھی کراتے کہ مولوی احمد حسن کو بھی میں ساتھ لاؤں گا پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کو کس کس کے گھر جانا پڑا اور بقول ان ہی کے ''جب بالکل میرے قلب سے ناگواری نکل گئی تب مولانا نے میری دعوت کی شرط کو ترک کردیا'' اور یوں دل میں ان کے جو گولی اتر گئی تھی اس کو نکال کر تزکیہ کے فرض کو انجام تک حضرت والا نے پہونچایا۔(۱)

---

(۱) سوانح قاسمی: ج ا رص ۴۴۰

جذبۂ خوش لباسی کا حشر:

مولانا احمد حسن صاحب ہی اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے، گذر چکا ہے کہ مولانا احمد حسن کی پرورش ناز ونعمت کے ماحول میں ہوئی تھی، وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ:

''میں بڑا خوش لباس تھا'' اب سنئے اسی ''خوش لباسی'' کے جذبہ کا حشر، ارواح میں ان ہی کا یہ بیان درج کیا گیا ہے کہ:

''سیدنا الامام الکبیرؒ کی خدمت میں کسی نے گاڑھے کا ایک تھان پیش کیا، قبول کرلیا گیا، اور درزی کو بلوا کر حکم دیا گیا کہ ایک انگرکھا تو میرا اس سے تیار کردو، اور اسی کے ساتھ ان کو (یعنی مولانا احمد حسن) کو بلا کر درزی سے فرمائش کی گئی، کہ دوسرا انگرکھا ان کے لئے اسی کپڑے سے نکالو، کپڑا کافی تھا، درزی دونوں انگرکھے سی کرلے آیا، مولوی احمد حسن صاحب کے حوالہ گاڑھے کا وہی انگرکھا یہ ہدایت کرتے ہوئے کیا گیا کہ اسے تم پہنو، ''خوش لباسی'' کے جذبہ کی خوراک گاڑھے کے اس انگرکھے کی شکل میں مہیا کی گئی تھی، مولانا احمد حسن صاحب نے لینے کی حد تک تو لے لیا، مگر بجائے پہننے کے اس کو صندوق کے حوالہ کیا، کہتے تھے جب اس انگرکھے کو پہن کر حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، تو وجہ پوچھی گئی، کوئی وقتی عذر پیش کردیا گیا، مگر یہ فرمائش اتفاقی تو تھی نہیں جو ان حیلوں حوالوں سے ٹل جاتی، مولانا احمد حسن فرماتے تھے کہ ''مولانا روز دریافت فرماتے کہ بھائی، تم نے اس کو پہنا نہیں آخر جب میں سمجھ گیا کہ مولانا مانیں گے نہیں تو مجبوراً میں نے اس کو پہنا''۔(۱)

---

(۱) ارواح ثلاثہ: ص ۲۰۷، سوانح قاسمی: ج ۱ ص ۴۴۲

تدریس کو ذریعہ معاش بنانے سے گریز:

حضرت مولانا نانوتویؒ کی تعلیمی وتدریسی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے درس وتدریس کو کبھی حصول معاش کا ذریعہ نہیں بنایا، دولت مند نہ ہونے کے سبب سے مجبوراً حصول معاش کے لئے ملازمت اختیار کی، مگر تعلیمی کے بجائے مطبع میں تصحیح کتب کی، اور پھر تنخواہ میں بھی عام روش کے برخلاف اضافے کے بجائے تخفیف پر اصرار فرماتے تھے اور اس قدر کم تنخواہ پر قناعت فرماتے جس میں بدقت اور بمشکل گذر کیا جاسکے، دس پندرہ روپے سے زیادہ کبھی تنخواہ لینا قبول نہ کیا، وقت کا بڑے سے بڑا عہدہ جو کسی ہندوستانی کو دیا جاسکتا تھا وہ بقول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ آپ کی چشم وابرو کے ادنیٰ اشارہ پر مل سکتا تھا، چنانچہ آپ کے تعلیمی زمانے کے معاصرین جو علمی استعداد میں آپ سے کہیں فروتر تھے محکمہ تعلیم میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوگئے، مگر آپ نے تعلیمی ملازمت قبول کرنا پسند نہیں فرمایا۔

آپ کے والد مختصر سی زمین رکھتے تھے اور یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ بیٹا لکھ پڑھ کر جب عالم بن جائے گا تو معقول تنخواہ کی کوئی ملازمت مل جائے گی مولانا کے معاصرین جب اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہوگئے اور مولانا نے ملازمت کی جانب التفات نہ فرمایا تو والد کو بہت افسوس ہوا اور بر سبیل شکایت حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ سے عرض کیا کہ:

> ’’میرے یہی تو ایک بیٹا تھا اور اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں کچھ کماتا اور نوکری کرتا تو ہمارا افلاس دور ہوجاتا، خدا جانے آپ نے کیا کردیا کہ نوکری کے لئے تیار نہیں ہوتا‘‘۔ حضرت حاجی صاحبؒ اس

وقت تو سن کر چپ ہو رہے، مگر دوسرے وقت کہلا بھیجا کہ'' تم تنگی کی شکایت کرتے ہو، حق تعالیٰ ان کو نوکری کے بغیر ہی اتنا کچھ عنایت فرمائے گا کہ نوکری سے اچھے رہیں گے، اور بڑے عہدے والے ان کی خدمت میں فخر کیا کریں گے۔(۱)

❁ ❁ ❁

(۱) تاریخ دار العلوم: ج ۱ ص ۱۱۴-۱۱۵

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ بحیثیت مصنف

تصنیف حسب ضرورت:

حضرت نانوتویؒ کا مشن دشمن اسلام کے خلاف اسلام کا دفاع ہے، اس لئے جہاں تقریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تقریر اور جہاں تحریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تحریر سے کام لیا، تصنیف آپ کا پیشہ نہ تھا، بلکہ اسے آپ نے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ کسی نے تحریراً کچھ پوچھا تو آپ نے جواب میں کچھ ارقام فرمادیا، یا بعض نے کسی اہم مسئلہ پر لکھنے کی کچھ فرمائش کی اصرار سے مجبور ہوئے تو قلم ہاتھ میں لے لیا۔

کتابوں کے ناقص یا ناتمام رہ جانے کی وجہ بھی وہی ہے کہ مصنف بننے کے لئے آپ نے تحریر کے میدان میں قدم نہیں رکھا وقتی محرکات اور بیرونی دباؤ سے متاثر ہو کر وقت پر جو کچھ لکھا گیا یا لکھ دیا پھر اس کی تکمیل کا خیال نہ آیا، مثلاً تقریر دلپذیر کی تصنیف فرمانا شروع کی جو درمیان میں ہی رہ گئی۔(۱)

تصانیف میں برجستگی اور آمد:

آپ کی تصانیف کو پڑھئے اور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انداز بیان برجستہ اور بے تکلفانہ ہے نہ کوئی بناوٹ ہے اور نہ کوئی تکلف اور نہ ہی اس میں دوسروں کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے، جیسے جو خیال آیا اس کو اسی طرح ضبط کرلیا گیا، املا کرادیا، اس پر نظر ثانی کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج:۱: ص ۴۰۸

تصانیف نانوتوی اور علم کلام:

تصانیف نانوتویؒ میں علم کلام اور اس کی مصطلحات کا بہت زیادہ استعمال ہے، جو آج کل متروک ہے، جس کی وجہ سے آپ کی کتابوں کو سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے، آج علم کلام کا زمانہ نہیں، اس کے پڑھنے والے اور سمجھنے والے شاذ ونادر ہی ہیں، لیکن اس زمانہ میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی، اس کے علاوہ زیر بحث مسئلہ کی ناقص معلومات بھی عبارت سمجھنے میں دشواری کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت کا مکتوب متعلقہ مسئلہ وحدۃ الشہود، مسئلہ وحدت الوجود وغیرہ۔

محسوسات ومشاہدات سے استدلال:

حضرت نانوتویؒ کسی مسئلہ کے اثبات کیلئے محسوس اور مشاہد چیزوں سے استدلال کرتے ہیں اور عموماً ایک مقدمہ وتمہید بیان کرتے ہیں، کہ جب نتیجہ نکلتا ہے تو فریق مخالف کیلئے راہِ فرار باقی نہیں رہتی یعنی جب صغریٰ وکبریٰ کو تسلیم کرلیا تو نتیجہ سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔

نسل نو کیلئے بے حد مفید:

حضرت نانوتویؒ کی کتابیں آج کے عقلی ومادی دور میں جہاں ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے خاص طور پر مفید ہیں، جو ہر بات کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں، وہیں دوسری طرف آپ کی تحریروں میں بکھرے ہوئے شریعت کے اسرار واحکام خواص کے لئے بیحد مفید ہیں۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی:

قابل مبارکباد ہیں حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند اوران کے رفقاء کار کہ اکیڈمی کے تحت مصنفات نانوتویؒ کی تسہیل، تحقیق، ترجمہ اوران کی طباعت کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، اللہ رب العزت اس سلسلہ کو مستحکم فرمائے اور تا قیامت اسے جاری وساری رکھے۔

تصانیف حضرت نانوتویؒ:

حضرت نانوتویؒ کی باقاعدہ تصانیف کی علمی نوعیت اور علمی حلقے میں ان کے مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے ذاتی مکتوبات کس قدر علم کی گہرائی لئے ہوئے ہیں، اکثر مکتوبات بھی بعد میں تالیفات اور تصانیف کی شکل میں شائع کئے گئے اوران کو شائع کرنے والے ان مکتوبات کے وہ مکتوب الیہ ہیں جو مکتوبات کے اعلیٰ و ارفع اور قیمتی مضامین سے بے حد متأثر ہوئے

(۱) **حجۃ الاسلام**: اس تحریر میں آپ نے جن باتوں کا جائزہ لیا ان میں انسان کی تخلیق کا مقصد، توحید، رسالت، عقیدۂ تثلیث کی تردید، ثبوتِ تقدیر، حدوثِ عالم، استقبال قبلہ، نماز میں قیام، رکوع، سجدہ کی مصلحت، زکوٰۃ، روزہ وحج کی حقیقت، عصمت انبیاء، معجزات، قرآن کی فصاحت وبلاغت، ختم نبوت، قرآن میں نسخ کی وجہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آخر میں حلت گوشت کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ گوشت کھانا انسان کی فطرت ہے۔

یہ کتاب دریا بکوزہ ہے اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ ضلع شاہ جہانپور میں ایک جلسہ بنام میلہ خداشناسی ہونا طے پایا اور اطراف وجوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھیجوا کر ہر مذہب کے علماء کو اپنے اپنے مذہب پر تقریر کیلئے دعوت دی گئی، الامام الکبیرؒ

کو اسلام کے نمائندہ اور وکیل کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی، چونکہ پہلے سے یہ امر بالکل نامعلوم تھا کہ مباحثہ کا موضوع کیا ہوگا؟ اور یہ کہ اعتراضات وجوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی ہی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ہر کسی کو پیش کرنی پڑے گی، تو اس نظریہ کے تحت الامام الکبیرؒ کے دل میں خیال آیا کہ ایک تحریر لکھ لی جائے، جو اصولِ اسلام اور فروعِ ضروریہ پر مشتمل ہو چونکہ وقت بہت تنگ تھا اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ بیٹھ کر ایک تحریر منضبط فرمائی، لیکن مباحثہ میں اس تحریر کو پڑھ کر سنانے کی نوبت ہی نہیں آئی، الامام الکبیرؒ شاہ جہانپور سے واپس آئے تو خدام کے کہنے سے اسے طبع کرنے کو دے دیا۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام ''حجۃ الاسلام'' تجویز فرمایا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے اس کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے اس کی چند سطریں پیش خدمت ہیں:

> ''دلائل اتنے واضح کہ عقل مطمئن ہوتی چلی جائے اور اندازِ بیان اتنا دلنشیں کہ براہِ راست دل پر اثر انداز ہو، ایک ایک سطر سے مصنف کا یہ یقین اور اعتماد ٹپکتا ہے کہ اسلام ہی دینِ حق ہے۔ مصنف رحمہ اللہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دقیق، فلسفیانہ باتوں کو گرد و پیش کی خارجی مثالوں سے اس طرح واضح فرماتے ہیں کہ وہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔''(۱)

(۲) **انتصار الاسلام**: یہ کتاب وفات سے دو سال قبل ۱۲۹۵ھ میں تصنیف کی گئی انتصار الاسلام رسالہ کا نام آپ کے شاگرد خاص حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے تجویز کیا یہ رسالہ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ان سوالوں کے جوابات میں لکھا گیا جو انہوں نے اسلام اور مسلمان پر لگائے تھے، الامام الکبیرؒ نے

(۱) ماہنامہ ندائے دار العلوم وقف دیوبند، صفر المظفر ۱۴۳۶ھ

جلسۂ عام میں ان الزامات کی تردید کی اور اعتراضات کے جوابات بھی قلمبند کرادئے۔

اس کتاب میں جن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ان میں ذات باری تعالیٰ، شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود، بہشت، اور دوزخ کا وجود، جنت میں شراب طہور کی حقیقت، احکام خداوندی میں نسخ، مردہ کو دفنانا، روح، عالم برزخ، جانوروں کی حلت وحرمت، توبہ سے گناہ معاف ہونے جیسے مضامین ہیں۔

(۳)**تحفۂ لحمیہ**: یہ رسالہ ہندوؤں کے اعتراض کے رد میں لکھا گیا، اعتراض یہ تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے اور ظلم ہر ملت ومذہب میں ممنوع ہے، الامام الکبیرؒ نے اس رسالہ میں ان کے اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ہندوان کی کھال کے جوتے چپل کیوں پہنتے ہیں، نیز یہ کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، انہیں قید کرنا بھی ظلم ہے، اسی طرح اگر جانوروں کو ذبح کرنا گناہ کبیرہ ہے تو ان کو مارنا، پیٹنا ثواب کا کام نہیں۔

(۴)**براھین قاسمیہ**: (جواب ترکی بہ ترکی) یہ رسالہ آریہ سماج کے رسالہ ''آریہ سماچار میرٹھ'' کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کے جواب میں ہے، اس کے بنیادی مباحث میں باری تعالیٰ کا وجود اور اس کی صفات، علم، ارادہ، قدرت وغیرہ کی تفصیل ہے، پھر مادۂ قدیم ہونے کی تردید پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے، آخر کتاب میں قرآن کو کلام اللہ اور دوسری کتب سماویہ کو کتاب اللہ ثابت کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں انبیاء کی ضرورت ان کی حیثیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے دلائل اور خاتمیت کے مفہوم کی مکمل وضاحت کی گئی، کتاب اردو میں ہونے کے باوجود چونکہ کلامی مباحث اور منطقیانہ طرز استدلال سے پُر ہے، ایک ایک مضمون

پر شاخ در شاخ بحثیں ہیں، پوری کتاب مسلسل مضمون کی شکل میں ہے اس کی تسہیل مولانا اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے کردی اور اس کا نام ''براہین قاسمیہ'' رکھا۔

(۵)**قبلہ نما:** پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات میں ایک یہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور خود ایک مکان (بیت اللہ) کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، یہ کتاب اسی سوال کے جواب میں لکھی گئی اس کتاب میں متکلمانہ انداز میں جواب دیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بت پرست اپنے بتوں کو خانۂ خدا نہیں بلکہ ''مہادیو'' اور ''گنیش'' خیال کرتے ہیں اس لئے بیت اللہ کی طرف کو منہ کر کے نماز ادا کرنا دوسری بات ہے اور بت پرستی اور چیز ہے۔

(۶)**تقریر دل پذیر:** الامام الکبیرؒ نے یہ کتاب دعوت اسلام کے نقطۂ نظر سے تصنیف کی کتاب میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے ان میں وجود باری تعالیٰ، توحید، ابطال تثلیث واصنام پرستی، انجیل کا محرف ہونا، بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے، نیز حدوث عالم، جنت، دوزخ، ملائکہ اور شیاطین کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، مسئلہ تقدیر، آسمانی شرائع میں نسخ کی وجہ، حسن وقبح اعمال، ضرورتِ نبوت، صفات الٰہی، جزء لایتجزی اور قیامت کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔

(۷)**آب حیات:** حضرت نانوتویؒ کی یہ بڑی اہم کتاب ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں نے اسے حضرت نانوتویؒ سے سبقاً سبقاً پڑھا ہے کتاب کا موضوع حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، حضرت نانوتویؒ کے عہد میں چونکہ شیعی جراثیم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اس لئے حضرت سے شیعوں کی روایتوں کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے، حضرت نانوتویؒ ان سوالوں کے بڑی تفصیل سے جوابات لکھتے تھے،

آب حیات لکھنے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب آپ نے ''ہدیۃ الشیعہ'' لکھی جس میں مسئلہ فدک اور خلفاء راشدین پر شیعوں کے الزامات کو موضوع بنایا آپ نے آب حیات میں یہ ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں حیات ہیں اور چونکہ زندہ شخص کے مال میں وراثت نہیں جاری ہوتی، اس لئے حضور اکرمؐ کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔ اس کتاب میں بھی انداز بیان متکلمانہ اور فلسفیانہ ہے۔

(۸) **توثیق الکلام**: اس کتاب میں قرأت فاتحہ خلف الامام کا مشہور اور مختلف فیہ مسئلہ زیر بحث ہے، اس سلسلہ میں آیات قرآنی اور روایات سے استدلال کیا گیا ہے، انداز بحث متکلمانہ ہے۔

مکتوبات حضرت نانوتویؒ:

حضرت نانوتویؒ کے مکتوبات کے آغاز پر مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی اس تحریر کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ نے مکتوبات کے تعارف میں تحریر فرمائی، وہ لکھتے ہیں:

> ''علمی موضوعات پر جو گرامی نامے تحریر فرمائے ہیں ان کے مباحث میں بڑا تنوع اور وسعت ہے، ان میں اسرار دین و شریعت کی گفتگو ہے، تفسیر و حدیث کے نکات کی گرہ کشائی فرمائی گئی ہے، فقہی مسائل بھی زیر قلم آئے ہیں، تراویح و قراءتِ ضاد، جمعہ اور اس دور میں موضوع بحث بنے ہوئے مسائل پر بھی توجہ فرمائی گئی ہے۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت اور اس کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے اور یہاں عقودِ فاسدہ پر بھی اظہارِ خیال فرمایا گیا ہے۔ شرک و بدعت کے کلیدی مباحث کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ مختلف دینی فرقوں کے نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ امکانِ نظیر کے واضح دلائل تفصیل سے لکھے ہیں، امتناعِ نظیر کے ماننے والوں کے

دلائل کا علمی تجزیہ فرمایا ہے۔ ردِ شیعیت پر بھی خاص توجہ ہے، خلافت و امامت اور باغ فدک وغیرہ کے مشہور اختلافی موضوعات کا بھی علمی، عقلی جائزہ لیا ہے۔ مسلمانوں کے بگاڑ وزوال کے اسباب کا ذکر اور اپنوں کی اندرونی کمزوریوں پر بھی کہیں کہیں احتساب کیا گیا ہے، غرض بیسیوں موضوعات ومباحث ہیں جو ان مکتوبات میں زیرِ قلم آئے ہیں، لیکن ہر ایک کی جامعیت، مضامین کی فراوانی اور دلائل کی گہرائی وگیرائی کا یہ عالم ہے کہ ہر تجزیہ منفرد اور بحث حرفِ آخر معلوم ہوتی ہے۔"(۱)

اب ہم مختصراً مکتوبات کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) **آب حیات**: (اردو) اثبات حیات انبیاء علیہم السلام اس کتاب کا موضوع ہے، آپ کی تمام کتابوں میں یہ سب سے زیادہ مشکل کتاب سمجھی گئی ہے اگر چہ اس میں سے ایک معتد بہ حصہ جس کے بارے میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی رائے یہ تھی کہ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا اس کو نکال دیا گیا ہے۔

(۲) **مصابیح التراویح** (فارسی) موضوع نام سے ظاہر ہے اور ضمناً عجیب وغریب مضامین زیرِ قلم آئے ہیں، اس کتاب کا حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندیؒ نے ترجمہ فرمایا ہے جو انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا ہے۔

(۳) **ھدیۃ الشیعہ**: حضرت نانوتویؒ نے اس کتاب میں شیعوں کی جانب سے وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ بحمد اللہ حجۃ الاسلام اکیڈمی سے اب اس کا عربی ترجمہ اشاعت کے مرحلہ میں ہے۔

(۴) **الدلیل المحکم علی قراءۃ الفاتحۃ للمؤتم**: یہ کتاب

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، احوال وآثار وباقیات ومتعلقات، ص:۱۹۶

نماز کے ایک اختلافی مسئلہ کا بیان ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھے گا یا نہیں؟

(۵)**الاجوبۃ الاربعون**: اس کتاب میں بھی شیعوں کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

(۶)**اسرار قرآنی**: (فارسی) بعض قرآنی سوالات کے محققانہ جوابات کا مجموعہ ہے، اور ''تفسیر المعوذتین'' اس کتاب میں شامل ہے ''الرحیم اکیڈمی کراچی'' نے اسے شائع کیا ہے۔

(۷)**تصفیۃ العقائد**: اصولی اور کلامی مباحث اس تصنیف کا موضوع ہے جو درحقیقت سرسید احمد خان کے ایک خط کا جواب ہے۔ اسے شیخ محمد حیات میرٹھی نے ''تصفیۃ العقائد'' نام سے شائع کیا اس میں وہ خط بھی شائع ہے جو سرسید احمد خان صاحب نے حضرت نانوتویؒ کو ارسال کیا تھا۔

(۸)**تحذیر الناس**: یہ کتاب درحقیقت ایک استفتاء کے جواب میں ہے اور ۹۶؍صفحات پر مشتمل ہے، اس استفتاء کی اہمیت اس لئے تھی کہ اس کا تعلق مسئلہ ختم نبوت سے تھا آپ نے عقل ونقل سے اس مسئلہ کو مدلل فرمایا۔ آپ کے زمانہ میں ہی یہ کتاب معرکۃ الآراء بن گئی تھی۔

(۹)**رد قول الفصیح**: شیخ عبدالقادر بدایونی کے شاگرد شیخ فصیح الدین نے ''تحذیر الناس'' پر کچھ اعتراضات پیش کئے تھے، حضرت نانوتویؒ نے خود اپنے قلم سے اس کے جوابات تحریر فرمائے اور اس کا نام ''ردقول الفصیح'' رکھا۔

(۱۰) **حجۃ الاسلام**: (اس کا ذکر تفصیلاً تصنیفات کے ضمن میں آچکا ہے)

(۱۱) **روداد میلہ خداشناسی**: یہ کتاب اس مباحثہ کی روداد ہے جو شاہ جہانپور میں عیسائیوں، آریوں اور سناتن دھرمیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا

، پورے مباحثہ کی روداد حضرت کے ایک شاگرد رشید مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے مرتب کی ہے اس کتاب سے حضرت نانوتویؒ کے علم وفن، طرز استدلال، اثبات مدعا کے مقدمات کی ترتیب اوراس سے نتائج کے استخراج کا حیرت ناک مظاہرہ ہوتا ہے۔

(۱۲)**مباحثہ شاہ جہانپور** : اصول دین کی حقانیت کا بیان اور عیسائیت کا رد ۱۲۹۵ر شاہ جہانپور میں دوسرا مناظرہ ہوا تھا اس کی یہ روئیداد ہے، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ نے مرتب فرمائی۔

(۱۳)**براھین قاسمیه**: تصنیفات کے ذیل میں اس کا ذکر تفصیلاً آچکا ہے

(۱۴)**قبله نما**: (// // // // // // // // // // // // //)

(۱۵)**جواب ترکی به ترکی**: (// // // // // // // // // //)

(۱۶)**تقریر دلپذیر**:(// // // // // // // // // // // //)

(۱۷)**توثیق الکلام**: (// // // // // // // // // // // //)

(۱۸)**تحفۂ لحمیه** : (// // // // // // // // // // // //

(۱۹)**انتباہ المومنین**:(فارسی)ایک حدیث شریف کی شرح مشکوٰۃ شریف باب مناقب العشرۃ فصل ثالث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے بارے میں ہے اس کی شرح ہے مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے اس کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے۔

(۲۰) **فیوض قاسمیه** :یہ بھی حضرت نانوتویؒ کے مکاتیب کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو ۱۵ر خطوط پر مشتمل ہے، لیکن خطوط مفصل ہیں، اس لئے ۵۶ر صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، ان میں اکثر خطوط تو مستقل ایک مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں مختلف مسائل دینیہ وشرعیہ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

(۲۱) **جمال قاسمی**: یہ اردو میں ایک طویل ترین خط ہے، جو ۴۷ صفحات میں آیا ہے دہلی کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین علویؒ نے حضرت نانوتویؒ سے صوفیاء کی اصطلاح ''وحدۃ الوجود'' اور ''سماع موتی'' کے بارے میں سوال کیا تھا، حضرتؒ نے اس خط میں ان دونوں مسئلوں پر روشنی ڈالی ہے۔

(۲۲) **مکاتیب قاسمی**: یہ کتاب آٹھ خطوط کا مجموعہ ہے، جو آپ نے اپنے مرید خلیفہ بشیر احمد دیوبندیؒ کو جواباً لکھا ہے جس میں اور اد و وظائف کی ہدایات ہیں۔

(۲۳) **الاجوبة الكاملة في الاسئلة الخمسة**: یہ رسالہ ایک شیعہ کے پانچ سوالات کے جوابات میں ہے۔

(۲۴) **لطائف قاسمیه**: یہ بھی حضرت نانوتویؒ کے مکتوبات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، ان میں نو خطوط ہیں، ان میں ایک خط جو سب سے طویل ہے وہ ''جمعہ فی القریٰ'' کے مسئلہ پر ہے۔

(۲۵) **قصائد قاسمی**: یہ حضرت نانوتویؒ کا ایک شعری مجموعہ ہے، پہلا قصیدہ نعتِ رسول ہے اور اس کے بعد تین قصیدے سلطان عبدالحمید کی تعریف میں ہے، ان میں پہلا اردو میں، دوسرا فارسی میں اور تیسرا قصیدہ عربی زبان میں ہے اور رسالہ کے آخر میں ایک قصیدہ ہے جس میں سلسلہ چشتیہ صابریہ کو بیان کیا گیا ہے۔

حضرت کی چند اہم کتابوں اور مکتوبات کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

مطبوعہ مکاتیب

حضرت نانوتویؒ کے مکاتیب میں سے اب تک ۹ مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے اسماء درج ذیل ہیں:

(۱) مکاتیب قاسمیہ۔

(۲) فیوض قاسمیہ۔

(۳) لطائف قاسمیہ۔

(۴) جمال قاسمی۔

(۵) الحق الصریح۔

(۶) تحذیر الناس۔

(۷) اسرار القرآن۔

(۸) فرائد قاسمیہ۔

(۹) تصفیۃ العقائد۔

حضرتؒ کے ان مکاتیب کی طرف آپ کے تلامذہ نے توجہ فرمائی اور ان کی ترتیب اور تخریج کا کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ ان مکاتیب اور رسائل کا موضوع اور شیعیت، رد بدعت، رد عیسائیت اور ہندو ازم ہے، آپ نے عقل ونقل کی روشنی میں بداہۃً اس کی تردید فرمائی اور اسلام کی حقانیت کو واضح فرمایا۔ حضرت کی کم وبیش تحریروں کا یہی انداز ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آپ کا بنیادی موضوع علم کلام ہے، آپ نے تمام مسائل جدید علم کلام کی روشنی میں واضح فرمایا۔ آپ کی تصنیفات اور مکتوبات پڑھنے کے بعد علوم شرعیہ کے بہت سے اسرار وحکم تک رسائی ہوتی ہے اور عقل بھی ان کی تائید کرتی ہے۔

❁ ❁ ❁

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ
کے فضل وکمال پر چند اہم مضامین
(ماخوذ از نگارشاتِ اکابر)

مخالفانِ قاسم (نانوتوی رحمہ اللہ) کو قلمِ قاسم سے جواب

محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ

"تحذیر الناس" پر اعتراضات کی بارش کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذیل کا مکتوب منشی ممتاز علی میرٹھی کو لکھا تھا۔ یہ حضرت مولانا نسیم احمد فریدیؒ کی عنایت سے ماہ نامہ دار العلوم دیوبند (ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ/اگست ۱۹۵۴ء) میں چھپ گیا تھا۔ اس مکتوب کو حضرتؒ نے کس اعتماد سے تحریر فرمایا ہے؟ آپ بھی پڑھیے اور ایمان تازہ کیجیے۔ (نعمان)

حضرت نانوتویؒ کا مکتوب بہ نام منشی محمد ممتاز علی میرٹھی مرحوم:

سراپا عنایات و کرم منشی محمد ممتاز علی صاحب سلمکم اللہ

محمد قاسم کا سلام قبول فرمایئے، اور پھر سنیے کہ! آپ کا نامہ مورخہ ۴ر جمادی الثانیہ دیوبند ہو کر نانوتہ آیا نہ تھا کہ میں بہ تقاضائے چند در چند انبیٹھہ چلا گیا۔ کل سولہویں دن وطن آیا، تو آپ کا عنایت نامہ ملا، آج تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

تین جواباتِ استفسارات ڈاک میں بھیجتا ہوں اور ایک ورق اور جس پر ہندسہ مرقوم نہیں اور شروع میں موٹے قلم سے لفظ "تنبیہ" لکھا ہوا ہے، ساتھ ملفوف ہے۔ اس ورق کو علاحدہ نکال کر منشی عبد الرزاق صاحب کے سپرد کر دینا، شاید کسی وقت کام آئے اور کسی نیم ملا کے اعتراض کا جواب ہو جائے، اور باقی اجزائے جوابات کو مولانا محمد علی صاحب کے حوالے کر دینا، اور یہ عرض کر دینا کہ بعدِ مطالعہ ان اوراق پر بہ

شرطا پسند مہر کر کے واپس فرمائیے، میرے پاس اس کا ثنیٰ (نقل) نہیں۔ اگر ثنیٰ ہوتا، تو کچھ ضرورت نہ تھی، اور اگر پسند نہ آئے، تب بھی اس اصل کا لوٹا دینا ضرور ہے۔ اگر کسی صاحب کو خیالِ جواب الجواب ہو، تو نقل کر لینے کا اختیار ہے۔ میں نے دو روز میں تمہید اور چھتیس جواب لکھے ہیں، اور صاحب چار روز میں نقل کر لیں، حد نہایت ہفتے میں نقل کر کے واپس فرمائیں؛ مگر مولانا کی انصاف پرستی سے مجھ کو امید تسلیم ہے اندیشہ تعصب نہیں۔ اگر اس پر بھی مولانا محمد علی صاحب کا وہی اصرار رہا تو یوں کہو قیامت آ گئی۔ جب ایسے بھولے بھالے بے شر عالم بھی شاگردوں کے کہنے سننے سے ایسی چال چلنے لگے تو ہم کو کون روکنے والا ہے؟

منشی صاحب! اگر نفسانیت عند اللہ مذموم نہ ہوتی اور بحث مباحثہ کا انجام خراب نظر نہ آتا، اور نزاع اہلِ اسلام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار نہ ہوتا، تو آپ بھی ایک تماشہ دیکھ لیتے، ان شاء اللہ! مخالفانِ احقر کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ سب کے نشے ان شاء اللہ! ڈھیلے ہو جاتے۔ مدعیانِ روزگار اپنے کیے کو پہنچ جاتے۔ پر کیا کروں "اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ" اس گرفتار ہوئی و ہوس کے ذمے خدا کی طرف سے بھی دربارۂ مناظرہ سیکڑوں قید و قیود لگی ہوئی ہیں۔ وہاں کی باز پرس کا کھٹکا ایسے کام کرنے نہیں دیتا؛ ورنہ اس نفس کافر کیش کو کیا کیا کچھ لہریں نہیں آتیں؛ مگر لاچار ہو کر اس شعر کو پڑھ کر اپنے آپ کو سمجھا لیتا ہوں: ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اور اسی لیے تحریر جواب سے گھبراتا رہا، اور لکھ لیا تو ارسال میں اتنا توقف کیا اور سو طرح کے حیلے و حجت نکالتا رہا؛ مگر جب دیکھا سب اہلِ مشورہ اسی طرف ہیں، اِدھر آپ کا عنایت نامہ بھی بہ طلب جواباتِ معلومہ پہنچا، ناچار ہو کر روانہ کرتا ہوں، پر "شور مکروہ" سے ڈرتا ہوں؛ اس لیے پھر بھی یہی آرزو ہے کہ جانے دیجیے، مخالفوں کے راہ پر آنے کی امید نہیں، جو موافق ہیں، ان سے اندیشۂ برگشتگی نہیں، اور اگر کوئی برگشتہ بخت پھر بھی گیا، تو معتقدوں کا بندہ شائق نہیں۔ تسپر جوابِ اعتراض؟ جواب ہوتا ہے، آدابِ نیاز نہیں ہوتا۔

ناظرانِ اوراق کو میری "تیز قلمیاں" جو باوجود عزم ادب بہ مقابلۂ تعریضاتِ مخالفاں بے اختیارانہ سرزد ہو گئی ہیں، ناگوار ہوں گی اور اس وجہ سے کیا کیا کچھ برا بھلا نہ کہیں گے؟ مگر خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں کس کو کہتا ہوں، اور مولوی محمد علی صاحب کو کیسا سمجھتا ہوں۔

میں اول ہی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ استفسارات مولوی محمد علی صاحب کی طرف سے معلوم نہیں ہوتے، کسی طالب علم کا ہذیان ہے، مولوی محمد علی صاحب کے نام لگا دیے ہیں، اور مولوی محمد علی صاحب نے

بہ وجہ تسلیم طبع زاد اس کے نشیب و فراز پر غور و لحاظ نہیں فرمایا؛ بلکہ اوروں کے اعتماد پر آپ ''بہ رو'' ہو بیٹھے ہیں؛ ورنہ ان کی وہ سلامت روی اور کم گوئی اور ان کی وہ یک سوئی اور ''معصوم وشی'' جو سراسر ایسی باتوں کی مخالف ہے، ان سے ایسی حرکت اور وہ بھی میرے مقابلے میں ہرگز کرنے نہ دیتی۔

اس لیے ان جوابوں کے پیش کرنے میں اوّل تو ان سے شرماتا ہوں، اور ''آخر کار'' سے خائف ہوں، مبادا ''ملازمانِ شب و روز'' اس قصے کو دور پہنچائیں اور مولانا کو آمادۂ جواب کریں، اور اِدھر بھی نفس بدکیش ''لپیٹوں'' پر آجائے اور وہ محبت اور ملاقات سب خاک میں رل جائے، اور میں سنتا ہوں کہ کہیں کہیں اور بھی ''استفسارات مولانا'' کا فکر ہے، سو کہیں اور سے اگر کوئی جواب آگیا ہو، یا آج کل میں آجائے، تو پھر کاہے کو ان جوابوں کو پیش کیجیے؟ بلکہ ''بہ نظر مصلحت ہائے دیگر'' پھر تو پیش نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ اگر پیش ہی کرنا ہوگا، تو جب پیش کریں گے، جب کہ ''مخالفانِ احقر'' اوروں کے جواب کے جواب سے فارغ ہولیں گے۔ تس پر بھی اگر آپ کی یہی رائے ہو کہ ''جواباتِ مرسلہ'' پیش ہی کرنے چاہئیں، تو بعدِ استخارہ اختیار ہے۔

خاص آپ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی محمد علی صاحب کے یہاں سے اس تحریر کا واپس آنا معلوم، جس طرح ہو سکے، اس کی نقل کرا کر ان کی خدمت میں بھیجئے گا۔

منشی عبد الرزاق بیگ صاحب کی خدمت میں بعد سلام ضرور یہ کہہ دینا کہ آپ بھی مضمون واحد تصور فرمائیں۔ مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلام و نیاز میری طرف سے یہ عرض کر دینا کہ: اب آپ کو انصاف فرمانا ضرور ہے۔ میں نہیں کہتا کہ آپ میری رو رعایت کریں، اور کہوں ہی تو کیا ہوتا ہے۔ اگر میری رعایت ہوتی، تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ پر حق کی طرف داری کے لیے خدا کی طرف سے جس قدر تاکیدیں ہیں، سب آپ کو معلوم ہیں، اور اس باب میں جس قدر وعدہ وعید ہیں، آپ خوب جانتے ہیں۔ خدا کو یاد کر کے ''محاکمہ'' فرمائیے گا۔ زیادہ کیا عرض کروں؟ والسلام فقط

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ علیہ الرحمہ

اور

ختمِ نبوت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز

حضرت نانوتویؒ پر بریلوی حضرات ایک الزام یہ گھڑتے ہیں کہ: ختم نبوت کے منکر ہیں (العیاذ باللہ)۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے نقشِ حیات میں بڑی صفائی کے ساتھ تحریر فرمایا کہ: مولانا احمد رضا خان صاحب نے "تحذیر الناس" کی عبارات الگ الگ صفحات سے لے کر ایک بنادی اور اس پر کفر کا فتوی جڑ دیا۔ یہ ان کی عادتِ جاہلیہ تھی۔ زیرِ نظر تحریر ایک مکتوب کی صورت میں ہے، جو یہاں شاملِ اشاعت ہے۔ اس میں "جہالت بریلویہ" کا رد کیا گیا ہے۔ (نعمان)

بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی طرف جو مضمون انکار ختم نبوت زمانی کا نسبت کیا گیا ہے، بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تین قسم کی خاتمیت ثابت کرتے ہیں: "خاتمیت ذاتی" (مرتبی)، "خاتمیت مکانی" اور "خاتمیت زمانی" کو قطعی ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جو اس کا منکر ہے، وہ کافر ہے، دایرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ نبوت تمام انبیا سے آخر میں واقع ہوا ہے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جو شخص اس کو نہ مانے اور انکار کرے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ حضرت مولانا مرحوم (تحذیر الناس کے) صفحہ ۸ر سے "خاتمیت زمانی" کے عقلی دلائل شروع فرما کر صفحہ ۱۰ر میں بہ طور نتیجہ ارشاد فرماتے ہیں۔ تحذیر الناس صفحہ ۱۰ر میں مندرجۂ ذیل عبارت ہے:

"سواگر استغراق اور عموم ہے، (یعنی لفظ خاتم النبیین مذکورہ آیت میں) تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے؛ ورنہ لزوم خاتمیت زمانی بہ دلالت التزام ضرور ثابت ہے۔ اِدھر تصریحات نبوی مثل "اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰي؛ اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" أو کما قال علیہ السلام، جو بہ ظاہر بہ طرز مذکور اسی خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس بات میں کافی رہا؛ کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا، گو الفاظ مذکور بہ سند متواتر منقول نہ ہوں، اور یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا، جیسا تواتر اعداد رکعت فرائض ووتر وغیرہ، باوجود یہ کہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعت متواتر نہیں، جیسا اس کا منکر کافر ہے، ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا"(۱)۔

صفحہ ۱۲ میں فرماتے ہیں:

"ہر حادث زمانی کے لیے ایک عمر کہ جس کی وجہ سے محققان صوفیۂ کرام ہر حادث میں قائل تجدد امثال ہوئے ہیں؛ کیوں کہ زمانہ ایک حرکت ہے: چناں چہ اس کا متجدد وغیر قار الذات ہونا بھی اس کا مؤید ہے، اس صورت میں مسافات متعددہ اور حرکات متعددہ من جملہ حرکات سلسلۂ نبوت بھی تھی، سو بہ وجہ حصول مقصود اعظم ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مبدل بہ سکون ہوئی، اور حرکتیں ابھی باقی ہیں، اور زمانۂ آخر میں آپ کے ظہور کی ایک یہ بھی وجہ ہے"۔

مندرجۂ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جب کہ حرکت سلسلۂ نبوت ختم ہو کر مبدل بہ سکون ہو گئی، تو پھر کوئی نبی کیوں کر آ سکتا ہے؟ حضرت مولانا کی تحریرات میں متعدد مقامات پر آپ کی خاتمیت زمانی کا زور وشور سے اقرار کیا گیا اور آپ کے بعد کسی نبی کے آنے کے امکان کا سختی سے انکار موجود ہے۔ دیکھو: "مناظرۂ عجیبہ" اور "ہدیۃ الشیعہ" وغیرہ۔ رسالہ "تحذیر الناس" میں عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تمام انبیا سے اونچا اور آخری ہے۔ آپ سے اوپر کسی نبی کا مرتبہ نہیں اور آپ کا زمانہ سب سے آخر ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، اور اسی طرح آپ کا مکان اور وہ زمین جس میں آپ مبعوث ہوئے۔

احادیث صحیحہ تو یہ دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آخر زمانے میں اتریں گے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے متبع ہو کر قیام فرمائیں گے۔

---

(۱) تحذیر الناس، ص: ۱۰، ۱۱، (مطبوعہ قاسمی پریس)۔

(۲) مکتوبات شیخ الاسلامؒ، ج: ۲، مکتوب نمبر: ۱۲۱۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے چند افادات

بہ روایت امیر شاہ خاں خورجویؒ

مرتب:

حضرت مولانا سید نور الحسن راشد کاندھلوی

(الف): امیر شاہ خاں صاحبؒ نے شیخ الہندؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا:

”مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گذرے ہیں:

(۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائق شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے۔ جیسے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلے میں پھیلتے زیادہ ہیں اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں۔

(۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن علو کی طرف زیادہ چلتا ہے۔ جیسے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحاب ذوق کو بھی ان کے مدرک تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۳) اور بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلے کی تہہ اور اصلیت کا سراغ لگا لیتے ہیں، اور ایسی اصل قائم فرمادیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہو جاتی ہیں“۔

(ب): امیر شاہ خاںؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے فرمایا:

”قبول عام کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ قبول جو خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچے، اور دوسرا وہ جو عوام سے شروع ہو، اور اس کا اثر خواص تک بھی پہنچ جائے۔ پہلا قبول علامت مقبولیت ہے، نہ کہ دوسرا“(۱)۔

(ج): حضرت مولانا نانوتویؒ کا افادہ مولانا گیلانیؒ نے مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ (مہتمم دار العلوم دیوبند) کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ فرماتے تھے:

”اجتماعی مدرسوں کا نقصان یہ ہے کہ ان سے علم کی کیفیت روز بروز گھٹنے لگی ہے“(۲)۔

---

(۱) ارواح ثلاثہ، ص: ۲۶۶۔ (۲) سوانح قاسمی، ج: ۱، ص: ۳۲۱۔

حضرت الاستاذؒ کے ساتھ بیتے ہوئے چند لمحات

حضرت مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ

> مذہب منصور کے حصۂ دوم کا مقالہ جسے صاحب ''مذہب منصور'' حضرت مولانا منصور علی خاں تلمیذِ خاص حضرت نانوتویؒ نے قلم بند فرما کر اپنی کتاب ''مذہب منصور'' کا جزو بنایا، یہ کتاب فن طب میں ہے، اور یہ حصہ حضرت نانوتویؒ کی سوانح سے متعلق ہے۔ (حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ)

ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارس دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی رائے اور مشورے سے جاری ہیں، خصوصاً مدرسۂ دیوبند میں اکثر طلبہ علمِ دین کی تحصیل کر کے اشاعت اسلام میں سعی کیا کرتے ہیں۔ اول مولانا مرحوم نے اس مدرسے کو چندے سے قائم کیا تھا، اور اب بھی بفضلہ تعالیٰ خوب ترقی کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے رگ وریشے میں علم وتقویٰ سرایت کر گیا تھا؛ بلکہ ان کا ذہن بھی علم کے رگ وریشے میں جاری تھا۔ تمام احکام شرعی کو معقولات کر دیا۔ ان کا مقولہ تھا کہ: ''تمام احکام الٰہی ورسالت پناہی عقلی ہیں؛ مگر ہر عقل کو وہاں تک رسائی نہیں''۔ اور فی الواقع وہ جب کسی مسئلے کو دلائل عقلی سے ثابت کرتے تھے، تو اہل علم بھی حیران رہ جاتے تھے۔

ظاہر میں کوئی حکم اگرچہ خلاف قیاس معلوم ہوتا، تو مولانا کی تقریر سے بالکل عقل کے مطابق معلوم ہوتا تھا۔ اصول فلسفہ کو جو شرع شریف کے خلاف ہیں، جب دلائل عقلیہ سے رد کرنا شروع کرتے تھے، تو ایسا یقین ہوتا تھا کہ ارسطو وافلاطون ان کے مقابلے میں طفل مکتب تھے۔ بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے(1)۔ ریاضت کر کے سلوک کو طے کیا تھا؛ لیکن علم ان کا خداداد وہبی تھا۔ مشکلاتِ تصوف کو ایسا حل کرتے تھے کہ سننے والے کا جی چاہتا تھا کہ صوفی بن جائے۔ احکام شرعیہ میں اگر کوئی شخص اعتراض کرتا، تو ایسی معقول تقریر فرماتے کہ معترضین کو اطمینان نصیب ہو جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ: ''مجھ کو اعتراض کا جواب دینے میں تامل نہیں ہوتا؛ بلکہ جواب میں اس قدر دلائل عقلی پیش نظر آتے ہیں کہ ان کو انتخاب کرنے میں ذرا تامل کرنا پڑتا ہے''۔

---

(۱) مضمون نگار سے یہاں تسامح ہوا ہے، حضرت نانوتویؒ کی فراغت تقریباً: ۱۲۶۵ھ/مطابق ۱۸۴۹ء میں ہوئی ہے، اور اس وقت آپ کی عمر سترہ سے اٹھارہ سال کے درمیان تھی؛ کیوں کہ ۱۲۶۰ھ/مطابق ۱۸۴۴ء میں آپ کا دہلی جانا یقینی ہے، اور تعلیم کا دورانیہ حسب بیانِ سوانح نگاراں چار سے پانچ سال ہے۔ (دیکھیے: مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ج۱، ص: ۲۳۰-۲۲۹؛ اسیر ادروی، مولانا قاسم نانوتوی — حیات اور کارنامے، ص: ۵۰)۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس قدر محبت اور اعتقاد رکھتے تھے کہ مدعیوں میں اس قدر نہیں پایا جاتا؛ بلکہ جملہ سادات کی نہایت تعظیم وتوقیر کیا کرتے تھے۔ نانوتہ ضلع سہارن پوران ہی کی وجہ سے مشہور ہوگیا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم حضرت محمد ابن ابوبکر رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تھے۔ دہلی میں جناب مولوی مملوک العلی صاحبؒ سے جوان کے ہم جد تھے، تحصیل علوم کیے تھے۔ ۱۲۹۷ھ/کی جمادی الثانیہ (مئی ۱۸۸۰ء) میں بہ مقام دیوبند انتقال فرمایا۔ تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ ۱۲۹۴ھ/(۱۸۷۷ء) میں اخیر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا۔ میں بھی مولانا صاحبؒ کے ہمراہ علی گڑھ سے بیت اللہ شریف گیا تھا۔ جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا، سواری نہیں ملی، اس وقت یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری تھا:

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو ضد ہوئی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

حرم مکہ کا ادب واحترام:

مکہ شریف جب قریب آیا، غسل فرمایا اور قریب صبح صادق کے وہاں داخل ہوئے۔ جناب حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بہ طور استقبال تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے مکان میں جو دو منزلہ تھا، ٹھہرایا(۱)۔ دروازے کے اوپر کے مکان پر مولانا صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے قیام کیا۔ مکان بہت وسیع تھا، سب ہمراہی اس میں جابہ جا ٹھہر گئے۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ تشریف لاتے، دونوں بزرگ کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے، اور نہایت مؤدب دو زانو ہوکر ان کے روبہ رو بیٹھ جایا کرتے۔ دونوں صاحبان میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مذاق ہوا کرتا تھا، اتفاق سے مولانا صاحبؒ اس درجے میں موجود نہ تھے، صرف میں مولانا رشید احمد صاحبؒ کے پاس بیٹھا تھا، اور ان کا رخ دیوار کی جانب تھا، اس کمرے کے دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی، اور نیچے دروازے پر فقیروں نے ڈھول بجا کر سوال کرنا شروع کیا، مولانا رشید احمد صاحبؒ سمجھے کہ مولانا مرحوم تشریف لائے ہیں، خوش طبعی سے فرمایا کہ: اپنے یاروں کو بھی ہمراہ لائے ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ: سائل ہیں۔ مولانا رشید احمد صاحب تعظیم کے واسطے کھڑے ہوگئے اور حضرت حاجی صاحبؒ کے روبہ رو مؤدب بیٹھ گئے۔ میں نے یہ واقعہ مولانا مرحوم سے عرض کیا، تو مسکرانے لگے۔

(۱) یہ مکان راقم الحروف تنویر احمد شریفی نے دیکھا ہے۔ حارۃ الباب میں "مسجد خالد ابن الولید" سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ پر پہاڑ کی جانب تھا۔ اب یہ مکان اور حارۃ الباب توسیع حرم (۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء) میں آگیا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو عجیب قوتِ علمیہ عطا کی تھی۔ تمام نظریات ان کے نزدیک بدیہیات تھے؛ مگر جب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وحدۃ الوجود میں کچھ تقریر فرماتے، تو خاموش ہو کر سنا کرتے تھے۔ جناب مولوی محمد مظہر صاحبؒ اس تقریر پر کچھ شبہات پیش کرتے، اور ان کا جواب بھی حضرت حاجی صاحبؒ نہایت متانت اور آسان طریقے سے ادا کرتے؛ مگر مولانا مرحوم کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے۔ اسی طرح مولانا رشید احمد صاحبؒ بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے، اور کچھ چوں وچرا نہ کرتے۔ مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ: بعض آدمی حضرت حاجی صاحبؒ کا تقویٰ دیکھ کر معتقد ہوئے اور بعض عبادت اور ریاضت دیکھ کر، اور بعض کرامات دیکھ کر معتقد ہو گئے۔ میں صرف حضرت حاجی صاحبؒ کی قوتِ علمیہ کا معتقد ہوں۔

جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضۂ پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتا، تو فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔ میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار کر ننگے پاؤں ہمراہ مولانا مرحوم کے چلنا شروع کیا، اس قدر پتھریاں پیر میں چبھنے لگیں کہ تحمل نہ ہو سکا۔ آخر پھر جوتا پہن کر چلنے لگا؛ مگر مولانا مرحوم مدینۂ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے۔ مجھ کو سخت تعجب تھا کہ ننگے پیر کیوں کر آدمی ان خاردار پتھریوں میں چل سکتا ہے؟ حال آں کہ مولانا مرحوم از فرق تا قدم نہایت نازک ونرم تھے؛ مگر قوتِ عشق کے نزدیک سنگ وگل برابر ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبت اور عشق تھا؛ حتیٰ کہ اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہو جاتی تھی، جو معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔

مدینہ شریف میں جناب شاہ عبد الغنی صاحبؒ کے مکان پر قیام کیا، جو مولانا مرحوم کے استاد حدیث تھے۔ سوائے ابوداود کے صحیحین اور سنن ثلاثہ ان سے پڑھے تھے، اور ابوداؤد جو باقی تھی، ان کو اپنی شہرت کے زمانے میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارن پوریؒ کی خدمت میں جا کر پڑھ لیا اور ایسے نکات حدیث وقت درس کے بیان کیے۔ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام میں طلبہ فارغ التحصیل کے روبہ روان توجیہاتِ مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا صاحبؒ کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

توجیہ حدیث:

چناں چہ ان میں سے ایک توجیہ بیان کرتا ہوں، وہ اس شبہ کا جواب ہے، جو حدیث شریف میں آیا

ہے کہ لفظ "غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ" اس وقت نازل ہوا، جب کہ عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ اس آیت میں جہاد کے واسطے حکم ہے، میں اندھا کس طرح جہاد کر سکتا ہوں؟ اس پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایسی شکایت ہوگی، پس پہلے ہی آیت سابق کے ہمراہ یہ لفظ کیوں نہیں فرمایا؟

مولانا مرحوم نے اس شبہ کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے "لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ" فرمایا ہے، "اَلْمَقْعُدُوْنَ" نہیں فرمایا۔ عذر والے "مَقْعَدُوْنَ" میں داخل ہیں، اور بلا عذر بیٹھنے والے "قَاعِدِیْنَ" کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بیان فرما دیا، جب نہ سمجھے، تو یہ لفظ بڑھانے کی اجازت دے دی گئی۔ کیا عمدہ توجیہہ ہے۔

بے خوفی اور توکل:

واپسی کے وقت جدہ میں کشتیوں پر سوار ہو کر سب قافلہ جہاز پر سوار ہونے کو جاتا تھا، اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں قریب غرق ہونے کو جھک جاتی تھیں، ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا؛ مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے، اور مولانا رشید احمد صاحبؒ جب کشتی قریب ڈوبنے کے ہو جاتی مسکراتے تھے، باقی سب بدحواس ہو گئے تھے۔ غرض صحیح و سالم جا کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ ہاں! خوب یاد آیا، سوار ہونے سے قبل دو دن سمندر کے کنارے پر بہ طور سیر کے یہ کاتب حروف پھرتا تھا کہ ناگاہ جناب ظفر احمد عرف شیر شاہ ساکن رام پور ضلع سہارن پور مرید با اخلاص حضرت حاجی صاحبؒ موصوف کو کنارے سمندر پر پھرتا ہوا دیکھا، پہلی ملاقات تھی، بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے اور فوراً بیس روپیہ جیب میں سے نکال کر مجھ کو عنایت کرنے لگے کہ ان کو لے لو، تمہارے پاس خرچ نہ ہوگا اور فی الواقع بہ جز پانچ روپیہ کے میرے پاس کچھ باقی نہ تھا۔ میں نے نہیں لیے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیسے پہنچے؟ فرمایا کہ: بمبئی میں وقت پر جہاز نہ ملا، اب ایک جہاز آتا تھا، اس نے مجھے بٹھا لیا؛ اس لیے دیر ہو گئی، اب مدینہ شریف میں رہوں گا، سال آئندہ میں حج کر لوں گا۔

شاہ جی شیر شاہ صاحب ریاست رام پور میں صاحب خدمت تھے، تمام شہر کی گلی کوچے میں پہرہ دیتے، جو بیمار یا محتاج پاتے، اس کی غم خواری اور خدمت کرتے، جہاں شب ہوئی، وہیں لیٹ جاتے، بالکل متوکل بھوکے پیاسے خدمتِ خلق میں مشغول رہا کرتے۔ اگر کسی نے کھانے کے واسطے اصرار کیا کھا لیتے؛ ورنہ کچھ پروا نہ کرتے، اور جب تک بیمار اچھا نہ ہو جاتا، اس کی دوا دارو و تیمارداری بڑی خوشی سے کرتے تھے، جب وہ اچھا ہو جاتا، تب دوسری جگہ چلے جاتے۔ احکام شروع کے بے حد پابند تھے۔ ایک دن زمانہ

طا ب علمی میں جامع مسجد کے ندر عصر کی نماز صحن مسجد میں یہ کاتب لحروف پڑھتا تھا، یکا یک بہت زور سے پ نی برسنے لگا، مجھ کو فکر ہوئی کہ رو بہ رو میرے تین کتابیں رکھی ہیں، خر ب ہو جا ئیں گی، س وقت کوئی آ دمی مسجد میں نہ تھا، کا ویڑھیوں پر دھم دھم کی آ و زنی، جیسے کوئی دوڑ ہو چل آ تا ہے، ورفور وہ تین کتابیں ٹھا کر مسجد کے ندر لے گیا۔ جب میں نماز سے فارغ ہو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ شخص شیر شاہ صاحب ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آ پ س وقت کیسے پہنچ گئے؟ فرمایا کہ مسجد میں آ تا تھا، تمہاری کتابیں دیکھ کر ٹھالایا، حال آ ں کہ وہ وقت یسا نہ تھا کہ مسجد میں آ نے کی ضرورت ہو۔

یک دن آ دمی رت کے وقت میری آ نکھ کھل گئی، یک مسجد میں چار پائی پر سو رہا تھا۔ طبیعت میں بے ختیار پلاؤ کی طرف رغبت ہوئی، حال آ ں کہ کبھی یسی عادت نہ تھی، س وقت مجھ کو تعجب ہو کہ بھلا س وقت یسی شی کا بہم پہنچنا دشو رہے، ی خیال میں آ نکھ کھل گئی۔ یک شخص کو دیکھا کہ پیر پکڑ کر جگا تا ہے، غور کیا تو شیر شاہ صاحب ہیں، فرمایا: زر ٹھ کر یہ پلاؤ گرم ہے، کھالو۔ میری دعوت تھی، تمہارے وسطے صاحب خانہ سے مانگ کر لایا ہوں۔ مجھ کو زیادہ تعجب ہو، ور ن کے فرمانے سے حسب خو ہش نفس کے کھالیا لیکن کئی دن تک حیرت طاری ر ی۔

للہ تعالی نے مولانا مرحوم کو تقوی، زہد، معرفت، تصوف، سخاوت، شجاعت، حسن خلاق ورز بن سلیم یسا عنایت فرمایا تھا کہ جس کی کچھ نتہا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ و پسی میں جہاز کے ندر یسے بیمار ہو گئے کہ ٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ ی۔ بمبئی سے ریل میں ناوہ تک بیٹے ہوئے تشریف لائے، میری ر نوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے، ناوہ سے مجھ کو وطن جانے کی جازت فرمائی، ور چار روپیہ پنے پاس سے عنایت کیے ور پانچ روپیہ مکہ شریف میں مسجد بر ہیم علیہ لسلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے۔

وطن واپسی:

میں جب وطن آ یا چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا، س وقت مولانا صاحب کو چھا تن درست پا یا؛ بلکہ مجھ کو ملا جلال ول سے آ خر تک پڑھایا، لیکن پہلی سی قوت نہ تھی۔ س وقت مولانا صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے وسطے مولوی محی لدین حمد خاں صاحب مر د آ بادی ورمولوی عبد لعلی میرٹھیؒ ورمولوی رحیم للہ بجنوری حاضر تھے۔ میں ن کے سباق کی بھی سماعت کرتا تھا؛ لیکن ن کے فضل وکمال کو کہاں پہنچتا، ور ن سے پہلے جناب مولانا مرحوم کی خدمت بابرکت میں مولوی حمد حسن صاحب مروہیؒ ورمولوی محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ورمولوی فخر لدین گنگوہیؒ وغیرہ میرٹھ میں فارغ تحصیل ہو چکے تھے، ور کبھی کبھی نانوتہ

میں بھی مولانا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ میں نہایت محبت اور اتحاد تھا۔ کبھی گنگوہ کو کبھی رام پور ضلع سہارن پور میں جناب حکیم ضیاء الدین خلیفہ مجاز حافظ ضامن صاحبؒ اپنے پیر بھائی کے ساتھ جناب حاجی صاحبؒ کے ملنے کے لیے تشریف لے جاتے۔ ایک بار میں بھی ہم رکاب تھا۔ واپسی میں جب نانوتہ ایک میل رہا، مولانا صاحبؒ کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا، دریافت فرمایا، تو عرض کیا کہ: میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ فرمایا کہ کیوں؟ عرض کیا کہ تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا ہے، میں بالکل بے قصور ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے بچایئے۔ جس وقت مسجد نانوتہ میں پہنچے، تو بیٹھتے ہی مجھ سے فرمایا کہ: منشی محمد یٰسین کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا، ان سے عجیب شانِ جلالی سے فرمایا کہ: اس غریب کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے، تم اس سے کہہ دو کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو؛ ورنہ تم بھی نہ بچو گے۔ اگر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالو گے، تو تمہاری ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی۔ انہوں نے تھانہ دار کے پاس جا کر مولانا صاحبؒ کا ارشاد ہو بہو کہلایا، اس نے کہا: اب کیا ہو سکتا ہے، روزنامچے میں اس کا نام لکھ دیا ہے۔ جب انہوں نے مولانا صاحبؒ سے تھانے دار کا یہ جواب کہا، تو فرمایا کہ پھر جا کر کہہ دو کہ اس کا نام روزنامچے سے نکال دو۔ منشی صاحب نے تھانے دار سے جا کر یہی کہہ دیا۔ اس نے کہا کہ لکھا ہوا نام کاٹنا بڑا جرم ہے، چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی مولانا صاحب کے پاس چلتا ہوں، وہ حاضر ہو کر مولانا صاحبؒ سے عرض کرنے لگا کہ: حضرت! نام نکالنا بڑا جرم ہے، اگر نام اس کا نکالا، تو نوکری میری جاتی رہے گی۔ فرمایا کہ: اس کا نام کاٹ دو، تمہاری نوکری ہرگز نہیں جائے گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا صاحبؒ فرماتے ہیں، ایسا ہی ہوگا۔ جس نے وہ حالت دیکھی ہے، اس کے یقین میں ذرا شک نہیں؛ چناں چہ اس حجام کو چھوڑ دیا گیا اور تھانے دار بھی قائم رہا۔

قربانی کی رقم کا غیبی انتظام:

عید الاضحیٰ میں مولانا صاحبؒ کا دستور تھا کہ سالم جانور کی قربانی کیا کرتے تھے۔ صبح کے وقت میں بھی حاضر تھا، منشی محمد یٰسین صاحب تشریف لائے اور عرض کیا کہ: گائے کی قیمت سات روپیہ ٹھہر گئی ہے۔ فرمایا کہ: اچھا! وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں ایک مسافر آدمی جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا، آیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپیہ نکال کر مولانا صاحبؒ کی نذر کیے۔ مولانا صاحبؒ نے وہ روپیہ مجھے دیے کہ منشی یٰسین صاحب کو دے دو۔ میں نے دیکھا: تو سات ہی روپیہ تھے۔ حیران رہ گیا کہ خداوند! یہ کیا

اسرار اور راز و نیاز ہے؟

ایک دفعہ میں نے مولانا صاحبؒ سے بر سبیل تذکرہ شکایت کی کہ مجھ کو کبھی رونا نہیں آیا۔ اسی دوپہر کو جب سو کر اٹھا، تو اس قدر رویا کہ ہر چند چاہتا تھا کہ موقوف کردوں؛ لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے، اور کوئی رونے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر بہت دیر سے خیال آیا کہ صبح میں نے مولانا صاحبؒ سے درخواست کی تھی، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔

مولانا صاحبؒ کی عادت تھی کہ مسجد کے سہ دری میں بیٹھا کرتے تھے، اور وہیں مہمانوں کا قیام ہوتا تھا۔ اگر زیادہ مہمان آئے، تو اپنے ماموں کے مکان پر ٹھہرادیا کرتے تھے۔ میں سب مہمانوں کا بستر بچھایا کرتا تھا۔ ایک دن چند مہمان کھانا کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے، میں اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلوائے؛ مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا، اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلوائے۔ آخر وہ خود ہی لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا کہ مولانا صاحب نے اس سہ دری سے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھایا کہ میں حیران رہ گیا، اور دونوں ہاتھوں میں نہایت ادب سے لوٹا پکڑ کر اس بڈھے کے ہاتھ دھلا دیے۔ اس وقت کی ندامت جس قدر مجھ کو ہوئی ہے، بیان نہیں کرسکتا۔

منگلور کی مدرسی کے واسطے مہتمم صاحبؒ نے مولانا صاحبؒ سے مشورہ لیا، تو فرمایا کہ: پوڑے منصور علی کو بلالو، اس کو ضرورت ہے۔ جب خط طلبی کا پوڑ پہنچا، میں فوراً آ کر منگلور چلا گیا اور دو مہینے تک وہاں رہا، مدرسی کی۔ اتنے میں جناب مولانا صاحبؒ سے ہمراہیوں کے رڑکی کو مباحثہ سرپرستی کے تشریف لائے، اور تلمیذ رشید کو منگلور بھیجا کہ اس کو ملنے کے واسطے بلا بلاؤ، میں یہ مژدہ سنتے ہی مولوی فخر الدین صاحبؒ کے ہمراہ چلا گیا۔ سڑک پر بہلی کو ٹھہرا کر فرمایا کہ: تم بھی ضرور رڑکی آجانا۔ حسب ارشاد دو تین روز کے بعد میں بھی رڑکی پہنچا، تو چند روز مولانا صاحبؒ رڑکی میں قیام فرما کر منگلور میں میرے پاس دو دن ٹھہرے اور قاضی محمد اسماعیل وغیرہ نے مہمان نوازی کی خوب داد دی۔ وقت تشریف بری مولانا صاحبؒ کے میں بھی رخصت لے کر ہم رکاب ہولیا اور دیوبند سے وطن واپس چلا گیا۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات:

ادھر مولانا صاحبؒ کا مزاج پھر ناساز ہوا، ڈاکٹر عبدالرحمن نے علاج کے لیے اپنے پاس مظفر نگر میں مولاناؒ کو رکھا اور بہت خدمت و تیمار داری کی۔ میں مراد آباد سے قدم بوسی اور عیادت کے واسطے گیا، تو قدرے افاقہ تھا؛ مگر اصل مرض ابھی باقی تھا۔ خفیف بخار رہتا تھا۔ چند روز کے بعد مولوی رفیع الدینؒ مہتمم

مدرسہ کے خطوط جابجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے، جلد چلے آؤ۔ بندہ بھی خط دیکھتے ہی دیوبند پہنچا۔ مولوی ذوالفقار علی مرحوم کے مکان پر بڑا مجمع تھا۔ طرح طرح سے علاج کیا گیا؛ مگر کارگر نہ ہوا۔ جمعرات کو قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحبؒ کو مکان پر لے جانا مناسب ہے۔ چار پائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اٹھائے ہوئے مکان پر لے گئے۔ دو بجے کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ قریب چار پائی کے تشریف رکھتے تھے کہ انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مدرسے میں غسل دیا گیا۔ جنازے کو بعد عصر کی نماز کے اٹھایا گیا۔ سیکڑوں آدمی جنازے کو اٹھانا چاہتے تھے۔ حاجی محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ: اس قدر ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب کے سب مت کرو، چار پائی ٹوٹ جائے گی۔ قریب مغرب کے باغ میں جا کر جنازے کو رکھا۔ بعد نماز مغرب کے جب شب جمعہ شروع ہوئی، دفن کیا گیا۔ بہت آدمی جنازے میں کمبل پوش فقرا موجود تھے، بعد دفن کے سب غائب ہو گئے۔ دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی، میں اور مولوی احمد حسن صاحبؒ اور مرزا محمد نبی بیگؒ اور حاجی محمد اکبرؒ مرادآباد چلے آئے۔

حضرت نانوتویؒ کے عقائد وخصائل:

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ قرض لینے کا اگر اتفاق ہوتا، تو اس کو جلد ادا کر دیتے، اور فرماتے تھے کہ: دوستوں کا قرض جلد ادا کر دینا چاہیے۔ جھوٹ اور فریب سے بہت نفرت کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ادنیٰ شی بھی پیش کرتا، تو اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے اور حاضرین کو بھی کھلاتے۔ خوراک ان کی بہت قلیل تھی، کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا۔ نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے اور ہر لقمے پر بسم اللہ ضرور پڑھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت دیکھ کر خوشی بہت کرتے؛ مگر بہ قدر رنگ چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دیا کرتے۔ عمل ان کا سنی تھا۔ ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے۔

اور حضرت امام اعظمؒ اور حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے اور بہت ہی تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کو سب بزرگانِ دین کے علوم سے اعلیٰ اور افضل بتلاتے تھے۔ نماز با جماعت ادا کرتے اور تکبیر اولیٰ کو بھی ترک نہ کرتے۔ اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے۔ حافظِ قرآن شریف تھے۔ ہمیشہ تہجد میں قرآن شریف پڑھا

کرتے۔ جاہلوں کی نذر نیاز کا کھانا کبھی نہ کھاتے۔ بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے اور دعا کرکے چلے آتے۔ سماعِ اولیاء اللہ کے قائل تھے۔ اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے کہ: آپ میرے واسطے دعا کریں۔ اور ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے۔ مولانا بہت دیر تک شاہ کمل صاحبؒ کے مزار پر مراد آباد میں بیٹھے رہے۔ مجھ سے بہ وجہ کمزوری اپنے قدم کی حفاظت نہ ہوسکی اور میرا پاؤں مزار شریف سے لگا ہوا دیکھ کر کانپنے لگے۔ تمام بدن لرزتا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ سے میرا پیر اٹھا کر فوراً علاحدہ کردیا۔ مجھ کو بڑی شرمندگی اور خجالت ہوئی اور توبہ کی۔

مولانا صاحبؒ کے مراد آباد تشریف لانے سے تین چار ماہ قبل صوفی نسیم خاں صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالا خانہ دروازہ نواب شبیر علی خاں میں تشریف رکھتے ہیں اور بہت سے آدمی بیعت کے لیے آنے لگے۔ اس وقت خاں صاحب نے شیرینی منگوا کر صوفی صاحبؒ کے ہاں کہلا بھیجا کہ یہ اسی خواب کی تعبیر ہے، جواب ظاہر ہوئی۔

خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

ایسے چند اشخاص نے خواب میں یہی مضمون دیکھے۔ ایک صاحب نے دیکھا کہ: جامع مسجد مراد آباد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفید چادر پر تشریف رکھتے ہیں اور ایک آدمی کی جگہ خالی ہے۔ یہ صاحب خواب میں خالی جگہ پر بیٹھنے لگے، تو فرمایا کہ: یہ جگہ مولانا محمد قاسم کی ہے، دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔

اور ایک صاحب نے دیکھا کہ: لڑھکتا، گھومتا ہوا میری طرف آتا ہے، قریب میرے آگیا، میں نے اس کو ہاتھ لگا کر دیکھا، تو وہ بھی اسی خواب کی وجہ سے مولانا صاحب سے بیعت ہوئے۔

مولانا کی عادت تھی کہ جب کوئی جانا چاہے، کبھی اصرار سے نہ روکا۔ جب مولانا نے قصد بریلی کیا، تو حافظ عبدالعزیزؒ بھیجے حضرت میاں جی نور محمدؒ کے فرمانے سے دو روز اور ٹھہر گئے۔ میں ایک دن پہلے حصار سے آیا، میں نے بھی عرض کیا کہ: حضرت! میں آپ کی وجہ سے جلد آیا ہوں، دو روز اور قیام فرمائیے۔ فرمایا کہ: اگر میری وجہ سے آئے ہو، تو میرے ساتھ چلو، میں بھی بریلی کو چلا گیا۔

حضرت نانوتوی کی وفات پر چند ہدایات

کرامت نامے: اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہٗ

ذیل میں اعلیٰ حضرتؒ کے دو مکتوب گرامی درج کیے جارہے ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے انتقال پر حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کو تعزیت کے لیے لکھا تھا۔ دوسرا گرامی نامہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ (مہتمم مدرسہ) کو لکھا تھا۔ ان میں چند ہدایات بھی ہیں جو مشعلِ راہ ہیں۔ (نعمان)

(۱)

تم میں جو بڑے اور مدرسے کے سرپرست تھے، راہی دار بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اب تم سب کو چاہیے کہ جان و دل سے مدرسے کی بہبودی اور بھلائی میں کوشش اور سعی کرو، کہ جس سے نعمائے دارین حاصل ہوں۔ خصوصاً تم کو بہت کوشش چاہیے کہ تم کو سب صاحب اپنا بڑا سمجھتے ہیں۔ تم کو مناسب ہے کہ سب سے جس جس کام پر معین ہیں، اس سے بہ خوبی کام لو، اور چند ایک باتیں اپنی ذات پر لازم واجب جانو:

- مدرسے کے تمام اوقات میں مدرسے کے کام کے سوا کچھ کام نہ کریں، یعنی چھ گھنٹے ہر روز برابر کام کیا کریں۔
- مدرسے میں صحاحِ ستہ سال بھر میں اسی طرح ختم ہوا کریں، جیسے حضرت مولانا احمد علی مرحوم کے (یہاں) ہوتی تھی۔
- جملہ اہل مدرسہ کی دل داری اور دل جوئی کا خیال رکھیں اور سب سے بہ اخلاق پیش آئیں، غصہ اور خفگی کو بے موقع راہ نہ دیں۔

❁ اگر کسی روز اپنی ذاتی غرض سے کام نہ کر سکیں، تو مدرسے سے تنخواہ نہ لیں، جیسے مولوی مظہر صاحب کرتے ہیں۔

❁ مدرسے سے قرض لینا جائز نہ رکھیں کہ درست نہیں، اپنے خرچ میں کوتاہی کریں۔

❁ غرض ہر امر میں موافق اللہ ورسول کے حکم کرتے رہو۔ ایسا نہ کرنا کہ اللہ ورسول کے سامنے شرمندگی ہو۔

یہ جو باتیں لکھی ہیں، حاجت لکھنے کی نہ تھی کہ تم سب جانتے ہو؛ مگر فقیر بھی ثواب میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اگر تم سب ان امور کی رعایت رکھو گے، مجھ کو بھی ثواب ہوگا، اور فقیر کو تم سے یہی توقع ہے کہ مدرسے کے ان سب امور کو بہ خوبی بجالاؤ گے اور بھلائی اور فلاح دارین کی حاصل کرو گے۔

(۲)

ایک اور گرامی نامے میں شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسۂ عربیہ (دار العلوم) دیو بند کو لکھا:

عزیز من! جو تم میں بڑے سرپرست مدرسے کے تھے، وہ جنت الفردوس کو سدھارے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم سب صاحب بہ دل مدرسے کی بہبودی میں مصروف ہو؛ مگر فقیر بھی تم کو لکھ کے داخل ثواب ہوتا ہے۔

عزیز من! تم کو کہ مدرسے کے مہتمم ہو، چند امور کا لحاظ چاہیے:

❁ اگر کسی کے ساتھ بےوجہ رعایت اور مروت کرو گے، تو کل کو جواب دینا ہوگا۔

❁ مدرسے کا مال بیت المال ہے، اس سے قرض دام اور پیشگی تنخواہ مت دیا کرو، تم کو اس میں تصرف نہیں پہنچتا۔

❁ تیسرے: یوں تو سارے مدرس اس مدرسے کے فقیر کے عزیز اور پیارے ہیں؛ مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب سے چند وجوہ سے زیادہ واسطہ ہے؛ لہٰذا اگر وہ مدرسے کے کسی کام میں کوتاہی کیا کریں، تو ان سے کام لیا کرو۔ ان شاء اللہ! وہ اس سے ناراض نہ ہوں گے؛ کیوں کہ داتا ہیں۔

❁ چوتھے: عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور دوست ہیں، سب مدرسے کی طرف توجہ رکھیں، کہ عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگار یہی مدرسہ ہے، اس سے غفلت نہ کریں۔

❁ پانچویں: عزیزم مرحوم کی اولاد کے ساتھ آپ صاحب رعایت اور مروت رکھیں، خصوصاً علم اور تربیت امور خیر میں بہت لحاظ رکھیں۔ فقیر چاہتا تھا کہ برخوردار احمد کو، یعنی فرزند عزیزم مرحوم کو اپنے پاس

بلا کر رکھوں اور یہاں مدرسے میں مولانا مولوی رحمت اللہ کی خدمت میں تحصیل علم کرے، اور جب تک فقیر جیے، اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھے؛ مگر اس کی والدہ شاید جدائی کو گوارہ نہ رکھیں، فقیر کو اس کی خاطر منظور ہے۔ اس واسطے اس امر میں سکوت کیا۔ بہر حال! دعا پر اکتفا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو سب برائیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھے اور علم نافع وعمل صالح نصیب کرے۔ آمین!

بہ خدمت جمیع عزیزاں و دوستاں سلام و دعا قبول باد۔

اور مضمون بالا کو واحد تصور فرمائیں۔ مکرر ہے کہ ہمیشہ مدرسے کی اطلاع کرتے رہیں، تا کہ ہر ایک کا حال معلوم ہوتا رہے[1]۔

(۱)(ماخوذ از): تحقیق معاملات دیوبند، ص:۳۴، ۳۵۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں

حضرت مولانا ذو الفقار علی دیوبندی○

ے برادر ن سلام. امت خیر نام، مشائخ دین، عیان ملت، عارفان وقت، علمائے عصر، حکمائے روزگار، صحاب تفسیر وحدیث، اہل فقہ وخیر کثیر، ر.ب قلم، شہسو ر ن خطابت، صحاب زہد وتقوی، صاحبان جود وسخا. بتادو دنیا سے کون چل بسا۔

ے شریعت وطریقت ورحقیقت کے علم بردرو بتادو دنیا سے کون رخصت ہوگیا۔ کیا تم جانتے ہو کس سخی کی وفات کا سانحہ پیش آ ‍یا؟ کون سا در ‍یا خشک ہوگیا؟ کس سورج کو گرہن لگا؟ کون سا شجر سایہ دار سوکھ گیا؟ خدا کی قسم. مولانا قاسم کی رحلت سے دین کی رونق، یمان ویقین کی روشنی ورحق وصداقت کی چمک جاتی رہی۔ جس وقت کہ وہ زندگی کے سانس پورے کرکے واصل بہ حق ہوگئے ور جو ن نے ن سے بے وفائی کرکے حباب کو سوگوار کیا۔ نا للہ و نا لیہ راجعون.

ؔ بو لقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کا سوہ پیش نظر نہ ہوتا، تو ن کی موت میرے لیے جان لیوا ہوتی۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے، گو‌یا مولانا مرحوم ہی کا مرثیہ کہتے ہوئے س نے (درج ذیل) شعر کہے ہیں، ترجمہ:

س شخص کی زبان میں تیری ثناخواں ہے، جس کے ساتھ تو نے کوئی حسان نہیں کیا س کی وجہ یہ ہے کہ تو بذات خود مستحق ستائش ہے

۱- مرحوم کے کارناموں نے ن کی زندگی کو بحال کردیا ہے، گو‌یا وہ پنے س ذکر خیر کی بدولت زندہ ہیں

۲- لوگ ن کے ماتم میں یک زبان ہیں۔ یہ گھر میں یہ وزاری ور آہ وفغاں بپا ہے۔

۳ س چار پانچ گز زمین پہ تعجب ہے، جس کے ندر یک عظیم ور بلند پہاڑ چھپ گیا ہے

○ ولد گرامی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے مرثیہ کا اردو ترجمہ)

میں نے بھی مولانا مرحوم کے مرثیہ میں سابقہ اشعار کے وزن پر کچھ شعر کہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں مرحوم کے فیوض و برکات سے بہرہ مند کرے:

یَا قَاسِمَ الْخَیْرِ! مَنْ لِلْعِلْمِ وَالدِّیْنِ
إذَا ارْتَحَلْتَ وَإِرْشَادٍ وَتَلْقِیْنِ

''اے قاسم الخیرات بتایئے! تمہاری رحلت کے بعد علم و دین کی اشاعت اور ارشاد و تلقین کا فریضہ کون انجام دے گا''؟

یَا قَاسِمَ الْخَیْرِ! مَنْ لِلطَّارِقِیْنَ وَمَنْ
لِلضَّارِعِیْنَ مَکْرُوْبٍ وَمَحْزُوْنٍ

''اے قاسم الخیرات بتایئے! مہمانوں، کمزوروں، غم زدہ اور ستم رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کون کرے گا''؟

یَا قَاسِمَ الْخَیْرِ! اِسْمَعْ مَنْ لِکُرْبَتِنَا
یَا قَاصِمَ الظُّلْمِ! قُلْ مَنْ لِلْمَسَاکِیْنِ

''اے قاسم الخیرات! سنیے تو سہی! مصیبتوں میں ہمارے کام کون آئے گا؟ اے ظلم و جور کو مٹانے والے! بے کسوں پر رحم کون کھائے گا''؟

مَنْ لِلْمَدَارِسِ مَنْ لِلْوَعْظِ مَنْ لِهُدَی
مَنْ لِلنُّکَاتِ تَوْضِیْحٍ وَتَبْیِیْنِ
مَنْ لِلشَّرِیْعَةِ أوْ مَنْ لِلطَّرِیْقَةِ أوْ
مَنْ لِلْحَقِیْقَةِ إذَا رُبْتَ فِی الطِّیْنِ

''آپ کے قبر میں جانے کے بعد اب مدارس کی دیکھ بھال، وعظ، تلقین اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے کون ہے؟ کوئی ہے جو نکات بیان کرے گا اور مشکل مباحث کو حل کرے گا؟ کون شریعت وطریقت اور حقیقت کے احکام واسرار سمجھائے گا؟

رَحَلْتَ عَنَّا وَلَمْ یُوْجَدْ عَدِیْلُکَ فِی
الْعُلُوْمِ وَالْفَضْلِ مِنْ غَرْبٍ إلَی الصِّیْنِ

''آپ ہم سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ عرب سے چین تک کوئی علم و فضل میں آپ کا ہم پلہ نہ تھا''۔

سـا عنٍ حـوذي سـدمـع عبـر مُـنـقـطـعِ

عـلـى لـدي حـلَّ مـنْ مـدحٍ و ثـانـبِ

''ے چشم من. تو پیہم آنسوؤں کو س ذ ت پر برسا جو تعریف ور مر ثیے سے بالاتر ے''

كهفُ لـوری حـجـــةُ لاسـلام مُـرشـدُهُ

سـحـمُ لهـدية رجـمٌ لـلـشـيـاطـين

''جو مرجع خلائق، سلام کی برہان، س کا مبلغ، رشد و ہدایت کا مینارہ ے، جو شیطان کے لیے شہاب ثاقب ے''۔

سـحـرُ لـعـلـوم مـام لـكـون كـرمـه

مـبـارك لاسم والـزيتـون و لتين

''تین و زیتون کی قسم وہ علو کے بحر بے ں، کائنات کے پیش و د ہا بر کت نا و لے تھے۔''

لـمـذ مـضـى صاحـبي مـنْ فـي مـصـيـبـتـه

سـرتُ مـنْ دنـكـر سـلاءٍ وتـسـكـين

''میر رفیق چلا بنا، وہ رفیق کہ جس کے صدمے میں میں لوگوں کی تعزیت ور تسلی سے بری لذ مہ ہوں (یعنی میں خود مستحق تعزیت ہوں)''۔

مـنْ لـي سـمـدرٍ عـس لاحـر ن مـنـقـطـع

مـنْ بـقـلـب سـمـرٍ عـبـر مـقـرونِ

''مجھے بتایے! کون یسا شخص ے، جس کا سینہ غموں سے خالی ہو، ور کون ے، جس کا دل (غموں کی وجہ سے) صبر کا سہار نہ لیے ہوے ہو''۔

لـيـك صـبـري فشـيءٌ لـيـس يشـغـلـي

عـن لـحـلـيـل لا يـا سـلـوتـي بـي

'' ے میرے صبر. مجھے تیری ضرورت نہیں، س لیے کہ (دنیا میں) یسی کوئی چیز نہیں جو مجھے میرے دوست سے غافل کر دے، ور ے سامان تسلی. تو بھی پنا کام کر چلتا بن''۔

وكـيـف مـا سـرؤه و لـــرب ولا

يـكـونُ لـلـشـمـس مـنْ سـتـرٍ وتـدفـين

''میرے ممدوح کو لوگوں نے کیسے زمین میں چھپا دیا؟ جب کہ سورج کو نہ چھپایا جا سکتا ے، نہ دفن کیا جا سکتا ے''

وَهُوَ الْيَقِينُ اِنِّي لَاحِقٌ بِكُمْ
اِذَا ارْتَحَلْتُمْ وَاِنْ اُخْرَ اِلَى حِينِ

’’آپ کے جدا ہونے کے بعد آپ کی جدائی کے احساس کو میرے اس تصور نے قابل تحمل بنا دیا ہے کہ مجھے بھی کچھ روز زندہ رہ کر آپ سے آ ملنا ہے‘‘۔

سَقَى الْاِلٰهُ ضَرِيحًا اَنْتَ سَاكِنُهُ
وَيَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ يُمِدُّ بِتَأْمِينٍ

’’اللہ تعالیٰ اس قبر کو سیراب کرے، جس میں آپ آرام فرما ہیں، اور جو ہماری اس دعا پر آمین کہے، اس پر بھی اللہ رحم فرمائے‘‘۔ ’’آمین!‘‘۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ج: ۳، ص: ۱۷۷ – ۱۷۹۔

حضرت نانوتویؒ کے ایک مضمون سے
قادیانی وکیل کا استدلال اور اس کا جواب

افادات: محدثِ کبیر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ:

حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ (داماد حضرت شاہ صاحبؒ)

قادیانی مختار نے کہا: "تحذیر الناس" میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے بھی خاتم النبیین کے بعد نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔ اس پر فرمایا:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے الہامی مضمون میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر بہت قوی دلائل وبراہین قائم کیے ہیں، اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر ماثور کی گراں قدر علمی توجیہات بیان فرمائی ہیں۔

اس رسالے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جابجا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور مضمونِ ختم نبوت کا بہ درجۂ تواتر منقول ہونا اور اس کے منکر کا کافر ہونا بھی ثابت فرمایا ہے۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے جج صاحب کو "تحذیر الناس" کے صفحہ ۱۰ کی عبارت پڑھ کر سنائی۔

اور فرمایا کہ: حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مناظرۂ عجیبہ" جو اسی موضوع پر ہے، نیز "آبِ حیات"، "قاسم العلوم" وغیرہ دیکھی جائیں۔

حضرت مولانا مرحوم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک دو نہیں: بلکہ تین قسم کی خاتمیت ثابت فرمائی ہے:

۱- بالذات: یعنی مرتبہ حضور کا خاتمیت ذاتی کا ہے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں، اور دوسرے سب انبیائے کرام علیہم السلام موصوف بالعرض، اور آپ کے

واسطے سے، جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے، اور اس کے ذریعے سے تمام کواکب، قمر وغیرہ اور دیگر اشیائے ارضیہ متصف بالنور ہوتی ہیں۔

یہی حال وصفِ نبوت کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وجہ سے سب سے پہلے نبوت ملی ہے، اور آیتِ میثاق:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ، ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ"(۱).

سے واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اس کے رسول ہیں، نبی الانبیاء بھی ہیں۔ تمام انبیا کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف، اور سب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، اور آیت میں "ثُمَّ جَآءَ کُمْ" فرما کر یہ بھی تصریح کردی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

لیلۃ المعراج میں انبیا علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا منتظر رہنا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت کرنا بھی اس امر کی صراحت کرتا ہے، نیز:

"وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رُّسُلِنَا" (الآیہ)

میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

الاتقان میں ہے: ابن حبیب، عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی، پھر انبیائے بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لیے تشریف لانا، اور شریعتِ محمدیہ پر عمل فرمانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے، اور اس سے فضیلتِ محمدیہ کو واشگاف کردینا مقصود ہے۔ واضح ہو کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام اسلام کا عقیدۂ اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

۲- خاتمیت زمانی: یعنی آپ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدے میں انبیا علیہم السلام کے آخر میں ہے، آپ کے بعد کسی کو نبوت تفویض نہ ہوگی۔ ساتویں جلد روح المعانی میں حضرت ابی ابن کعبؓ سے مرفوعاً مروی ہے:

"بُدِئَ بِيَ الْخَلْقُ وَکُنْتُ آخِرَھُمْ فِي الْبَعْثِ".

---

(۱) سورۂ آل عمران: ۸۱۔

''مجھ سے پیدائشِ مخلوق کی ابتدا کی گئی؛ لیکن میری بعثت سب سے آخر میں ہوگی''۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے:

''كُنتُ أوّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الخَلقِ وَآخِرَهُمْ فِي البَعْثِ''.

''میری پیدائش تمام انبیا سے پہلے ہوئی، اور بعثت سب کے بعد ہوگی''۔

حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے:

''یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم جلوہ افروز ہوئے، وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے، اور اس کے اوپر کوئی زمین نہیں''۔

اس کو بہ دلائل ثابت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا اتباع سنت میں گہرا رنگ اور خاص مزاج و مذاق

حضرت سائیں توکل شاہ انبالویؒ

مرتب:

حضرت مولانا سید نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہ

حضرت مولاناؒ کا اتباع سنت میں کیسا اونچا مقام تھا، اور حضرت مولاناؒ ہر ایک قدم پر اتباع سنت اور طریق نبوی کی تحقیق، اس کی حتی الامکان پیروی، اور اس پر قدم بہ قدم عمل کا کس قدر غیر معمولی اہتمام کرتے تھے؟ مولاناؒ کے اصحاب و متوسلین کی اطلاعات و روایات کے علاوہ بعض اور ذرائع سے بھی اس کی تحقیق و تصدیق ہو رہی ہے۔ تصدیق بھی ایسے حضرات کی، جو خود راہِ معرفت کے رہ نورد، اور مراتب سنت کے رمز شناس تھے۔

حضرت مولاناؒ کے ایک مشہور معاصر اور نامور درویش ''سائیں توکل شاہ'' صاحب انبالویؒ (وفات: ۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ/۲؍ اگست ۱۸۹۷ء) کو ایک مرتبہ حضرت سرور کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، دیکھا کہ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے جا رہے ہیں، سائیں صاحبؒ نیز ایک اور شخص (جن کو شاہ صاحبؒ نے پہچانا نہیں، دونوں) شوق زیارت میں پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ سائیں صاحبؒ تو دوڑے جا رہے ہیں؛ مگر وہ شخص اپنا ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھال کر رکھ رہے ہیں۔ سائیں صاحبؒ نے دیکھا، تو خیال آیا کہ شاید یہ شخص بدشوق یا ناواقف ہے، جو اس طرح سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔

سائیں صاحبؒ نے پہلے تو اس سے پوچھا: تم کون ہو؟

جواب ملا کہ میں ''محمد قاسم (نانوتوی) ہوں۔

''شاہ صاحب نے جو حضرت مولاناؒ سے پہلے سے غائبانہ یقیناً واقف تھے) مولانا سے کہا: ''ہا با شوق نال بھجیا'' (بھائی! شوق سے دوڑ کر آ)۔

حضرت مولاناؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا، وہی مولانا کی زندگی کا جوہر، دار العلوم دیو بند کا ذوق و مزاج اور دین کی اصل اصول ہے۔ جس نے اس نکتے کو پالیا، اس کو یقیناً دین کا صحیح ذوق حاصل ہوگیا، اور اگر خدانہ خواستہ اس میں کچھ نقص یا کمزوری ہے، تو یہ دیکھنے والے کے دین کا نقص اور کمزوری ہے، اور حق یہ ہے کہ ؎

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

حضرت مولاناؒ نے سائیں صاحب کے جواب میں فرمایا تھا کہ:

''میں تو نشان قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں تامل کرتا ہوں۔ جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشان قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔ گو دیر میں پہونچوں؛ مگر قدم بہ قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا''۔

اس خواب کا سائیں توکل شاہؒ نے اپنے ایک مسترشد مولانا مشتاق احمد انبیٹھویؒ (وفات: ۲۷رمحرم ۱۳۶۱ھ/۱۴ر فروری ۱۹۴۲ء) سے خود ذکر کیا تھا۔ مولانا مشتاق احمدؒ نے لکھا ہے:

''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، مولانا محمد قاسمؒ تو جہاں پائے مبارک حضور کا پڑتا ہے، وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں، اور میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچوں؛ چناں چہ میں آگے ہوگیا''(۱)۔

مولانا مشتاق احمدؒ کے خلیفہ مولانا نور بخش توکلیؒ نے بھی یہ خواب سائیں صاحبؒ کے تذکرے میں نقل کیا ہے۔ مولانا نور بخشؒ لکھتے ہیں:

''شیخنا العلامہ مولانا مولوی حاجی حافظ مشتاق احمد صاحب چشتی صابری، ادام اللہ تعالیٰ فیوضہ لکھتے ہیں کہ حضرت مخدومنا توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بر سبیل تذکرہ عاجز سے فرمایا کہ: ایک مرتبہ خواب میں یہ دیکھا کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، اور مولانا محمد قاسم دیو بندیؒ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دوڑے کہ جلد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچیں۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ تو وہاں اپنا قدم رکھتے تھے، جہاں حضور رسول اکرم

---

(۱) انوار العاشقین، ص: ۸۸۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا نشان ہوتا تھا؛ مگر میں بے اختیار جارہا تھا، آخر مولانا سے آگے ہوگیا، اور پہنچ گیا''(۱)۔

مگر مذکورہ دونوں روایتوں میں صرف اس خواب کا ضروری حصہ اور خلاصہ نقل کیا گیا ہے، مفصل خواب اور روایت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ایک اور معاصر اور تذکرہ نگار منشی فضل حق دیوبندیؒ نے مولانا کی سوانح میں نقل کی ہے، جس سے اس خواب کے تمام اجزا کا علم ہوجاتا ہے، وہ الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

''ایک وسیع شاہراہ ہے، اس میں بہت سے نقشِ قدم معلوم ہوتے ہیں، اور چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ (توکل شاہ صاحبؒ نے پوچھا کہ): یہ نشان کس کے قدم کے ہیں؟ (جواب میں) آواز آئی کہ حضرت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سواری اسی راہ سے گئی ہے، اور جملہ صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ بھی اسی راہ سے گئے ہیں۔

شاہ جی کو شوق زیارت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از حد ہوا، اور کمال شوق میں بے تحاشا دوڑے کہ جلد تر زیارت سے مشرف ہوں، اسی دوا دوش میں کبھی شاہ جی کا قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑا، اور کبھی صحابۂ کرامؓ اور کبھی تابعینؒ، کبھی تبع تابعینؒ پر۔ اسی حالت میں جو یکایک (شاہ جی صاحبؒ) کی نظر پھری، تو دیکھا کہ ایک اور شخص بھی اسی راستے کو آتا ہے؛ مگر آہستہ آہستہ سے چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شوق ہے، اور اس شخص کے پاس آکر پوچھا کہ تم کون ہو؟ (جواب دیا کہ میں) 'محمد قاسم ہوں'! شاہ جی کہا: 'بابا شوق نال بھجیا۔' (بابا شوق کے ساتھ دوڑ)۔ (مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا): میں تو نشان قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں تامل کرتا ہوں، جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشان قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔ گو دیر میں پہنچوں، مگر قدم بہ قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا''(۲)۔

---

(۱) تذکرۂ مشائخ نقشبندیہ، ص:۳۰۶)

(۲) انوار قاسمی، ج:۱، ص:۱۰۷۔

مضمون ماخوذ از: (مجلہ صحیفۂ نور، کاندھلہ، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ص:۴۳-۲۴۰)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، عارف باللہ ولی کامل

حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی قدس سرہٗ

ترجمہ:

مولانا عبد القدوس قاسمی نیرانوی

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے مدرسۂ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند کے ابتدائی حالات پر عربی میں ایک مختصر، مگر جامع رسالہ مرتب فرمایا تھا، جو "اَلْهَدِيَّةُ السَّنِيَّةُ فِي ذِكْرِ الْمَدْرَسَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الدِّيُوْبَنْدِيَّةِ" کے نام سے ۱۳۰۷ھ/(۱۸۸۹ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا پرزور، پرجوش اور ایسا محبت آمیز تذکرہ کیا ہے، جس طرح کوئی عقیدت مند، یا چھوٹا اپنے بڑوں کا کرتا ہے۔ اسی میں مولانا محمد قاسمؒ کی وفات کا تذکرہ اور عربی فارسی کے مرثیے بھی شامل ہیں۔ یہاں حضرت مولاناؒ سے متعلق عربی منظومات اور مرثیے کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

> ''الهدیۃ السنیۃ'' مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے عربی ادب میں مہارت وکمال کی ایک یادگار ہے، اور اس کا ترجمہ بہت آسان نہیں ہے۔ راقم سطور نے اس خدمت کے لیے اپنے فاضل دوست مولانا عبد القدوس صاحب قاسمی نیرانوی سے گزارش کی، مولانا ناچیز کا خط ملتے ہی ازراہِ کرم خود آئے، اور یہیں بیٹھ کر گویا ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ اردو ترجمہ کردیا۔ مولانا کے دلی شکریہ کے ساتھ یہ ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ (نور)

اردو ترجمہ:

"اَلْهَدِيَّةُ السَّنِيَّةُ فِي ذِكْرِ الْمَدْرَسَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ الدِّيُوْبَنْدِيَّةِ"۔

حمد وثنا اور درود وسلام کے بعد عرض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ شانہ وعز سلطانہ نے اس ملک میں خیر برپا کرنے اور ازعان ویقین اور تحقیق وتصدیق کے ساتھ دینی علوم اور ضروری فنون کے احیاء کے ذریعے بندوں

⭘ والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ۔

کی راہ نمائی کا ارادہ فرمایا، تو ایک ایسے شخص کے دل میں مدرسے کی تاسیس کا خیال ڈالا، جو ذات سے سید، حسب ونسب میں اعلیٰ، شرافت ونجابت میں یکتا، قدسی صفات اور خداداد عظمت کے مالک، خوش تدبیر، چھوٹوں کے لیے شفیق، بڑوں کی توقیر کرنے والے، اپنی مثال آپ۔ حسن وجمال، شوکت وجلال، صورت و سیرت، صفائی باطن، پاک طینتی، روشن فکری اور ذکاوت طبع میں بے مثال۔ بلند کردار، خوش منظر، صلاح و مشورے کی بھرپور قابلیت رکھنے والے۔ اگر کسی کو ہماری بات پر یقین نہ آئے، تو واقعہ یہ ہے کہ تجربات نے اس کی تصدیق کردی ہے۔ موصوف شرم وحیا، تقویٰ وعبادت، جود وسخا کے پیکر اور فخر روزگار ہیں۔ (جن کا نام نامی) عالی جناب ''محمد عابد'' ہے۔ اللہ انہیں قائم ودائم رکھے، ان کی بلند آرزوؤں کی تکمیل کرے، جب تک دنیا قائم رہے، اور پڑھنے لکھنے کا چلن رہے۔

اس مدرسے (مدرسۂ دیوبند) کی بنیاد تقوے اور بہترین طرز پر رکھی گئی ہے۔ اگرچہ نہ حالات موافق ہیں، اور نہ وقت سازگار ہے۔ یہ سب خدائے عزیز وعلیم اور حکیم وعلیم کا مقرر کردہ نظام ہے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کے اسباب اور افراد کار مہیا کردیتا ہے۔ جب وہ کوئی چیز چاہتا ہے، تو اس کے لیے اتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی باگ ڈور ہے، جس کے حضور تم سب کو جانا ہے۔

چناں چہ سید صاحب نے اس فکر کی تائید اور اس کار ثواب میں تعاون کے لیے ۱۲۸۲ھ / (۱۸۶۵ء) میں اہل خیر حضرات سے گزارش کی، انہوں نے آپ کی صدا پر کان دھرتے ہوئے لبیک کہا، اور آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے آپ کے پیچھے ہولیے۔ جس کے نتیجے میں مدرسہ آپ کی قابل قدر کوششوں سے علم اور اہل علم کا گہوارہ، فضل وکمال اور اس کے قدردانوں کا مرکز، دین اور اس کے حاملین کی پناہ گاہ بن گیا، اور اس میں تعجب کی کیا بات؟ بیٹا باپ کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے، اس سے نواز دیتا ہے۔ خدا کی ذات عظیم فضل والی ہے۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس طے شدہ کام کی تکمیل واستحکام اور اسلامی علوم کے احیا کے لیے گرامیٔ مرتبت عالم دین کو مامور فرمایا، جو خوش شکل، پاک باز، ہر دل عزیز، نظیف الطبع، روشن دماغ، خوش خلق، اسلاف کی یادگار، اخلاف کی بصیرت آموزی کا سرچشمہ ہیں۔ اسی طرح فضل وکمال، وفور علم، طبیعت کی پاکیزگی، قلم کی شگفتگی، ضبط وتحمل کے ساتھ وقار وتمکنت اور کشادہ ذہنی میں پورے عالم میں ان کی نظیر نہیں۔ جی ہاں! مولانا موصوف لیاقت ومہارت، نرم خوئی، قول وقرار کی پابندی، گفتار وکردار کی ہم آہنگی، شرافت،

زہانت، غیرت اور سخاوت و فیاضی میں بھی ممتاز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے وقت کے لیے چنا، منتخب فرمایا، جو اسلام کی بے چارگی اور اسلامی قیادت کے فقدان کا وقت ہے۔

میری مراد عارف باللہ، ولی کامل، ابوالہاشم مولانا ''محمد قاسم'' سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دست گیری فرمائے، اور ان کے مقام و مرتبے میں چار چاند لگائے۔ (ان کے اوصاف و کمالات اور عادات واطوار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خمیر) عالی ظرفی، شرافت، سخاوت، غیرت، سیادت، خوش بختی، عظمت و وقار، جود و عطا، قیادت، طہارت و نزاہت، خدمت خلق، رواداری، علم و حکمت، جذب تعاون، عفت مآبی، پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی، مصائب و آلام سے نمٹنے کی صلاحیت، تشکر و امتنان اور احسان و کرم؛ ایسے اوصاف کے مجموعے سے اٹھا ہے، اور اس سے ان کا وجود اور سراپا تشکیل پایا ہے، وہ بلندیوں کے حصول کے لیے بلا توقف اور ہمہ دم راتوں کو سرگرم سفر رہے۔ انہوں نے فضائل و مکارم سے آراستہ ہونے کے لیے دنوں کا سفر پیہم جاری رکھا۔ انہوں نے سید عابد صاحب'' کی پشت پناہی اور دست گیری کی، اور ان کے دوش بہ دوش کھڑے ہوگئے۔ پھر کیا تھا چمنستان علم لہلہا اٹھا۔ اس کے حوض بھر گئے۔ درخت اور جھاڑیاں گھنی اور شاداب ہوگئیں۔ طالبان علم طویل مسافت طے کر کے اس ریاض علم میں جوق در جوق آنے لگے۔ تشنگانِ علوم دور دراز مقامات سے اس کا رخ کرنے لگے۔ ہندوستان کے مختلف خطوں، جزیروں؛ بلکہ عرب جیسے ممالک سے بھی کتنے ہی طلبا ایسے ہیں، جنہوں نے علوم کی بلندیوں کو چھولیا، اور تکمیل کے بعد اس کی نشر واشاعت میں معروف ہوگئے۔ انہوں نے اپنے فیضان علمی سے (خلق خدا کو) خوب خوب سیراب کیا۔ کتنے ہی مدارس اس مدرسے کے طرز پر قائم کیے گئے، اور اسی کے نہج پر ان کے نظام کی تشکیل پائی۔ یہ سب کچھ مولانا قاسم (جو بھلائیوں کو پھیلانے والے اور ظلم و جور کو مٹانے والے ہیں) کی ذات بابرکات سے وجود پذیر رہا۔ ''اور جس نے اسلام میں کسی اچھے طریقے کی بنیاد ڈالی، تو اس کو اس کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملے گا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور باقی رہنے والی نیکیوں کا تیرے رب کے یہاں بہترین بدلہ ہے اور بہتر توقع''۔

میں نے مولانا کے فضل و کمال کی تعریف کرتے ہوئے (درج ذیل) اشعار کہے ہیں، اگرچہ میں کیا اور میری بساط کیا؟

اشعار کا ترجمہ:

۱- آخر کب تک دنیاداری میں پھنس کر دین سے غافل رہے گا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ قارون جب مال

از معیبت سے دو چار ہوا؟

۲- جو چیز تجھے عاریتاً میسر ہے، اس پر نہ اترا، تو خود لاچار اور لاچار کی اولاد ہے۔

۳- تو اپنی حماقت سے آگ کی طرح کیوں سر اٹھاتا ہے؟ تیری اصل تو پانی اور مٹی ہے۔

۴- ذرا صبر سے کام لے اور اس کدو کاوش کو جس کو تو کر رہا ہے، اس یقین کے ساتھ چھوڑ دے کہ جو رزق مقدر میں ہے، وہ مل کر رہے گا۔

۵- اگر فتنوں سے پاک زندگی کا تو خواہش مند ہے، تو خانہ نشینی اور عزلت گزینی اختیار کر۔

۶- اور محنت کے ساتھ علم کا طالب بن، اور اہل علم کے دامن سے وابستہ ہو جا، اللہ تعالیٰ تجھے شیاطین کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

۷- علم ایک بیش قیمت جوہر ہے، جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اس کو حاصل کر، بھلے یہ جنس گراں مایہ چھن میں دست یاب ہو۔

۸- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان صبح کے وقت میں فقیر و محتاج ہوتا ہے، اور شام کو بادشاہوں کا بادشاہ ہو جاتا ہے۔

۹- علم دو طرح کا ہے: ایک وہ جو ''خالص ہدایت ورحمت'' ہے، دوسرے وہ ''جس کی شریعت میں گنجائش نہیں''۔

۱۰- اس لیے محدث (مولانا قاسم) کی صحبت اختیار کر، خود فریبی اور غفلت میں مبتلا شیخ رئیس کو چھوڑ دے۔

۱۱- نہ اس کی ''شفا'' میں شفا ہے، اور نہ اس کے ''اشارات'' اور ''قانون'' میں کوئی فائدہ۔

۱۲- اس مہتم بالشان علم سے اشتغال رکھ، جس میں کوئی کجی نہیں، جس میں معنعن اور مسند حدیثیں ہیں، اور جس کا وحی الٰہی (قرآن کریم) سے گہرا رشتہ ہے۔

۱۳- علم وہی قابل اعتنا ہے، جس میں قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صدا بلند ہو۔ اس کے علاوہ تو شیطانی وساوس ہیں۔

۱۴- اگر اس سلسلے میں جاہل لوگ زبان درازی کریں، تو ان سے کہہ دے: چھوڑو! تمہاری سوچ تمہارے ساتھ اور ہماری سوچ ہمارے ساتھ۔

۱۵- اگر تو چاہتا ہے کہ حق واضح ہو جائے، تو رفیق من! حق و شریعت کے امام سے رجوع کر۔

۱۶- جو مرجع خلائق، خوبیوں اور بھلائیوں کے جامع، ان کے پھیلانے والے ہیں۔ جن کے انفاس

کے سامنے چمن کی عطر بیزی بھی ہیچ ہے۔

۱۷- وہ شریعت کے محافظ، طریقت کے امام، حقیقت کے نقیب اور عزت و تمکنت کے مالک ہیں۔

۱۸- مخلوق خدا کے راہ نما، ظن و تخمین سے نہیں؛ بلکہ پورے وثوق کے ساتھ حقائق و دقائق کی نقاب کشائی کرنے والے ہیں۔

۱۹- کوئی ایسا علم نہیں، جس کا چشمہ شیریں ان کے پاس نہ ہو، اور اس کے اسرار کی انھوں نے پردہ کشائی نہ کی ہو۔

۲۰- دوست زادے! تم نے اپنے احسان و کرم سے ہمیں اپنا اسیر بنالیا ہے، اور فی زمانہ تم بے کسوں کے والی ہو گئے ہو۔

۲۱- میری طرف برائے مہربانی نگاہ کرم کرو۔ جناب من! تمہاری ایک نظر میرے لیے کافی ہے۔

۲۲- تم ہمیشہ سلامت رہو، اپنا فیض عام جاری رکھو، بخشش کرو اور پیہم کرو، جب تک بارش باغات کو سیراب کرے۔

جب ہندوؤں کے عالم اور ان کی بڑی شخصیت "دیانند سرسوتی" نے اپنے بے بنیاد اور لچر دلائل کے ذریعے اپنے اعتقادات کی حقانیت کا دعویٰ کیا، اور اپنی مضحکہ خیز اور بے حقیقت باتوں کو بنیاد بنا کر دین اسلام پر اعتراضات کرتے ہوئے یہ کہہ کر للکارا:

"آ جاؤ میدان میں! ہے کوئی مائی کا لال جو مقابلہ کرے؟"

غرض حلق پھاڑ پھاڑ کر اس نے دعوت مبارزت دی، اور ہمہ حاضر اور غیر حاضر شخص سے نہ صرف مناظرہ کرنے کی بات کرتا؛ بلکہ لڑنے جھگڑنے کو تیار ہو جاتا، تو اس وقت اس نالائق کے اعتراضات کے حملے سے دین متین کی حفاظت کے لیے مولانا اٹھ کھڑے ہوئے، اور اس پر بچ نکلنے کی راہیں بند کر دیں۔ چناں چہ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، اور پھر گوز مارتا ہوا بھاگا۔ میں نے اس سلسلے میں درج ذیل اشعار کہے:

۱- دیانند حلق پھاڑ کر، ڈینگ مارتے ہوئے، خود بینی، فخر و غرور اور اتراہٹ کے ساتھ آیا، اپنی کذب بیانی پر نازاں اور بے اصل باتوں کو لے کر آپے سے باہر، جو اس نے کہا، وہ جھوٹ تھا۔

۲- اس نے ہر باشعور اور صاحب عظمت و شوکت انسان کو دعوت مبارزت دی۔ چناں چہ اسی کے تعاقب میں عظیم ترین اور یکتائے روزگار شخصیت اٹھی، جن کی ذات میں جادو تھا۔

۳- وہ شخصیت اچھائیوں کے پھیلانے والی، اور ظلم و جور کو مٹانے والی ہے، جس نے دین اسلام کو حسن و جمال سے آراستہ کیا۔

۴- ممدوح شیریں مشرب اور محقق ہیں، کسی طرح کی قیل وقال میں نہیں پڑتے۔

۵- وہ اپنے قول و عمل سے رشد و ہدایت کا مرجع ہیں، اور حال و مستقبل میں رہبری کا سرچشمہ۔

۶- پھر جب اس احمق کی حیلہ گری نے اس کو عاجز کر دیا، اور اس نے باور کر لیا کہ اب مناظرے میں اس کی آفت آ گئی۔

۷- تو شرائط مناظرہ بیان کرتے ہوئے اس نے چال چلتے ہوئے کہا: ایسے ایسے میں میں تیار ہوں؛ ورنہ ہرگز نہیں۔

۸- اس کا برا ہو، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا کہ پیچھے کو نہ پلٹا، اور اللہ تعالیٰ اس سے نبرد آزمائی کے لیے مسلمانوں کی طرف سے کافی ہے۔

۹- مخلوق خدا کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود و سلام ہو، جب تک ہوائیں بھاری بادلوں کو اڑائے پھریں[1]۔

---

(۱) مجلہ صحیفہ نور- کاندھلہ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء ص: ۵۲-۲۳۶۔)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید حضرت مولانا نانوتوی رح کی نظر میں

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ

اس زمانے میں یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ یزید کو اہل سنت میں شامل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسے بے قصور باور کرایا جا رہا ہے۔ کچھ تو اپنے حلقے کے وہ لوگ بھی ہیں، جو نیم زاویے بھی ہیں؛ لیکن ظلم یہ ہے کہ وہ یزیدی حلقے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ یہ تحریر اس سلسلے میں روشنی کا ایک مینار ثابت ہوگی۔ یہ تحریر دراصل ایک مکتوب کی صورت میں ہے۔ (نعمان)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے (جنہیں مکتوب لکھا گیا ہے وہ مراد ہیں) ان امور میں، جن کو میں نے درباۂ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے نام زد کرنے کے لیے کہا تھا، بہ خوبی غور نہیں فرمایا، جو اشکال آپ نے ظاہر فرمائے ہیں، وہ اسی بنا پر ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ "قاسم العلوم" نمبر ۴، صفحہ: ۱۳، میں تحریر فرماتے ہیں:

"تا وقتے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید را ولی عہد خود کردند فاسق معلن نہ بود، اگر چیزے کردہ باشد، در پردہ کردہ باشد کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ را از اں خبر نہ بود۔ علاوہ بریں حسن تدبیر در جہاد آں چہ کہ از و مشہور است در بیت ام ملحان رضی اللہ عنہا کہ حضرت رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین یک بار دو بار خفتند و بے دار شدند، ہر بار خندیدند و در وجہ خندہ فرمودند کہ جماعے از امتیان خود را دیدہ ام کہ در دریا جہادی کنند و در شان ایشان فرمودہ اند:

"مُلُوْکٌ عَلَى الْأَسِرَّةِ أَوْ مِثْلَ الْمُلُوْكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ".

مصداقِ خواب ثانی ہمیں یزید و ہم راہیانش برآمدند۔ چناں چہ بر تاریخ داناں وحدیث خواناں پوشیدہ نیست، غایت مافی الباب! بہ سبب خرابی ہائے پنہانی کہ داشت ہم چو منافقان کہ در بیعۃ الرضوان شریک بودند، بہ وجہ نفاق رضوان اللہ نصیب ایشاں نشد، یزید ہم از فضائل ایں

بشارت محروم ماند، وایں طرف مذہب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ در بارۂ خلافت آں بود کہ ہر کرا سلیقۂ انتظام مملکت زائد از دیگراں باشد، گو افضل از و باشد، افضل است از دیگراں نظر بریں او را افضل از دیگراں دانستند، واگر افضل نہ دانستند، پس بیش ازیں نیست کہ ترک افضل کردند۔ چناں چہ در مقدمات سابقہ واضح شدہ کہ استخلاف افضل افضل است، نہ واجب؛ لیکن ایں قدر گناہ نہ تواں گفت کہ بہ سب وشتم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پیش آئیم، وایں طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ را از اجلۂ صحابہ نمی شماریم کہ بہ نسبت ترک افضل واَولیٰ ہم دریں چنیں امور معذرت نمائیم، ہاں پس از انتقال اوشاں یزید پائے خود از شکم برآوردہ دل بہ کام دست بہ جام برد، اعلان نمود ترک صلاۃ داد، بہ حکم بعض مقدمات سابقہ قابل عزل گردید، وایں قسم تحول احوال گفتہ آمدہ ام کہ ممکن است محال نیست؛ مگر دریں وقت رائے اہل الرائے وتدبیر مختلف افتاد کسے را کہ اندیشۂ فتنہ وفساد غالب افتاد، ناچار دست بہ بیعتش بہ کشادہ واحتراز عن المعصیۃ شرط اتباع معروف درمیان نہاد، وآں را کہ بہ عدۂ یک جماعت کثیرہ مثلاً: امید غلبہ ورجا شوکت بہ نظر آمد، حسبۃً للہ برخاست وتہیہ کارزار ساخت، پس ہر چہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما وامثال اوشاں کردند بجا کردند، وآں چہ حضرت سید الشہداء نمودند عین حق وصواب نمودند، بنا ایں اختلاف بر اختلاف امید است نہ بر اختلاف در جواز اصل فعل وعدم جواز آں؛ مگر انجام کار بہ وجہ نقض عہد کوفیاں تدبیر حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ بر نشانہ نہ نشست وروز عاشورہ قیامت قبل از قیامت در میدان کربلا برکاست۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

برہمیں کار نہ فقط حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ را پیش آمد در جہاں ایں چنیں اکثر پیش می آید، واقعۂ احد وحنین شنیدہ باشی۔ پس چناں کہ شہیدان احد وحنین بذروہ شہادت رسیدہ اند وازاں برہمی کار خللے در فضائل اوشاں را نیافت، ہم چنیں شہیدان کربلا را باید شناخت۔

وایں وقتے است کہ مجرد استخلاف امیر معاویہؓ یا بیعت مردم یا تسلط او خلافتش را عام وشامل شمارند واگر بہ ایں قدر کہ بہ وقوع آمد فقط بہ انعقاد مطلق خلافت او قائل شویم، وعموم وشمول خلافتش را تسلیم نہ کنیم، وگوییم کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ واتباع اوشاں از ربقۂ طاعت او ہنوز خارج بودند حالت عزل ہیچ نیست واوشاں را در خروج بر محذورے نے۔

وایں فرق انعقاد مطلق عموم انعقاد ہر چند امروز کم فہماں نہ فہمند؛ مگر بہ تتبع معاملات سابقین واضح است کہ بیعت ہر کس را از اہل حل وعقد فقط موجب اطاعت در حق او ودر حق خدم او می

شمردند و ارنہ و بعیت بیعت حضرت علی کرم اللہ وجہہ واہتمام بہ داں بردست حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چہ بود و ہم چنیں یزید بعد بیعت اہل شوم و دیگر اہل حل وعقد خواست کہ بیعت از حضرت حسین و عبد الرحمن ابن ابی بکر و دیگر رضوان اللہ علیہم نہ شدے، چوں ایک قدر دانستہ شد دیگر معلوم و کہ مدار کار بر نیت است بہ شہادت "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" وحسنِ نیت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ قابل آں نیست کہ در آں تردد کردہ آید۔

بعد ایں صورت در شہادت حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ چہ تردد نہ یزید در حق اوشاں خلیفہ بود، نہ خروج بر و ممنوع واگر خلیفہ بود تاہم خروج ممنوع نہ بود واگر خروج ممنوع بود عزل ممنوع نہ بود و بالجملہ وجوہ ممانعت مفقود و موجبات جہاد موجود در حسن نیت کلام نیست باز اگر اوشاں شہید نہ شوند دیگر خدا ہم خواہد بود و از یں ہم درگذر شتیم اگر موجبات جہاد نہ بودند اوشاں، نیز از قصد جہاد باز آمدہ می خواستند کہ براہ خود روند لشکریاں یزید پلید نہ گذاشتند و محاصرہ کردہ ظلماً شہید ساختند "مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهٖ وَمَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ".

باقی ماند و اوشاں مخالفتِ اجماع کردند جوابش ایں ست کہ اول اجماع مسلم نیست اگر باشد عدم مخالفت باشد، بایں ہمہ اجماع بر عدم جواز خروج بر ساق است ومعنی آں ہر چہ ہست عرض کردہ شد از اجماع بر عدم جواز خروج بر نفس فسق لازم نمی آید کہ خصوصیات زائدہ مراتب ایں کلی مشکک، نیز موجب خروج نتواں شد بایں ہمہ اجماع غیر مسلم وقتے کہ حضراتِ حسنین رضوان اللہ علیہما وعبد اللہ ابن الزبیرؓ و اہل مدینہ کارے کردہ باشند مخالفت آں را مجمع علیہ چگونہ تواں گفت واگر بالفرض اجماع را تسلیم کنیم آں اجماع اگر منعقد گردیدہ۔ بعد حضراتِ امام حسین رضی اللہ عنہ منعقد گردید مخالفت ایں اجماع حضرت امام رضی اللہ عنہ را چہ مضر۔ غایۃ ما فی الباب امام ہمام رضی اللہ عنہ و زبان خود در یک مسئلہ مختلف فیہ خطا کردند محذور فیہ۔ چناں چہ عرض کردہ باشد اکنوں وقت آں ست کہ عبارت نووی رحمہ اللہ تعالیٰ دریں بارہ نقل کردہ شود تا تفصیل اجمال وتصدیق ایں مقال بدست آید۔

"اجمع اهل السنة أن لا ينعزل السلطان بالفسق، وأما الوجه المذكور في كتب الفقه لبعض أصحابنا انه ينعزل وحكي المعتزلة أيضا فغلط من قائله مخالف الاجماع، قال العلماء: وسبب عدم العزالة وتحريم الخروج عليه ما يترتب على ذلك من الفتن واراقة الدما وفساد ذات البين، فتكون

المفسدة في عزله أكثر منها في بقائه، قال القاضي عياض۔ رحمه الله۔ أجمع العلماء على أن الامامة لا تنعقد لكافر وعلى أنه لو طرا عليه الكفر انعزل، قال: وكذا لو ترك اقامة الصلاة والدعا اليها، قال وكذالك عند جمهورهم البدعة، قال بعض البصريين: تنعقد له وتستدام له؛ لأنه متأول. قال القاضي: فلو طرا عليه كفر وتغير للشرع أو بدعة، خرج عن حكم الولاية وسقطت طاعته، ووجب على المسلمين القيام عليه وخلعه ونصب امام عادل ان امكنهم ذلك؛ فان لم يقع ذلك الا لطائفة وجبت عليهم القيام بخلع الكافر ولا يجب في المبتدع الا اذا ظنوا القدرة عليه؛ فان تحققوا العجز لم يجب القيام وليهاجر المسلم من أرضه الى غيرها ويفر بدينه، قال ولا ينعقد لفاسق ابتدأ فلو طرا على الخليفة فسق، قال بعضهم: يجب خلعه الا أن يترتب عليه فتنة وحرب، قال جماهير أهل السنة من الفقها والمحدثين والمتكلمين: لا ينعزل بالفسق والظلم وتعطيل الحقوق ولا يخلع ولا يجوز الخروج عليه بذلك؛ بل يجب وعظه وتخويفه للأحاديث الواردة في ذلك، قال القاضي وقد ادعى أبوبكر من مجاهد في هذا الاجماع، وقد رد عليه بعضهم هذا لقيام الحسين وابن الزبير وأهل المدينة على بني أمية وبقيام جماعة عظيمة من التابعين والصدر الأول على الحجاج مع ابن الأشعث وتأول هذا القائل قوله: أن لا ننازع الأمر أهله في أئمة العدل وحجة الجمهور أن قيامهم على الحجاج ليس بمجرد الفسق؛ بل لا غير من الشرع وظاهر من الكفر، قال القاضي وقيل: ان هذا الخلاف كان أولا، ثم حصل الاجماع على منع الخروج عليهم. والله أعلم! انتهى بلفظه".

پس از مطالعہ ایں عبارت تصدیق اکثر مقدمات مذکورہ حاصل می شود، بالجملہ بر اصول اہل سنت حال یزید بہ نسبت سابق متبدل شد، نزد بعض کافر شد و نزد بعض کفر او محقق نہ گشت، اسلام سابق مخلوط بہ فسق لاحق شد، اگر حضرت امام کافرش پنداشتند در خروج برو چہ خطا کردند امام احمد رحمۃ اللہ علیہ را ہمیں خاطر پسند خاطر افتاد؛ مگر چناں کہ ممکن است کہ کفر کسے نزد یکے محقق شود و نزد دیگراں نہ شود، ہم چنیں خروج برو در حق ایں و آں مختلف خواہد بود، اتفاق در تکفیر و تفسیق و تعدیل

و تجرع کے از ضروریات دینی یا از بدیہیاتِ عقلی نیست کہ حاجت معذرت افتد۔

ودر صورتِ فسق آں چہ پیش کردہ ام یا دخواہد بود تا ہم ہیچ صعوبتے بر اصول اہل سنت نیست چہ یزید اندریں صورت یا فاسق معلن بود تارک صلاۃ وغیرہ یا مبتداع بود چہ از روسائے نواصب است بہ ایں ہمہ خلافتش غیر مسلم، نظر بریں وجوہ بہ یاد ملفوظات سابقہ در خروج بروہیچ قباحتے نے بہ ایں ہمہ خروج بریں چنیں کساں تا حال نزد ہمہ جائز واگر نزد ہمہ جائز نیست، نزد بعض جائز چناں چہ از مشاہدہ عبارت نووی رحمۃ اللہ علیہ واضح است، ودر مسائل مختلفہ خلاف کسے مرد دیگراں راموجب تفسیق اوشاں آں را و بطلان اعمال او عند اللہ نمی تو ان شد چناں چہ دانستہ شد۔

وگر فرض کلیم بر عدم جواز خروج چنیں کساں اجماع است، اجماع حادث است، اجماع قدیم نیست، تا بر اصول اہل سنت در شہادت امام ہمام رضی اللہ عنہ تر دد راہ یابد، زیادہ از زیادہ اگر کسے گویدایں بہ گوید کہ: حضرت امام رضی اللہ عنہ خطا کردند؛ لیکن چہ حرج "اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيبُ" بنائے ثواب بر نیت خطائے اجتہادی دریں بارہ مزاحم حال نمی شود۔ چناں چہ در اصول اہل سنت مصرح است وہم واضح است چہ اگر بہ ظن غروب روزۂ افطار کردہ تا نماز مغرب بہ خواند ہنوز آفتاب غروب نہ شدہ بود، ایں کس را تا آخر عمر بر خطائے خود اطلاع نہ شد، ہرگز عاقلے تجویز نمی تو اں کرد کہ از ثواب محروم ماند؛ ورنہ تکلیف مالا یطاق لازم خواہد آمد۔ ومحال: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا".

آرے بر طبق اصول شیعہ شہادت حضرت امام الشہداءؓ در کنار دین وایمان شان ہم از دست می رو دنعوذ باللہ منہا!، اگر باور نہ باشد بنگر کہ در کافی کلینی روایات دریں باب" کہ ہر کرا تقیہ نیست ودین ایماں نہ دارد" وارد شدہ اند مع سند نقل می کنم۔

۱ – عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ هَاشِمِ بْنِ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَرَ الْأَعْجَمِيِّ قَالَ: قَالَ أَبُوْ عَبْدِاللهِ: يَا أَبَا عُمَرَ! إِنَّ تِسْعَةَ أَعْشَارِ الدِّيْنِ فِي التَّقِيَّةِ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ وَالتَّقِيَّةُ فِي كُلِّ شَيْءٍ وَفِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ.

۲ – عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيىٰ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَرَ بْنِ خَلَّادٍ، قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا الْحَسَنِ عَنِ الْقِيَامِ لِلْوُلَاةِ، فَقَالَ أَبُوْ جَعْفَرٍ التَّقِيَّةُ: دِيْنِي وَدِيْنُ آبَائِي وَلَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ".

ازیں دو روایت مثل آفتاب روشن می بر آید کہ ہر کہ تقیہ نہ کند بے دین وبے ایمان است،

اکنوں از حضرات شیعہ التماس است کہ اگر ہمیں تقیہ است، حسن خاتمہ حضرت امام الشہدا چہ علوم چہ جائے کہ شہادت وظاہر است کہ دریں روایت ہیچ گونہ گنجائش تاویل یا تخصیص نیست، اگر تاویل فرمایند، یا تخصیص بعدد ے وشخصے نمایند، مسموع نہ خواہد بود، اکنوں ازیں چارہ نیست کہ مذہب اہل سنت اختیار کنند واگر از اتباع حق عار وانکار است لاجرم از ائمہ دوازدہ گانہ یازدہ باقی خواہند ماند اندریں صورت نکار راحق واصرار بر مذہب باطل لاجرم خواہد آمد۔

چہ حضرت امامؓ را دریں ضیق ناچاری کہ مقابل سی ہزار فوج جرار چند معدود بودند وآں ہم یکے بعد دیگرے شربت شہادت چشیدند تقیہ لازم بود، اگر در اول امر امید بود در آخر وقت کہ ہیچ کس نماند تقیہ لازم افتادہ بود:

من آں چہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

وجواب دیگر ان شاء اللہ تعالیٰ! بہ شرط فرصت عن قریب بہ نظر سامی خواہد گزشت لَا تَقْنَطُوْا۔ ایں دو روایت کہ نقل کردہ شد اگر احتمال دروغ باشد مطابق نمایند، اگر نزد شما کافی کلینی موجود نہ باشد نسخہ مطبوعہ طہران نادما موجود است ملاحظہ نمایند۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ، وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ''(۱)۔

ترجمہ از فارسی: ''جس وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو اپنا ولی عہد کیا تھا، اس کا فسق ظاہر نہ تھا۔ اگر کچھ کیا ہوگا تو در پردہ، جس کی خبر امیر معاویہ کو نہ تھی۔ اس کے علاوہ جہاد میں ان سے حسنِ تدبیر کا مشاہدہ ہوتا؛ چناں چہ ام ملحان رضی اللہ عنہا کے گھر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو مرتبہ سونا اور جاگنا اور ہر مرتبہ ہنسنا مشہور بات ہے۔ آپ نے ہنسنے کی وجہ بیان فرمائی کہ: میں نے اپنی امت کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ دریا میں جہاد کر رہی ہے، جن کے متعلق کہا گیا ہے: "مُلُوْكٌ عَلَى الْاَسِرَّةِ اَوْ مِثْلُ الْمُلُوْكِ عَلَى الْاَسِرَّةِ"۔ اس دوسرے خواب کا مصداق یزید اور اس کے ساتھی ہی نکلے۔ جیسا کہ تاریخ جاننے والوں اور احادیث کے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

(۱) قاسم العلوم نمبر ۲،ص:۱۷۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح بیعۃ الرضوان میں منافقین شریک ہوئے اور نفاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے محروم ہوگئے، یزید بھی اپنی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے اس بشارت کی فضیلت سے محروم ہوگیا، اور ادھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مذہب خلافت کے بارے میں یہ تھا کہ جو شخص بادشاہت کرنے کا سلیقہ دوسروں سے زیادہ رکھتا ہو، اگرچہ اس سے بہتر لوگ موجود ہوں؛ مگر ترجیح اسی کو ہوگی۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یزید کو دوسروں سے بہتر جانا، یا اگر بہتر نہیں سمجھا، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ افضل کو ترک کر دیا، جیسا کہ مقدماتِ سابقہ سے واضح ہو چکا ہے کہ استخلاف افضل صرف افضل ہے، نہ کہ واجب، جس کو گناہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سب وشتم کے ساتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پیش آیا جائے۔ ہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اہم اجلۂ صحابہ میں شمار نہ کریں گے؛ بلکہ اولیٰ اور افضل کو چھوڑ دینے کی وجہ سے اس طرح کے امور میں ان کو معذور سمجھیں گے؛ البتہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد یزید نے ہاتھ پیر پھیلائے اور دل وجان سے برائی میں لگ گیا۔ برائی کا اعلان شروع کر دیا، نماز چھوڑ دی، پس بعض مقدماتِ گزشتہ کی بناپر عزل کر دینے کے لائق ہوگیا۔ حالات میں اس طرح کا الٹ پھیر جیسا کہ میں نے کہا ہے، ممکن ہے، محال نہیں ہے۔ شاید اس وقت اربابِ حل وعقد کی رائیں اور تدبیریں مختلف ہوگئیں، کسی پر فتنہ وفساد کا غلبہ ہوگیا، مجبوراً بیعت قبول کر لی اور گناہ سے بچنے کے لیے اتباع معروف کو بہ طور شرط مدنظر رکھا، اور جس کو ایک جماعت کثیرہ کے دعووں پر کامیابی اور دبدبے کی امید دکھائی دی، خدا کے بھروسے پر تیار ہوگیا اور لڑنے کا فیصلہ کر لیا؛ لہٰذا جو کچھ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور آپ کی طرح دوسرں نے کیا، ٹھیک کیا۔ اور اسی طرح سید الشہداءؓ نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک اور درست کیا۔ اس اختلاف کی بنیاد امیدوں کے اختلاف پر ہے، نہ کہ اصل فعل کے جائز وناجائز کی بنا پر اختلاف ہوا ہے؛ مگر اہل کوفہ کی غداری کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ کی تدبیر کارگر نہ ہوئی، اور عاشورا کے دن میدان کربلا کے اندر قیامت سے پہلے ایک قیامت قائم ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اس طرح کے کاموں میں ایسی باتیں فقط سید الشہداءؓ ہی کو پیش نہیں آئی ہیں؛ بلکہ جہادوں میں اکثر آیا کرتی ہیں۔ مثلاً: واقعۂ احد وحنین کو سنا ہی گیا ہے، پس جس طرح شہدائے احد اور حنین شہادت کے مرتبے پر پہنچے، اور ان ہر دو واقعات کے کچھ کمزوری ہو جانے کی وجہ سے ان کے فضائل میں خلل نہیں پڑتا، اسی طرح شہدائے کربلا کو بھی جاننا چاہیے۔

اور یہ اس وقت ہے کہ صرف استخلافِ امیر معاویہؓ یا لوگوں کا بیعت کر لینا، یا ان کا تسلط ہو جانا وغیرہ کی وجہ سے ان کی خلافت عام اور سب کو شامل شمار کریں، اور اگر اسی کو مان لیں کہ جو ہوا، تو صرف ان کی خلافت کے مطلقاً منعقد ہونے کے ہم قائل ہوں گے، اور ان کی خلافت کے عموم وشمول کے قائل نہ ہوں گے، اور ہم صاف کہہ دیں گے کہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما اور آپ کے اتباع وانصار امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی ذمے داری سے ہنوز خارج تھے۔ معزولی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ایسی حالت میں ان لوگوں کے خروج میں ان پر کوئی گرفت بھی نہیں ہے۔

اگر چہ نا سمجھ لوگ انعقادِ مطلق اور عمومِ انعقاد کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ پس گزشتہ واقعات کے تتبع سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اربابِ حل وعقد میں سے ہر ایک کا بیعت کر لینا صرف اس کے حق میں اور اس کے ماتحتوں کے حق میں اطاعت کا سبب شمار کرتے ہیں؛ ورنہ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر حضرت علیؓ کے بیعت کر لینے کے اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح یزید بھی اہل شام اور ارباب حل وعقد کے بیعت کر لینے کے بعد حضرت حسینؓ وعبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ اور دیگر بزرگوں کا خواست گار نہ ہوتا۔ جب اتنی بات معلوم ہو چکی، تو جاننا چاہیے کہ ہر کام کا دار ومدار نیت پر ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ہے: "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ"، اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حسن نیت اس کی مقتضی نہیں کہ اس میں تردد وتذبذب کو راہ دی جائے۔

موجودہ صورت میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں کیا شبہ ہے؟ یزید نہ تو خلیفہ تھا اور نہ یزید پر خروج کرنا ناجائز تھا، اور اگر خلیفہ تھا بھی، تو بھی اس پر خروج ممنوع نہ تھا، اور اگر مان ہی لیا جائے کہ خروج کرنا امام رضی اللہ عنہ کا جائز نہ تھا، تو عزل ممنوع نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ ممانعت کے اسباب مفقود اور اسباب جہاد موجود، تو پھر حسنِ نیت میں کیا کلام کیا جاسکتا ہے؟ پھر اگر یہ حضرات شہید نہ ہوں گے، تو دوسرا کون شہید ہوگا؟ اور ہم اس کو بھی چھوڑتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ: اگر اسباب جہاد نہ بھی تھے، تو آپ نے جہاد کے ارادے سے باز آکر چلے جانے کا راستہ مانگا؛ مگر یزید پلید کے لشکریوں نے جانے نہ دیا اور گھیر کر مظلوم شہید کر دیا۔ حدیث میں ہے:

'جو شخص اپنے مال اور آبرو کی حفاظت میں قتل کر دیا گیا، وہ بھی شہید ہے'۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ امام حسینؓ نے اجماع کی مخالفت کی؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً تو اجماع ہی تسلیم نہیں ہے، اگر ہوا بھی، تو اس بات پر کہ مخالفت نہیں ہوئی۔ بہ ایں ہمہ فاسق پر نہ خروج کرنے کے عدم جواز پر اجماع ہوا، اور اس کا مطلب جو کچھ ہے، پہلے عرض کیا گیا۔ عدم جواز پر اجماع کی وجہ سے نفس فسق پر خروج کرنا لازم نہیں آتا ہے؛ کیوں کہ اس کلی مشکک کے مراتب کے خصوصیات زائد بھی موجب خروج نہیں ہو سکتیں۔ پس اجماع غیر مسلم جس وقت کہ حضراتِ حسنینؓ وعبداللہ ابن زبیرؓ اور اہل مدینہ نے فیصلہ کر لیا تھا، اس کی مخالفت کو متفق علیہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض اجماع کو مان ہی لیا جائے، تو وہ اجماع حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد منعقد ہوا ہے؛ لہٰذا اس اجماع کی مخالفت حضرت امام حسینؓ کو کچھ مضر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام موصوفؓ اپنے زمانے میں ایک اختلافی مسئلے میں غلطی کر گئے، جس میں کوئی شرعی باز پرس نہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اب ہم امام نوویؒ کی عبارت درج کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ اس اجمال کی تفصیل اور گزشتہ باتوں کی تصدیق ہو جائے:

'اہل سنت کا اجماع ہو چکا ہے کہ: بہ وجہ فسق کے خلیفہ معزول نہیں ہوگا؛ لیکن ہمارے بعض اصحاب شوافع کی فقہی کتابوں میں ہے کہ معزول ہوگا، اور معتزلہ سے بھی اس کی حکایت کی گئی ہے، سو یہ غلط ہے، اور مخالف ہے اجماع کے۔ علما نے فرمایا ہے کہ: سلطان کے معزول نہ کرنے اور اس پر خروج نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے خون ریزی اور فتنہ فساد باہمی بڑھ جائے گا، اور معزولی کا مفسدہ اس کے باقی رہنے سے زیادہ ہو جائے گا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: علما کا اجماع اس بات پر ہو چکا ہے کہ کافر کی امامت منعقد نہیں ہوتی ہے، اور اگر امام پر کفر طاری ہو جائے، تو معزول کر دیا جائے گا، اور کہا ایسا ہی اگر نماز قائم کرنا اور اس کی طرف بلانا چھوڑے، تو بھی معزول ہوگا۔ فرمایا: اس طرح جمہور کے نزدیک بدعت کا پایا جانا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ: بعض بصریین قائل ہیں کہ بدعتی کی امامت منعقد ہوگی اور باقی رہے گی؛ کیوں کہ وہ تاویل کرتا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں: اگر کفر اس پر طاری ہوا، اور شریعت کے اندر تغیر یا بدعت شروع کر دیا، تو خلافت وولایت کے حکم سے نکل گیا، اور اس کی اطاعت جاتی رہی؛ لہٰذا مسلمانوں پر اس کے خلاف اٹھنا اس کو علاحدہ کرنا اور دوسرے عادل امام کو مقرر کرنا واجب ہو جاتا ہے، بہ شرطے کہ اس کی قدرت ہو۔ پس اگر ایسا کچھ ہی لوگ کر سکیں، تو کافر کو علاحدہ

کرنے کے لیے تو اٹھنا واجب ہو جاتا ہے، اور بدعتی پر واجب نہیں ہوتا ہے؛ مگر اس صورت میں کہ بدعتی کے علاحدہ کرنے پر لوگوں کو امکانی طاقت ہو، اور مجبوری متحقق ہو جائے، تو ایسے وقت میں اٹھنا نہیں چاہیے؛ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کر جائیں اور اپنے دین کی طرف بھاگیں۔ فرمایا: اور فاسق کی امامت شروع شروع میں منعقد نہ ہوگی، ہاں! اگر خلیفہ فاسق ہو گیا، تو بعض اس کے عزل کو واجب کہتے ہیں، بہ شرطے کہ فتنہ و فساد اور جنگ و جدال نہ ہو۔

جمہور اہلِ سنت میں سے فقہائے محدثین اور متکلمین نے کہا ہے کہ: خلیفہ کی معزولی بہ وجہِ فسق، ظلم اور لوگوں کے حقوق کو چھوڑ دینے کی بنا پر نہ ہوگی، اور نہ اس کو علاحدہ کیا جائے گا، اور نہ اس پر اٹھنا جائز ہوگا؛ بلکہ اس کو سمجھانا اور ڈرانا ضروری ہوگا۔ ان حدیثوں کی بنا پر جو اس بارے میں موجود ہیں، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ: اس مسئلے پر ابو بکر ابن مجاہد نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور لوگوں نے امام حسینؓ، ابن زبیرؓ اور اہلِ مدینہ کا بنی امیہ پر خروج کرنا اور تابعین کی ایک بڑی جماعت اور صدر اول کا حجاج پر ابن الاشعث کے ساتھ اٹھنے کو پیش کر کے ان کا رد کیا ہے، اور قائلین نے ان کے قول: ”لَا نُنَازِعُ الْأَمْرَ أَهْلَهُ“ کی تاویل یہ کی ہے کہ: اس سے مراد امام عادل، نہ کہ اور حجاج پر خروج کی۔

دلیل جمہور کی یہ ہے کہ محض اس کے فاسق ہونے کی بنا پر نہیں ہے؛ بلکہ اس نے شریعت میں تغیر اور اظہارِ کفر کیا۔ قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: کہا گیا ہے کہ یہ اختلاف پہلے تھا، بعد کو ایسے لوگوں پر اٹھنا منع ہو گیا۔ واللہ اعلم!

علامہ نوویؒ کی اس عبارت کے مطالعے کے بعد مقدماتِ گزشتہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پس اہلِ سنت کے اصول پر یزید کی سابق حالت بدل گئی۔ بعض کے نزدیک کافر ہو گیا اور بعض لوگوں کے نزدیک اس کا کفر ثابت نہیں ہوا؛ بلکہ سابق اسلام فسق کے ساتھ مخلوط ہوگا۔ اگر امام موصوفؓ نے یزید کو کافر سمجھا، تو اس پر خروج کرنے میں کیا غلطی فرمائی؟ امام احمدؒ کو یہ بات پسند آئی، جیسا کہ یہ بات ممکن ہے کہ کسی کا کافر ہونا ایک شخص کے نزدیک ثابت ہو، اور دوسروں کے نزدیک ثابت نہ ہو، ایسا ہی اس پر خروج کرنے میں اختلاف ہو جائے گا اور تکفیر تفسیق، تعدیل اور جرح وغیرہ پر کسی کا اتفاق کرنا ضروریاتِ دینی یا بدیہیاتِ عقلی میں سے نہیں ہے، کہ عذر و معذرت کی ضرورت پیش آئے۔

اور فسق کی صورت میں جو کچھ کہ میں نے پیش کیا ہے، وہ تو یاد ہی ہوگا، پھر بھی اہل سنت کے اصول پر کوئی دشواری نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں یزید یا تو کھلم کھلا فاسق تھا، یعنی تارک نماز وغیرہ یا پھر بدعتی تھا، یعنی بہت بڑا ناصبی تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کی خلافت عام طور پر غیر مسلم تھی۔ ان وجوہ مذکورہ کی بنا پر اس کے خلاف خروج کرنے میں کوئی قباحت نہیں رہ جاتی ہے۔ پس ایسے لوگوں کے خلاف اٹھنا اس وقت تمام لوگوں کے لیے جائز ہے، اور اگر تمام کے نزدیک جائز نہیں ہے، تو بعض کے نزدیک جائز، جیسا کہ علامہ نوویؒ کی عبارت سے سمجھا جاتا ہے، اور مسائل مختلف فیہ میں ایک کا خلاف دوسروں کے حق میں فسق و فجور کا سبب یا ان کی اعمال کا خدا کے نزدیک رائے گاں ہو جانا نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ایسے لوگوں پر خروج کرنے کی عدم جواز پر اجماع ہو چکا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ اجماع حادث ہے، قدیم نہیں ہے کہ اہل سنت کے اصول پر حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں شبہ و تردد کو دخل ہو۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے، تو یہ کہ امام موصوفؓ نے غلطی کی؛ لیکن کوئی مضائقہ نہیں، جب کہ مشہور ہے کہ مجتہد کبھی چوک جاتا ہے اور کبھی نہیں؛ لہٰذا اجتہادی غلطی کی وجہ سے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جیسا کہ اہل سنت کے اصول میں طے ہو چکا ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی آفتاب کے غروب کو سمجھ کر روزہ افطار کر لے، تا کہ نماز مغرب ادا کرے اور ابھی آفتاب ڈوبا نہیں تھا، اور اس آدمی کو زندگی بھر اپنی غلطی کا علم نہیں ہوا، کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ غریب ثواب سے محروم ہو گیا؛ ورنہ پھر تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی، جو محال ہے: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا".

البتہ امامیہ کے اصول پر حضرت امام حسین کی شہادت دین و ایمان سے بھی خارج ہو جاتی ہے۔ معاذ اللہ منہا! اگر کسی کو یقین نہ ہو، تو اس کو چاہیے کہ 'کافی کلینی' کے اندر اس باب میں جو روایات ہیں، ان کو دیکھے، لکھا ہے کہ جس نے تقیہ نہیں کیا، اس میں نہ تو دین ہے اور نہ ایمان، جس کو مع سند کے ہم نقل کرتے ہیں:

۱- ابن عمر روایت کرتے ہیں ہاشم ابن سالم سے، اور وہ روایت کرتے ہیں ابن ابو عمر اعجمی سے کہ کہا: فرمایا ابو عبد اللہ نے: اے ابو عمر! دین کے دس میں سے نو حصے تقیہ میں ہے۔ اس کا دین نہیں جو تقیہ نہیں کرتا، اور تقیہ تو ہر چیز میں ہے اور مسح الخفین میں بھی۔

۲- محمد ابن یحییٰ روایت کرتے ہیں احمد ابن محمد ابن عمر ابن خلاد سے کہ میں نے حضرت علی

رضی اللہ عنہ سے بادشاہ وحاکم کے خلاف اٹھنے کے متعلق سوال کیا، ابوجعفر نے جواباً فرمایا کہ: تقیہ میرا اور میرے آباواجداد کا دین ہے، اس کا ایمان نہیں جو تقیہ نہیں کرتا۔

ان دونوں روایتوں سے آفتاب کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو شخص تقیہ نہیں کرتا، وہ نہ صرف بے دین؛ بلکہ بے ایمان بھی ہے۔ ایسی صورت میں حضرات شیعہ سے گزارش ہے کہ اگر یہی تقیہ ہے، تو پھر حضرت امام الشہداءؓ کے حسنِ خاتمہ ہی یقینی نہیں، پھر شہادت تو دوسری بات ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان روایات میں نہ تو تاویل کی اور نہ تخصیص کی کوئی گنجائش ہے۔ اگر تاویل تخصیص کریں بھی، تو کون قبول کرے گا؟ سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ اہل سنت کا مذہب اختیار کریں، اور اگر حق مذہب وطریقے کے اتباع میں شرم محسوس ہوتی ہے، اور انکار ہی کرتے ہیں، تو ناچار پھر دوازدہ امام یا زادہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس صورت میں حق کا انکار اور باطل مذہب پر ضد کرنا لازم آتا ہے؛ کیوں کہ حضرت امامؓ اس مجبوری ولاچاری میں کہ تیس ہزار فوج کے مقابلے میں صرف چند گنتی کے لوگوں کا ہونا اور پھر یکے بعد دیگرے شربت شہادت کو نوش فرمانا، اس حالت میں تقیہ کرنا ضروری تھا۔ مانا کہ ابتداً امید تھی؛ لیکن جب کہ آخر میں کوئی نہیں رہ گیا تھا، تقیہ کرنا ضروری ہو گیا تھا"۔

میں نے یہ عبارت بہ تمامہا آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ یہ رسالہ اسی شبہ کے متعلق لکھا گیا ہے، جس کو آپ نے پیش فرمایا ہے۔ صفحہ ۱۳ ر تک تمہیدات ہیں، جن میں بہت سی مفید باتیں آ گئی ہیں: مگر تطویل کے خوف سے اصل مقصد عرض کر دیا گیا۔

مورخین کا یہ قول کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے فسق وفجور کا علم تھا اور وہ معلن بالفسق تھا، اور باوجود اس کے انہوں نے استخلاف کی کوششیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے ہی شروع کر دی تھیں، یقیناً شانِ صحابیت ہی نہیں: بلکہ شانِ عدالت کے بھی خلاف ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ [1].

"اور تم ہو بہتر امتوں سے جو بھیجی گئی ہے عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور ایمان لاتے ہو اللہ پر"۔

---

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۱۰۔

وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ"(۱)۔

"اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر"۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ، تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا، سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ"(۲)۔

"محمد رسول اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں، زور آور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں، تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدے میں، ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی، پہچان ان کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے"۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ، وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ، فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً، وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ(۳)۔

"اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا، اگر وہ تمہاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں، تو تم پر مشکل پڑے، پر اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دلوں میں ایمان کی اور اچھا دکھایا اس کو تمہارے دلوں میں، اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی۔ وہ لوگ ہی ہیں نیک راہ پر اللہ کے فضل سے اور احسان سے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکمت والا ہے"۔

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ، نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ، یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ(۴)۔

"جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں اس کے ساتھ، ان کی روشنی دوڑتی ہے ان کے آگے اور ان کے داہنے، کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے! پوری کر دے ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو، بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ان آیات کو اور ان کے مثل دیگر آیات کو جو کہ قطعی طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اعلیٰ درجے کی صفات کمالیہ پر شہادت دیتی ہیں، اور جن کے مصداق اول یہی حضرات ہیں، ان ہی کے ساتھ ساتھ ان اخبار احادیث صحیحہ کو بھی لیجیے، جو کہ عامہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کی شان میں وارد ہیں، مثلاً:

---

(۱) سورۂ بقرہ: ۱۴۳۔　　(۲) سورۂ فتح: ۲۹۔

(۳) سورۂ حجرات: ۷،۸۔　　(۴) سورۂ تحریم: ۸۔

"أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ".

"میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جن کی تم اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے"۔

"خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ".

"سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر جو اس سے متصل، پھر جو اس سے متصل ہے"۔

فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا، مَا بَلَغَ مُدَّ صَحَابِيْ وَلَا نَصِيْفَهُ. (او کما قال علیه الصلاة والسلام)

"اگر کوئی تم میں پہاڑ احد کے برابر سونا خرچ کرے، تو میرے صحابی کے مد کے ثواب اور نہ اس کے آدھے ثواب کے برابر پہنچے"۔

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِيْ مَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ.

"ڈرو اللہ سے، ڈرو اللہ سے میرے اصحاب کے بارے میں، پس جو دوست رکھتا ہے ان کو، میری دوستی کی وجہ سے دوست رکھتا ہے ان کو، اور جو شخص کہ دشمنی رکھتا ہے پس بہ سبب دشمنی میرے کے دشمن رکھتا ہے"۔

ان روایات کے ہم معنی بہت احادیث صحیحہ ہیں، جو کہ عام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے اعلیٰ مناقب پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر اس کے ساتھ اجماعِ امت کو لیجیے، جو کہ بتلاتا ہے کہ جس شخص نے ایمان کے ساتھ ایک لحظہ کے لیے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر لی، اور ایمان پر اس کی وفات ہوئی، وہ بعد کے تمام اولیا و اتقیا و ائمہ وغیرہ سے افضل ہے۔

ان امور مذکورۂ بالا کو دیکھتے ہوئے اگر مورخین کی یہ بات کہ فاسق یزید اور معلن بالفسق کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نامزد بالخلافہ کیا مانی جائے؟ تو ان تمام نصوص کی تذلیل توہین ہی نہیں؛ بلکہ انکار لازم آئے گا۔ ایسی صورت میں تو معاذ اللہ! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ انتہائی فسق اور معصیت میں مبتلا ہوئے، اور اسی بنا پر ان کی وفات ہوئی: بلکہ درجۂ کفر تک (والعیاذ باللہ) نوبت آتی ہے؛ (کیوں کہ استخلاف بالمعصیہ صاف ٹپکتا ہے)۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً، فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ، لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ"(۱).

(۱) بخاری شریف۔

"کوئی بندہ ایسا نہیں ہوگا کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے کسی رعیت کا راعی اور حاکم بنایا، اور اس نے ان کی نگہبانی اور حفاظت ان کی خیر خواہی کے ساتھ نہ کی، تو اس کو جنت کی خوش بو بھی نہ ملے گی"۔

"مَا مِنْ وَالٍ یَلِی رَعِیَّۃَ الْمُسْلِمِیْنَ، فَیَمُوْتُ وَھُوَ غَاشٍ لَھُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ"(۱)۔

"کوئی شخص مسلمان رعایا کا والی یا حکم بنایا گیا، اور اس حالت میں مرا کہ وہ ان کے حقوق میں خیانت کرنے والا ظالم تھا، تو جنت اس پر حرام ہوگی"۔

"اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، فَالْاِمَامُ رَاعٍ، وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ"(۲)۔

"خبر دار ہو جاؤ! تم سب کے سب راعی اور والی ہو، اور تم سب کے سب مسئول ہو، اپنی رعیت سے۔ امام جو کہ لوگوں پر مقرر کیا گیا ہے، راعی ہے، اور اپنی رعیت سے مسئول ہے"۔

"مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا". (الحدیث)

"جس نے ہم کو دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں"۔

یہ مورخین کی روایتیں تو عموماً بے سر وپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے، نہ ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے، نہ اتصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے۔ اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے، تو عموماً ان میں ہر غث وثمین سے اور ارسال اور انقطاع کے ساتھ لیا گیا ہے۔ (خواہ ابن اثیر ہوں، یا ابن قتیبہ ابن ابی الحدید ہوں، یا ابن سعد)۔

ان اخبار کو مستفاض ومتواتر قرار دینا بالکل غلط ہے، اور بے موقع ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص اور دلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایاتِ صحیحہ احادیث کی بھی موجود ہوتیں، تو مردود یا مؤول قرار دی جاتیں، چہ جائے کہ روایاتِ اصول۔ اب آپ اصول تنقید کو پیش نظر رکھ کر کوئی رائے قائم کیجیے۔

---

(۱) بخاری شریف۔

(۲) ایضاً: اس حدیث میں جو حاکم کو راعی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر حاکم پر اپنے محکوم اور رعایا کی خبر گیری اور خیر خواہی اس طرح لازم کی گئی ہے، جس طرح جانور چرانے والوں پر جانوروں کے مالک کی طرف سے لازم کی جاتی ہے۔ اگر چرواہا جانوروں کی خیر خواہی اور خدمات مفیدہ کے انجام دینے میں کوتاہی کرتا ہے، تو مالک کے سامنے جواب دہ قرار دیا جاتا ہے: اس لیے لفظ راعی سے بلیغ کوئی اور لفظ مکمل نہ تھا، جس سے تعبیر فرمایا گیا۔ (مولانا نجم الدین اصلاحی)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مورخین میں سے ان لوگوں کا قول کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حیات میں یزید معلن بالفسق تھا اور ان کو اس کی خبر تھی، اور پھر انہوں نے اس کو نامزد کیا، بالکل غلط ہے۔ ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت میں خفیہ طور پر فسق وفجور میں مبتلا ہو؛ مگر ان کو اس کے فسق وفجور کی اطلاع نہ ہو۔ ان کی وفات کے بعد وہ کھیل کھیلا اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا کر بیٹھا۔

اب اس کی نامزدگی کی خبر ممکن ہے کہ صحیح ہو، انہوں نے رومیوں اور عیسائی ممالک پر جہاد میں اس کی متعدد دفعہ جدوجہد اور کامیابیاں اور حسن تدبیر وانتظام کو مشاہدہ کر کے اپنی رائے کی بنا پر خلافت کے لیے قریشیت اور حریت عقل وبلوغ کے ساتھ لازم ترین شرط لیاقت، انتظام مملکت اور حسن تدبیر ہے، اور یہ اس میں پائی جاتی ہے، یا بدرجۂ کمال موجود ہے، جو کہ اوروں میں نہیں ہے، اور اگر ہے، تو اس درجے پر نہیں ہے کہ اس کی نامزدگی کردی ہو، (جیسا کہ بعض مورخین کا قول ہے)، یا یہ جدوجہد دوسرے ارا کین خاندان بنی امیہ کی طرف سے کی گئی ہو، اور یزید بھی اس میں کوشاں رہا ہو؛ مگر عام لوگوں نے اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کردیا ہو؛ کیوں کہ انہوں نے روکا نہیں، (جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے)، یا یہ کہ نامزدگی ان کی طرف سے حقیقتاً یا حکماً کسی طرح نہیں ہوئی، ان کی وفات کے بعد اہل شام میں سے اہل حل وعقد نے اس کو جانشین اور خلیفہ بنادیا اور بیعت کرلی، جیسا کہ بعض دوسرے مورخوں کا قول ہے، یا یہ کہ وہ خود بالتغلب خلیفہ بن بیٹھا (بعض مورخ اس کے بھی قائل ہیں)۔

بہر حال! ان وجوہ کی بنا پر اس کی خلافت منعقد ہوگئی۔ آپ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ نامزدگی، یا اہل حل وعقد کا بیعت کرنا: یہ تینوں امور انعقاد خلافت کے طرق میں سے ہے۔ اگرچہ تیسرا امر بالضرورۃ والمجبوریہ ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ خلیفۂ عادل جس میں کل شروط امامت پائے جائیں، کسی دوسرے جامع شروط خلافت کو اپنا جانشین کرجائے اور وصیت کرجائے کہ فلاں شخص میرے بعد خلیفہ ہو، اس میں شروط سے اگر شروط خلافت مطلقہ مراد ہیں، جو کہ عقل، بلوغ، اسلام، قریشیہ سے عبارت ہے، تو یہ تو موجود ہی ہیں، اور یہی امور کتب کلام وفقہ میں مذکور ہیں۔ اور اگر شروط سے مراد شروط خلافت کاملہ ہیں، جن میں صلاح وتقویٰ، علم وغیرہ بھی معتبر ہیں، تو اس کی سند کیا ہے؟ کتب مذہب میں اس کو انعقاد خلافت کے لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے، اور اگر ایسا ضروری ہوگا تو چاہیے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت بھی صحیح نہ ہو؟ حال آں کہ بالاجماع ان کو نہ صرف خلیفہ؛ بلکہ خلیفۂ راشد بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کو نامزد کرنے والا سلیمان ابن عبدالملک کا حال معلوم ہے۔

بہر حال! وجوہِ مذکورہ بالا سے انعقاد مطلق ہو گیا؛ مگر عموم انعقاد میں جس سے ہر ایک پر اتباع لازم آجائے اور مخالفت کرنا ممنوع ہو جائے، وہ نہیں ہوا تھا۔ انعقاد مطلق اور عموم انعقاد میں فرق ہے۔ عموم انعقاد جب محقق ہوگا، جب کہ تمام ارباب حل وعقد متفق ہو جائیں، بعض کی بیعت کافی نہ ہوگی، اور یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت بہت سے حضرات نے اگرچہ کرلی تھی، تاہم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی بیعت کی کوشش کی گئی، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انہوں نے اس کو انجام دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ یزید کوشاں تھا کہ حضرت امام حسین، حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات بیعت کرلیں، حال آں کہ یہ حضرات ملتجی بالحرم ہو گئے تھے۔ کسی نے جنگ کا ارادہ نہیں کیا تھا اور نہ بیعت کی تھی۔ ان حضرات کا اس زمانے میں اہل حل وعقد میں سے ہونا بدیہی امر ہے۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ وجوہ عموم انعقاد ہی ہیں، اور انعقاد مطلق اور عموم انعقاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تو پھر یزید کا بعد از ظہور فسق وفجور وہ حال ہی نہیں رہتا، جو ابتدا میں تھا، یعنی اس کے اعمال شنیعہ درجۂ کفر کو اگر پہنچ گئے تھے، جیسے کہ امام احمدؒ اور ایک جماعت کی رائے ہے، تب تو وہ یقیناً معزول عن الخلافت ہو ہی گیا تھا۔ اب امام حسین رضی اللہ عنہ کا ارادۂ جنگ خروج ہی نہیں شمار ہو سکتا، اور اگر اس کی حرکات ناشایستہ درجۂ کفر کو پہنچی تھیں، (جیسا کہ جمہور کا قول ہے) اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، ممکن ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہو، جو کہ حضرت امام احمدؒ اور ان کے موافقین کی ہے۔

علاوہ ازیں فاسق ہونے کے بعد خلیفہ معزول ہو جاتا ہے، یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس وقت تک مجمع علیہ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین کی رائے یہ تھی کہ وہ معزول ہو گیا اور اس بنا پر اصلاحِ امت کی غرض سے انہوں نے جہاد کا ارادہ فرمایا۔

پھر باوجود اس کے خلع کا مسئلہ تو آج بھی متفق علیہ ہے، یعنی اگر خلیفہ نے ارتکابِ فسق کیا، تو اصحاب قدرت پر اس کا عزل کر دینا اور کسی عادل متقی کو خلیفہ کرنا لازم ہو جاتا ہے، بہ شرطے کہ اس کے عزل اور خلع سے مفاسد مصالح سے زائد نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے اتباع کی رائے میں مفاسد زیادہ نظر آئے، وہ اپنی بیعت پر قائم رہے، اور اہل مدینہ نے عموماً بعد از بیعت اور واپسی وفد از شام ایسا محسوس نہیں کیا اور سبھوں نے خلع کیا، جس کی بنا پر وہ قیامت خیز "واقعۂ حرہ" نمودار ہوا، جس سے مدینۂ منورہ اور مسجد نبوی اور حرم محترم کی انتہائی بے حرمتی اور تذلیل ہوئی۔ کیا مقتولینِ حرہ کو شہید نہیں کہا جائے گا؟

پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کے مواعید پر مطمئن ہوئے، بالخصوص حضرت مسلم و عقیل رحمۃ

اللہ علیہما کے خطوط کے بعد، جن میں پورا اطمینان اہل کوفہ کی طرف سے دلایا گیا تھا؛ اس لیے ان کا ارادۂ جہاد یقیناً صحیح تھا اور وہ خلع کرنے اور خروج کرنے میں کسی طرح باغی نہیں قرار دیے جاسکتے۔ ان کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان حالات میں مفاسد کا قلع قمع ہوجائے گا اور خلل بہت کم ہوگا۔ اپنی ظفر مندی کے لیے متیقن تھے۔

پھر آپ اس کو بھی پس انداز نہ فرمائیں کہ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ: میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوگیا کہ اہل کوفہ نے غدر کیا اور مسلم وعقیل رحمۃ اللہ علیہما شہید کردیے گئے، اور یزید کی فوج یہاں آپہنچی ہے، تو کہلا بھیجا کہ: میں کوفہ نہیں جاتا اور نہ تم سے لڑنا چاہتا ہوں، مجھ کو مکۂ معظمہ واپس جانے دو۔ دشمن اس پر راضی نہ ہوا، اور اصرار کیا کہ اس کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کریں۔

آپ نے فرمایا کہ: اگر مکۂ معظمہ واپس نہیں جانے دیتے، تو مجھ کو چھوڑ دو، کہیں دوسری طرف چلا جاؤں گا۔ وہ اس پر راضی نہ ہوا۔

تو آپ نے فرمایا کہ: اچھا مجھ کو یزید کے پاس لے چلو، میں خود اس سے گفتگو کرلوں گا۔ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا، اور جنگ یا بیعت پر مصر رہا۔

یہ تاریخی واقعہ بتلاتا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ ہر طرح مجبور ومظلوم قتل کیے گئے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی شہادت میں کلام کیا جائے، تو تعجب خیز نہیں تو کیا ہے؟ چناں چہ یہ بھی تصریح آپ کتب تاریخ میں پائیں گے کہ یزید کو جب کہ اس کو اطلاع ہوئی کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ ان تینوں امور کو پیش فرمارہے تھے؛ مگر اس کے عامل نے کسی کو قبول نہیں کیا، تو بہت برہم ہوا، اور سرزنش کی۔ واللہ اعلم!

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں غور فرمائیں، مجھ کو توی امید ہے کہ آپ کے جملہ شبہات کا ازالہ ہوجائے گا، اور مزید تفصیل کے لیے اگر خواہش ہو، تو "قاسم العلوم" کا یہ نمبر منگا کر دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کے متعلق بھی جناب نے غور نہیں فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ غلط فہمی اور خطائے اجتہادی سے انبیاء علیہم السلام بھی باوجود معصیت از ذنوب معصوم نہیں ہیں، اور ان سے بھی اس غلط فہمی سے بڑے سے بڑا امر سرزد ہوسکتا ہے، اور اس پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ حال آں کہ حسب قاعدہ: "حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"، ان سے چھوٹے چھوٹے اعمال پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام پر مواخذہ بیٹے کے متعلق دعا کرنے پر، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر خوف ثلثہ کذبات کے متعلق طاری ہونا وغیرہ اسی قسم سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قتل قبطی پر تو خائف ہیں؛ مگر حضرت ہارون علیہ السلام رمی الواح کے متعلق خوف کا تذکرہ تک بھی نہیں فرما رہے، کہ ان حضرات کی خطائے اجتہادی کا یہ حال ہے کہ سرزد بھی ہوتی ہے اور مواخذہ بھی نہیں ہوتا، تو غیر معصوم سے سرزد ہونا کیوں ممنوع ہوگا؟ اور اس پر گرفت کیوں ہوگی؟ بلکہ حسب ارشاد:

"اَلْمُجْتَهِدُ إِذَا أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ، وَإِذَا أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ".

ممکن ہے کہ اس کو اجر ملے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ غیر معصوم ہیں، اگر ان سے دربارۂ استحقاقِ خلافت اور شروط خلافت غلطی اجتہادی ہو جائے، اور وہ یزید کو مستحق خلافت سمجھ کر نامزد فرما دیں، یا یہ کہ خلافت میں قرشیت اسلام، حریت، بلوغ اور حسن تدبیر انتظام ہی کو شرط سمجھیں، تقویٰ اور دیانت ضروری قرار نہ دیں، تو کیا اس پر گرفت سے بچ نہیں سکتے؟(۱)۔

رہا حسن نیت کا سوال، تو جب کہ ہم کو عام مؤمنین کے ساتھ حسن ظن کا حکم ہے، تو ایک صحابی جس کے لیے دعواتِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ بھی موجود ہیں؛ کیوں نہ عمل میں لایا جائے؟ اگر آپ "مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا" پر عمل کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں، تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ "لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا" کا خطاب بھی تو موجود ہے۔ بہر حال! فکر و غور سے امور معروضہ میں کام لیجیے، جلدی مت فرمائیے(۲)۔

---

(۱) امام العصر کا یہ الانامہ اپنی جگہ پر اہم تحقیق اور ایک زبردست تاریخی انکشاف ہے، اور اتنا صاف اور واضح ہے کہ تلخیص کی چنداں ضرورت نہیں ہے؛ البتہ مذہب امامیہ کے بعض اصولی مذاہب کا نام آ گیا ہے؛ اس لیے اس کو صاف کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے:

۱-تقیہ ہے، جس پر آیت سورۂ آل عمران "إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً" سے استدلال کیا جاتا ہے، حال آں کہ بقول صاحب "بیان القرآن" آیت ہذا میں خوف ضرر کے وقت دوستی کے اظہار اور عداوت کے اخفا کا ذکر ہے، اور تقیہ متعارفہ میں کفر کا اظہار اور ایمان کا خفا ہوتا ہے۔ یعنی جس چیز کا حکم دیا اس سے کسی حادث کی وجہ سے کہ اپنے علم سابق کی بنا پر پلٹ جانا بداء ہے۔ علامہ ابوجعفر نحاس نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں نسخ اور بداء کے فرق پر بحث فرمائی ہے، طول کے خیال سے ہم بداء کی تعریف پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وَأَمَّا الْبَدَاءُ فَهُوَ تَرْكُ مَا عَزَمَ عَلَيْهِ".

مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا ارادہ کیا اس کو چھوڑ دینا گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی وہم اور غلطی میں پڑ گیا یا پڑ جاتا ہے۔

۳-امامیہ کا تیسرا بنیادی مسئلہ ایمان بالرجعت کا ہے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چناں چہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے، تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔ (شرح مسلم) (اصلاحی)

(۲) (مضمون ماخوذ از): مکتوبات شیخ الاسلام، ج:۱، مکتوب نمبر:۸۹۔

تذکرۂ حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ

ایک نایاب گوشہ

یادگار اسلاف حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ✪

> حضرت چشتی صاحب مدظلہم کا پچاس سال پہلے کا قلمی تبرک ہے، اس میں بہت ہی قیمتی معلومات ہیں، جو حضرت چشتی صاحب مدظلہم کے ذوق کمال مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مدظلہم کو عافیت کے ساتھ تادیر قائم رکھے۔ آمین! (نعمان)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات میں فطرت کی طرف سے جو اوصاف وکمالات ودیعت کیے گئے تھے، انہوں نے خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اپنے مذاق کے مطابق اپنے حوصلے اور ظرف کے بہ قدر فائدہ اٹھاتا تھا، اور ان کی ذاتِ قدسی صفات کا والہ وشیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی مستفیدین میں ایک بزرگ محمد حسین ابن محمد مسعود مراد آبادیؒ تھے۔ یہ سید امانت علی حسینی چشتیؒ (المتوفی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء) کے مخلص مرید تھے۔

انہیں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اور ان کے حالات کی بڑی جستجو تھی۔ جب بھی حضرت نانوتویؒ کا مراد آباد یا بریلی میں ورود مسعود ہوتا، یہ خدمت میں برابر حاضر رہتے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

انہوں نے ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں بزرگانِ دین کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا تھا، جو کم وبیش چار سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اس کا نام "انوار العارفین" ہے۔ یہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اب نہیں ملتا ہے۔ یہ تذکرہ مختصر، جامع اور مفید ہے۔ اس میں موصوف نے چار مشہور خانوادوں کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا ہے، اور ان بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے، جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کتاب میں چشتیہ صابریہ سلسلے کے بزرگوں کے تذکرے میں حضرت نانوتویؒ

✪ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی)

سے بعض بڑی اہم اور نہایت مفید معلومات نقل کی ہیں۔ چناں چہ شاہ عبدالرحیم چشتی افغانی سہارن پوری (شہید ۱۲۴۶ھ/ ۳۱-۱۸۳۰ء) کے تذکرے میں رقم طراز ہیں:

"بیعتِ جہاد با جناب سید احمد صاحب کردند حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب در مجلسے با راقم نقل می فرمودند کہ چوں ہر دو ذات بابرکات بعد فراغ مراقبہ باہم می نشستند اثر ہمت قویہ ایشاں بر جناب سید احمد صاحب خندہ ہائے قہقہہ کہ خاص اثر نسبت چشتیہ است ظاہر می شد و اثر توجہ جناب سید بر ایشاں غلبۂ سکر روی دارد۔ رحمۃ اللہ علیہم (۱) و ہم مولوی صاحب موصوف با راقم و با دو سہ از اہل علم نقل می فرمودند کہ عبداللہ خاں رئیس پنج لاسہ مرید عقیدت کیش شاہ رحم علی قدس سرہ برائے دردِ زہ قند سیاہ دم می کردند و قبل از تولد مولود کہ پسر خواہد آمد یا دختر خبری دادند چوں کیفیت آں خبر از وے می پرسیدند، می گفتند کہ مرشد من مرا صورت دختر و پسر معائنہ می کنانند راقم وے را دیدہ بود مرد بزرگ و خوش اوقات بودند از ایں جا تصرف ارواح بزرگاں در عالم مثال ثابت می شد کہ صورت مثالیہ را معاینہ می کنانند"(۲)۔

ترجمہ از فارسی: "شاہ عبدالرحیمؒ نے حضرت سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت جہاد کی۔ حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب نے راقم سے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ: مراقبے سے فارغ ہونے کے بعد جب دونوں حضرات بیٹھے، تو ان کی نسبت قویہ کے اثر سے حضرت سید احمد صاحبؒ پر قہقہے کی صورت میں نسبت چشتیہ ظاہر ہوئی، اور حضرت سید صاحبؒ کی توجہ کے اثر سے ان پر غلبۂ سکر نمایاں ہوا تھا۔ رحمۃ اللہ علیہم! نیز مولوی صاحب موصوف نے راقم اور دو تین اہل علم سے بیان فرمایا تھا کہ: عبداللہ خاں رئیس پنج لاسہ جو شاہ رحم علی قدس سرہ کے عقیدت کیش مرید تھے، دردِ زہ کے سلسلے میں گڑ دم کرکے دیا کرتے تھے، اور ولادت سے پہلے ہی بتلا دیا کرتے تھے کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ ان سے جب اس پیشگی اطلاع دینے کی کیفیت دریافت کی جاتی، تو فرماتے کہ: میرے مرشد لڑکے یا لڑکی کی صورت میرے سامنے کر دیتے ہیں۔ راقم نے بھی موصوف کی زیارت کی ہے۔ وہ ایک خوش اوقات مرد بزرگ تھے۔ اس سے ارواح بزرگاں کا تصرف بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات عالمِ مثال میں مثالی صورتیں دکھا سکتے ہیں"۔

---

(۱) مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنویؒ نے شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ کا تذکرہ 'نزہۃ الخواطر'، ج:۶، ص:۲۶ ، میں "انوار العارفین" کے حوالے سے نقل کیا ہے؛ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (چشتی)

(۲) انوار العارفین: ۵۲۰۔

اور اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ناقل ہیں:

"حاجی مولوی محمد قاسم صاحب بار اقم نقل فرمودند کہ شخصے گفت کہ: جبۂ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ در لہاری وجلال آباد است حاجی امداد اللہ صاحب را پوشیدہ بہ خواب دیدم، تعبیر آں پر ظاہر است کہ ایشاں بہ لباس شریعت وآداب طریقت آراستہ وپیراستہ اند وطالباں را بہ اتباع سنت وعلوم شریعت وآداب طریقت تعلیم وتلقین می فرمایند وخدمت خود از عالم سید روا نداریند واز کسر نفسی خود تعلیم ظاہری از مریداں نہ پسندند وبہ تعلیم باطن امر فرمایند"۔

ترجمہ از فارسی: "حاجی مولوی محمد قاسم صاحب ایک شخص کا بیان راقم سے نقل فرماتے ہیں کہ: انہوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو خواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جبہ پہنے ہوئے دیکھا، جو لہاری اور جلال آباد میں موجود ہے، جس کی تعبیر ظاہر ہے کہ موصوف لباس شریعت اور آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ ہیں اور سالکین کو سنت اور علوم شریعت اور آداب طریقت کے اتباع کی تعلیم وتلقین فرماتے ہیں، اور کسی عالم یا سید سے اپنی خدمت لینا پسند نہیں فرماتے، اور اپنی کسر نفسی کی وجہ سے مریدوں کو باقاعدہ ظاہری تعلیم دینا بھی پسند نہیں فرماتے؛ بلکہ انہیں باطنی تعلیم کا حکم فرمادیتے ہیں"۔

محمد حسین مراد آبادیؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلے کے بزرگوں (۱) میں حضرت نانوتویؒ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ نہایت مختصر ہے؛ لیکن اس میں تذکرہ نگار نے حجۃ الاسلامؒ کی سیرت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا، اور موصوف کی عادات واطوار، گفتار وکردار، علم وفضل، کمالات ظاہری وباطنی سب ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مختصر تذکرے سے حضرت ممدوح کی زندگی کے بعض ایسے مخفی گوشے بھی سامنے آتے ہیں، جن کے ذکر سے حضرت نانوتویؒ کی ضخیم سوانح عمریاں بھی یکسر خالی ہیں، اور اس اعتبار سے ان کی سیرت پر یہ ایک نہایت جامع، بڑا بصیرت افروز اور بہت ہی حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے، اور اس امر کا شاہد عدل ہے کہ جب حضرت نانوتویؒ کا کاروانِ عمر چوبیسویں منزل طے کر رہا تھا، حضرتؒ موصوف کا شمار کبار علما ہی میں نہیں؛ بلکہ اس دور کے کبار اولیاء اللہ کے زمرے میں بھی ہونے لگا تھا۔ اس تذکرے میں حضرت نانوتویؒ کی

---

(۱) محمد حسین مرحوم نے چشتیہ صابریہ سلسلے کے سب ہی بزرگوں کا "انوار العارفین" میں تذکرہ کیا ہے؛ لیکن تعجب ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کا ذکر ان سے رہ گیا ہے۔ (چشتی)

سیرت کے جن پہلوؤں پر محمد حسین مرادآبادیؒ نے روشنی ڈالی ہے، وہ ایک غیر جانب دارانہ بیان ہونے کی وجہ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے تذکرہ نگار کی فراست وبصیرت اور حق پسندی اور راست گفتاری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ تذکرہ اس لحاظ سے کہ حضرت نانوتویؒ کی حیات ہی میں چھپا تھا، خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت نانوتویؒ پر کام کا سلسلہ جاری ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہمارے اس مضمون سے اب حضرت نانوتویؒ کی سوانح وسیرت کے ماخذوں میں دو اور قدیم تر ماخذوں کا اضافہ ہو جاتا ہے، اور یوں بنیادی ماخذوں کی تعداد دس (جب کہ "سوانح قاسمی" کے مقدمے میں حضرت قاری طیب صاحب (یہ مجہد ہم نے بیان کیا ہے) کے بجائے بارہ تک پہنچ جاتی ہے، جن میں اوّلیت کا شرف اسی مختصر سے تذکرے کو حاصل ہے۔

افسوس ہے کہ آج تک تذکرہ نگاروں کی نگاہ اس نادر تذکرے کی طرف نہیں گئی۔ اب پہلی مرتبہ اس تذکرے سے حضرت نانوتویؒ کے حالات نقل کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ محمد حسین مرادآبادیؒ نے حضرت نانوتویؒ پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ موصوف لکھتے ہیں:

ذکرِ حضرت مولوی محمد قاسم صاحب:

"وے حضرت حاجی خانۂ خدا وزائرِ روضۂ رسول اللہ اند، واز رؤسائے شیوخ صدیقی قصبۂ نانوتہ مستند، عالم اند متقی وربانی وحقانی وواقفِ اسرارِ شریعت وطریقت اند، وقول وفعل وے بے ریا وبے تصنع است، ومعرض از دنیا وارباب آں باوجود اہل وعیال آزادانہ ومجردانہ گزراں می کنند، وبہ قدر حاجت ضروری دنیوی کار بر خود مقرری نمایند، ولباس مولویانہ ومشایخانہ نمی دارند، وبا تکلف آشنانہ مقلد مذہب حنفیہ اند، ونیز مشرب چشتیہ بہشتیہ واجازت تعلیم علم باطن بر چہار طرق از حضرت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ، وسندِ حدیث از شاہ عبد الغنی مجددیؒ می دارند، ومانند محققاں وعارفاں درمیان سخن حقائق ومعارف ودر اثبات وجودی کلام می گویند، وبر شہود وتوحید شہودی انکار ندارند، ودر اکثر اوقات در شغل تنزیہ وتشبیہ خود را مشغول می دارند، وسماع غنا بے مزامیر اگر بہ طریق امور اتفاقیہ پیش می آید، انکار نہ دارند، واز ایشاں پرسیدم کہ در طریقہ حضرات جناب غلبہ چشتیہ است، فرمودند بلے کہ آں از حضرت شاہ عبد الباری رسیدہ است وقتے مرادآباد بہ تکلیف خاں صاحب شیر علی تشریف آوردند، ونیز بر مکان خان صاحب موصوف فروکش شدند، روزے خاں صاحب راقم نقل کردند کہ: قوال بے مزامیر غزلے گفت شنیدند وگرم شدند، چوں

نظر ایشاں بر بعضے ناواقفاں از حال و اسرار عارفاں و بے خبر از درد عاشقاں کہ دراں جا حاضر بود افتاد، فرمودند کہ: تاثیر ہر کس اثرے دارد و من اہل آں نیستم، انتھی آرے اخوان زمان و مکان دراں شرط است و باقی شروط آں در کتب قوم مرقوم است۔ سلمہ اللہ تعالیٰ!'' (صفحہ ۵۲۴)

ترجمہ از فارسی:

''حضرت موصوف مہاجر بیت اللہ اور زائر روضۂ رسول اللہ ہیں، اور قصبہ نانوتہ کے صدیقی روسائے شیوخ میں سے ہیں۔ عالم متقی ربانی وحقانی ہیں اور واقف اسرار شریعت وطریقت ہیں۔ ان کا قول وعمل نمائش وتصنع سے پاک ہوتا ہے۔ وہ دنیا واہل دنیا سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ عیال دار ہونے کے باوجود آزادانہ اور مجردانہ زندگی گزارتے ہیں اور ضرورت کے مطابق ہی دنیا کے کام کرتے ہیں، اور مولویانہ اور مشایخانہ لباس استعمال نہیں کرتے؛ بلکہ سادہ اور بے تکلف رہتے ہیں۔ حنفی مذہب کی تقلید کرتے ہیں اور چشتیہ مشرب رکھتے ہیں، اور چاروں سلسلوں کی اجازت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سے اور سند حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے رکھتے ہیں، اور محقق عارفین کی طرح حقائق ومعارف بیان کرتے ہیں، اور توحید وجودی کے اثبات میں کلام کرتے ہیں اور توحید شہودی کے مشاہدے سے بھی منکر نہیں ہیں، اور اکثر تنزیہ وتشبیہ کے شغل میں خود کو مشغول رکھتے ہیں اور کہیں بلا مزامیر سماع کی اتفاقیہ نوبت پیش آجائے، تو انکار نہیں فرماتے۔ میں نے موصوف سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ: آپ حضرات میں چشتیت کا غلبہ رہتا ہے؟ فرمایا: ہاں! یہ حضرت شاہ عبدالباریؒ کا اثر ہے۔

ایک دفعہ شیر علی خاں صاحب کی عیادت کے سلسلے میں مراد آباد تشریف لے جانا ہوا، ایک روز کا واقعہ خاں صاحب راقم سے نقل فرماتے تھے کہ: ایک قوال نے بغیر مزامیر کے غزل چھیڑ دی، سن کر جوش میں آئے؛ لیکن جب بعض ایسے لوگوں پر نظر پڑی، جو اہل معرفت کے حال سے ناواقف اور عشاق کے درد سے بے خبر وہاں موجود تھے، تو فرمانے لگے: ہر شخص کی تاثیر میں ایک اثر ہوتا ہے؛ لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ اخوان زمان ومکان کا ہونا سماع میں شرط ہے، اور باقی شروط سماع صوفیا کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ!''۔

اسی طرح حضرت نانوتویؒ کے نیازمندوں میں سے ایک بزرگ حافظ عبدالرحمٰن حسرت جھنجھانویؒ بھی تھے، انہوں نے ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں جو حضرت نانوتویؒ کا سال وفات ہے، ایک کتاب فارسی میں ''سفینۂ رحمانی'' لکھی تھی، جو ۱۸۸۴ء میں مطبع نول کشور۔ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، اب نہیں ملتی ہے۔ اس کے سفینۂ

دومی میں "درنشان سعادت مژدہ" کا تذکرہ ہے۔ اس باب میں "مرگ یاراں" کے زیرِ عنوان سب سے پہلے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تذکرہ کیا، جس میں ان کا اشہب قلم رکنے ہی کو نہیں کہتا۔ تذکرہ کیا ہے، رنگین نثر میں مرثیہ لکھا ہے، اور خوب لکھا ہے۔ پڑھیے اور لطف لیجیے۔ فرماتے ہیں:

"پانزدہم اپریل ۱۸۸۰ء، چہ روز قیامت وحشت بار است کہ رونمود چہ ہنگامہ محشر سینہ فگار است کہ پیش آمد اعنی محبّ دل نواز، سرمایۂ اعزاز و امتیاز، امام الاتقیاء، سراج العلماء، سرتاج فضلائے زمان، درخشاں گوہر اکلیل دین و ایمان مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور ازیں سراب گاہ بہ جنت الماویٰ شتافتند، و دل ما را از نشتر اندوہ بہ شگافتند، در نقاب خفا آمدن دیدن چہرۂ نورانی حیات شان در حقیقت نور دیدن، صف زاہداں و عابداں و علما و حکما است، و گزشتن از شان ازیں، وسواس گاہِ حزن آگیں رفتن قافلۂ سعادت منداں و ریاضت گرایاں تابان دل خورشید سیما است۔ سبحان اللہ! چہ عالم باعمل ستودہ منش، گزیدہ طبع، عظیم الشان، ممدوح عالم و عالمیاں بود کہ در علوم ظاہریہ رشک قدمائے سلف و تازہ بہار گلستان تقدس و ہر گونہ معلومات خلف بود و دل در پہلو ہم چو آفتاب روشن و درخشاں داشتند کہ انوار اسرار الٰہیہ و راز خفیہ بر آن تابان بود۔ و در رموز نہانی را بہ بلاغت و فصاحت بیان می فرمودند کہ عوام ہم بہ اندک تقریر چاشنی از فہمیدگی می چشیدند و بہرہ یاب از غوامض کہنہ و دراز دقیقہ می شدند، آئینۂ دلش نمونۂ قدرت نہ توانائی کبریائے بود کہ صور ہمہ اسرار باطنی و در از علوی دراں جلوہ افزائے شہود بود۔ و گنجینۂ سینہ پاکش خزینۂ جواہر زواہر نعمائے ایزدی و دفینۂ لاہوتی بے بہا ضیائے عطیۂ آسمانی بود۔ ذات ملکی صفاتش سراپا نور اسلام کہ در پردہ صورت انسانی روشنی یافتہ، حیات تقدس سماتش شعشۂ دین و ایمان بود کہ خورشید آسا بر سر جہاں و جہانیاں تافتہ تابش فیض از زمین تا فلک الافلاک درخشید و بارش کرمش گل زار ورع و اتقا را مطرد یاں گردانید از جوش دریائے علوم گونا گونش دشت پر خار جہل و نادانی مبدل بہ چمنستان سعادت و تقویٰ گردید و از خروش عمان حلم بوقلمونش وادی پا نگار سوئے خلقی و خبث باطنی از صفحۂ ہستی ناپدید گشتہ چمنستان شاداب ہمیشہ بہار تہذیب و شائستگی و زندہ و روانی شدہ۔

از و اپسیں یوم آں ہا حال دل تا چہ گویم کہ نتوانم گفت و از ہائے الم سینہ خراش را در سلک گفت کسے، نیچ نہ توانم سفت، گروہ زہد و تقویٰ و ورع و ریاضت مانند ارادت کیشان راسخ الاعتقاد، حاشیہ نشیناں حلقہ مطاوعت او بود و گروہ سعادات کونی و الٰہی و طہارات دینی و دنیوی و تزکیۂ و تنزیہ خفی و جلی مانند خادمانِ جاں نثار و مریدان خوش انقیاد بساط بوس بزم عقیدت او بود، از دیدن

روئے پاکش گلشن ایمان نضارت و سیرابی می یافت و از نورِ جبین منفش ضیائے آفتاب اسلامی تافت ہر کہ او را دید بہ دل و جان احکام اسلام ورزید و کسوتِ تقویٰ و طیلسان صداقت پوشید یکماز میدان ارادت پناہ و عقیدت مندان صداقت دست گاہ اعمال صالحہ و کردار پسندیدہ است کہ برائے حصول شرف دارین و اقتباس انوار طیبات کونین بیعت صادقہ بر دست پاکش کردہ پیوستہ پابوس ملازمت می ماند و حضوری دائمی را اعزاز و مباہات خودی پنداشت پیدا است کہ از پدرو کردن صف ہستی مولوی اقلیم علم و عمل و کشور زہد و تقویٰ بے فرمان فرمادیران شد و ہر یک از آں ہا فاتحہ رخصت خواندہ راہی لامکاں شد۔

یارب! چہ ملائکاں و ساکنان ملأ اعلیٰ را ضرورت تعلیم ایمان و اسلام بود کہ برائے رہنمائی و ہدایت ایشاں ایں بحر معرفت نتواند۔

یارب! چہ منبر و وعظ فردوسیاں از ناصح برہنہ گوفر از بیان شیریں زبان خالی بود کہ ایں کانِ علم و ہنر را بر آں نشاندند۔

یارب! چہ بالانشیناں و فرشتگان چرخ را آرزوئے شنیدن تقریر دل پذیر بود کہ ایں عالم پاک گوہر را از فرشیان جدا کردہ با عرشیاں ارتباط جاوید بخشیدند۔

یارب! چہ ملائکہ را دریائے عشق تحقیق غوامض عرفان بہ جوش آمدہ بود کہ بہ پاس خطر آں ہا ایں مہر سپہر فضل و کمال را از بزم دین ما بر داشتہ در حلقہ کردبیاں رسانیدند۔

آہ! ہزار آہ! دنیا خوانیست مملو از طعام ہائے رنگارنگ اما زہر آلود خوبی ست، شیریں و خوش نشہ تعبیرش مرگ حسرت آموز ریاضے است، خوش نما و پر فضا! لیکن از باد سموم فنا پژمردہ ہا لیست روح پرور فرحت افزا! مگر از لطمہ خزاں افسردہ۔

نظم

نہ مردہ است قاسم جہاں مردہ شد		گل تازہ از باغ افسردہ شد
یکے شمع گل شد جہاں شد سیاہ		بہ ابر فنا رفت رخشندہ ماہ
فنا ہست ہر چیز موجود را		بقا ہست بس رب معبود را
خدا را بقا و ہمہ را فنا		بہ جز او کے را نہ باشد بقا
ہر آں کس کہ جاں زندہ دارد بہ تن		گل خوش نما ہست آں در چمن

ایں غم جگر سوز و حادثۂ سینہ دوز پردۂ زنگاری بہ روئے دلہائے ما کشیدہ کہ دراں گزر اندیشہ نیست و ایں تیر الم دل نگار از پہلو ہم بروں سوز گزشتہ کہ از درداو جز دلم کسے راخبرے نہ۔ افسوس بر افسوس ست کہ شمع جہاں افروز در تاریکی از بزم دین و اسلام بہ طرفۃ العین بہ مردد فتم بہبودی علم و فضل از جریدۂ کائنات بہ کزلک فنا بہ چشم زدن برد، ازیں آتش اندوہ ہر تر و خشک کہ داشتم ہمہ را بسوختم و از خدنگ آہ دردناک سینۂ ہفت ورق افلاک را دوختم، و نافہ ہائے مشک مشام افروز ہر تمنا و آرزو را در مجمر یاس خاکستر کردم و بساط خودی و خودداری از ایوان اندرونہ خود در نوردیدم، و پردۂ نیلگوں بر چہرۂ عروس ہستی فروا ندوختم، دل وائے ماتمی در میدان زندگی بلند افراختم۔ دریغ بر دریغ است کہ بزم یاران بر خاست و مینائے خرمی و ساغر انبساط بر سنگ جفا بہ شکست و ردۂ غم گساراں از خود بستہ از بازار کون و فساد برفت و مارا تنہا بے یار و ہم راہ دریں دشت پر خار کہ نامش زندگی ست بہ گذاشت و نہال کوشش ثمر عزم خود را در چمن فردوس بکاشت۔

یارب! بر ما و بر گذشتگان کہ از پیش ما در گذشتند رحم کن و خرمن معصیت را ز برق جہاں سوز آہ نیم شبی نیکو بہ سوز و چشم را آں سیلاب پر جوش دہ کہ ہمہ خس و خاشاک بزہ و عصیاں را فرابرد، و گرد ندامت و خجالت را از چہرۂ سیاہ ما بہ شوید:۔

بیا	مرز	یارب	مر	ایں	بندہ را
تو	آمرز	گار	است	من	زشت کار

ترجمہ از قاری:

''۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء کا دن بھی کس قدر وحشت بار قیامت کا دن نکلا اور کیسا سینہ فگار ہنگامۂ محشر بپا ہوا، یعنی دل نواز دوست اور سرمایۂ اعزاز و افتخار، امام الاتقیاء، سرتاج فضلائے زمانہ، تاج دین و ایمان کا گوہر درخشاں مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور اس سراب گاہِ دنیا سے جنت الماویٰ کی طرف روانہ ہوگئے اور ہمارے دلوں کو نشترِ غم سے زخمی کر گئے۔ آپ کی زندگی کے نورانی چہرے کا نقاب میں چھپ جانا حقیقت یہ ہے کہ زاہدوں، عابدوں عالموں اور حکیموں کی صفوں کا لپٹ جانا ہے۔ آپ کا اس غم آگیں وسوسہ گاہ سے گزر جانا دراصل سعادت مند مرتاض روشن ضمیر اور آفتاب سیما بزرگوں کے قافلے کا گزر جانا ہے۔

سبحان اللہ! کیسے عالم باعمل، پاکیزہ طینت، برگزیدہ طبیعت، بلند رتبہ، سارے جہاں کا ممدوح، علوم ظاہریہ میں متقدمین سلف کے لیے باعث رشک اور گلستان تقدس کی تازہ بہار اور

ف کی ہر طرح کی معلومات کا حامل تھے۔ پہلو میں دل آفتاب کی طرح روشن اور درخشاں رکھتے تھے کہ اسرارِ الٰہیہ کے انوار اور مخفی راز آپ پر ہویدا تھے، اور رازہائے نہانی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے تھے کہ: عوام بھی تھوڑی سی تقریر کی روشنی سے سمجھ کی روشنی کا مزہ پا لیتے تھے، اور پرانی گہری باتوں اور دقیق رازوں سے بہرہ یاب ہو جاتے تھے۔ آپ کا آئینۂ دل اللہ کی قدرت و توانائی کا ایک نمونہ تھا کہ سارے اسرارِ باطنی اور رازِ علوی جس میں جلوہ گر رہتے تھے۔

اور آپ کا سینۂ پاک کا گنجینہ اللہ کی نعمتوں کے قیمتی جواہر کا خزانہ اور بیش قیمت موتیوں اور آسمانی روشن عطیے کا دفینہ تھا۔ فی الحقیقت آپ کی فرشتہ خصلت اور سراپا نورِ اسلام ذاتِ انسانی صورت میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ ان کی تقدس مآب زندگی دین و ایمان کے لیے ایک شعاع تھی، جو سورج کی طرح دنیا اور اہلِ دنیا پر روشن ہوئی تھی، اور ان کے فیض کی تابانی سے زمین سے لے کر فلک الافلاک چمک اٹھے اور ان کی بزرگی کی بارش نے زہد و تقوے کے باغ کو سیراب کر دیا ہے۔ آپ کے گوناگوں علوم کے دریاؤں کی روانی سے جہالت و نادانی کا دشت پرخار، سعادت و تقوے کے چمنستان میں تبدیل ہو گیا ہے، اور ان کے بوقلموں دریائے علم کے جوش سے بدخلقی اور خبث باطنی کی پرخار وادی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو کر تہذیب و شائستگی کا سدابہار شاداب بہار بن گئی ہے۔ ان کی وفات کے وقت سے حالِ دل کیا کہوں کیا ہے؟ کچھ کہا نہیں جاتا اور سینہ خراش غم کے دانوں کو کسی نہج سے بھی گفتگو کی کڑی میں پرویا نہیں جا سکتا۔ زہد و متقی، پرہیزگار اور مرتاض بزرگ بھی ارادت مندوں اور پختہ اعتقاد والوں کی طرح ان کے حلقۂ اطاعت میں کنارہ نشین رہتے تھے۔ دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ مند ظاہری و باطنی طہارت سے آراستہ، تزکیہ و تنزیہ سے بہرہ مند جماعت جاں نثار خادم اور طاعت شعار مریدوں کی طرح ان کی بزمِ عقیدت کے زمیں بوس رہتی تھی۔ ان کے روئے پاک کے دیدار سے گلشنِ ایمان تر و تازہ ہوتا اور سیرابی حاصل کرتا تھا اور ان کے روشن جبیں کے نور سے آفتابِ اسلام کی ضیا روشن ہو جاتی تھی۔ جس نے ان کو دیکھ لیا، اس نے دل و جان سے اسلامی احکام قبول کر لیے اور لباسِ تقویٰ اور صداقت پہن لیا، جو شرفِ دارین کے حصول اور دونوں جہان کے انوارِ طیبہ سے منور ہونے کے لیے آپ کے دستِ پاک پر بیعت کر کے ہمیشہ پابوس ملازمت رہتا ہے، اور وہ ای حضور کو اپنے لیے اعزاز و افتخار سمجھتا ہے۔ وہ مخلص مریدوں اور صادق عقیدت مندوں میں سے

اعمالِ صالحہ اور پسندیدہ کردار کا حامل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے صفحۂ ہستی سے اٹھ جانے کی وجہ سے علم وعمل کی ولایت اور زہد وتقوے کی سلطنت ویران رہ گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک فاتحۂ رخصت پڑھ کر راہی لامکاں ہوگیا۔

یارب! کیا فرشتوں اور ملاِ اعلیٰ کے باشندوں کو ایمان واسلام کی تعلیم کی ضرورت تھی کہ جن کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے اس بحرِ معرفت کو وہاں بلایا گیا؟

یارب! کیا فرشتوں کا ممبرِ وعظ، صاف گو، واضح بیان، شیریں زبان ناصحین سے خالی ہوگیا تھا کہ علم وہنر کی اس کان کو اس پرلے جاکر بٹھلا دیا گیا ہے؟

یارب! کیا بالانشینوں اور آسمانی فرشتوں کو تقریرِ دل پذیر سننے کی آرزو تھی کہ اس پاک گوہر عالم کو فرشیوں سے الگ کرکے ہمیشہ کے لیے عرشیوں سے وابستہ کردیا ہے؟

یارب! کیا فرشتوں کی معرفت کی باریکیوں کی تحقیق کا دریائے عشق جوش میں آگیا تھا کہ ان کی خاطر اس آسمانِ فضل وکمال کے آفتاب کو دنیا کی بزم سے اٹھا کر فرشتوں کے حلقے میں پہنچا دیا؟

آہ! ہزار آہ! دنیا ایک دسترخواں ہے، جو رنگا رنگ؛ مگر زہر آلود کھانوں سے بھرا ہوا ہے، اور ایک شیریں اور پُر نشہ خواب ہے، جن کی تعبیر حسرت آموز موت ہے، اور ایک خوش نما اور پُر فضا باغ ہے؛ مگر فنا کی لو سے پژمردہ ہونے والا اور روح پرور اور فرحت افزا چمن ہے، جو خزاں کے اثر سے مرجھا گیا ہے۔

نظم کا ترجمہ: صرف قاسم نہیں مرا؛ بلکہ سارا جہاں مرگیا ہے۔ باغ کا ایک تازہ پھول مرجھا گیا ہے۔ ایک شمع کیا گل ہوئی کہ جہاں ہی سیاہ ہوگیا ہے۔ فنا کے بادلوں میں روشن چاند چھپ گیا ہے۔ ہر موجود چیز کے لیے فنا ہے۔ بس ربِ معبود کے لیے صرف بقا ہے۔ خدا باقی ہے، باقی سب فانی ہے، اس کے سوا کسی کے لیے بقا نہیں ہے۔ جو شخص زندہ جان بدن میں رکھتا ہے، وہ چمن کا ایک خوش نما پھول ہے۔

ترجمہ از فارسی:

اس جگر سوز غم اور سینہ دوز حادثے نے ہمارے دلوں پر ایسا پردۂ زنگاری کھینچ رکھا ہے، جس میں کسی اندیشے کا گزر نہیں ہے، اور اس دل فگار رنج کا تیر پہلو کے پار ہوگیا ہے، جس کی ٹیس کی خبر میرے دل کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ افسوس! افسوس کہ تاریکی میں جہاں کو روشن کرنے والی شمع

دین واسلام کی بزم سے پل بھر میں بجھ گئی، اور اور علم وفضل کی بہترین تحریر فنا کے قلم سے پلک جھپکنے میں صفحۂ کائنات سے محو کر دی گئی ہے۔ غم کی اس آگ نے جو خشک وتر میرے پاس تھا، سب پھونک دیا۔ آہ! دردناک کی سوزش سے ساتوں آسمان کے سینے کو میں نے سی دیا ہے۔ خودی اور ہر تمنا اور آرزو کے دماغ کو معطر کرنے والی مشک کی تھیلیوں کو یاس وناامیدی کی بھٹی میں جلا کر راکھ کر چکا ہوں، اور خودداری کی بساطِ دروں لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ وجود کی دلہن نے رخسار سے نیل گونی پردہ اتار زندگی کے میدان میں ماتمی جھنڈا بلند کیے ہوئے ہوں۔ افسوس! صد افسوس کہ بزم یاراں برخاست ہوگئی اور مسرت کی مینا اور خوشی کا ساغر ظلم کے پتھر سے چکنا چور ہوگیا، اور جماعت غم گساراں اپنا سامان اٹھا کر اس دنیا سے رخصت ہوا، اور ہمیں اس دشت پر خار میں جس کا نام زندگی ہے، بے یار ومددگار چھوڑ گیا ہے، اور اپنے ارادے کے اچھے پھل دار درخت کو چمن فردوس میں جا کر بو دیا ہے۔

یارب! ہم پر اور ہمارے اسلاف پر رحم فرما، اور آہ و نیم شبی کی برق جہاں سوز سے خرمن معصیت کو پوری طرح پھونک دے، اور آنکھ کے چشمے میں وہ جوش سیلاب عطا فرما کہ گناہ و معصیت کے سارے خس وخاشاک کو بہا لے جائے، اور ندامت وشرمندگی کی گرد کو ہمارے سیاہ چہرے سے دھودے:۔

"ندامت مدہ ایں سر افگندہ را"

حکیم عبدالرحمٰن حسرتؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ "سفینۂ سوئی" جس کا عنوان ہے: "حکایات مختلف فوائد خیز ندرت آمیز" میں بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"شیر بیشۂ فضل وکمال بوئے دل آویز گل زار عشق ایز دذوالجلال:

شمع شبستانِ طریقت وشریعت، مہر سپہر حقیقت ومعرفت، عالم کامل، ودر جود وسخا رشکِ حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب، نور اللہ مرقدہ از گزیدۂ علمائے سنجیدہ، فضلا وقصبۂ نانوتہ بودہ است، و منازلِ علوم گوناگوں، ونشیب وفراز رموز فنون بوقلموں، بہ قدم ہمت وتیز دے خر تاب خدادا نیکو پے مودہ بود، اور ارکانِ علوم ومخزنِ فنون باید گفت، آں چہ در توصیف اوشی اندیشہ برنگار وبجا است، وہر قدر کہ تعریفش سرایدہ آید زیبا است، بر اسرار تصوف وصفائے باطنی از فیض ورہنمائی حاجی امداد اللہ صاحب عبور وافر داشت، ودر میدانِ ورع وتقویٰ لوائے انا لاغیری می

افراشت، تابش ذہن و ذکایش درخشاں تر از برق خاطف بود، و تقریر دل پذیرش، ہر گونہ مشکلات علمی و حکمی را کاشف، آں چہ در ہمہ عمر دیدہ و شنیدہ بود، ہمہ محفوظ خاطر بود سینہ، او را نمونہ لوح محفوظ باید گفت دل آئی آب دار انداز و نصیحتش را در رشتہ جاں باید سفت، از بس شیریں کلام و عذب البیان بودہ و گرے سبقت از ہمہ علمائے موجودہ زمان ربودہ، بہ تاریخ پنجم جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ یک ہزار و در صد و ہفت و نہ ہجری ازیں کارگاہ کن فیکون رخت ہستی برداشتہ راہی ملک جاوید شد زادگاہ نانوتہ و آرام گاہ و اپسیں قصبۂ دیوبند است"۔

ترجمہ از فارسی:

"فضل و کمال کے شیر، عشق الٰہی کے گل زار کی بوئے دل آویز، طریقت شریعت کی رات کے لیے شمع، حقیقت و معرفت کا آفتاب، عالم کامل، بخشش و سخاوت میں رشکِ حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب، نور اللہ مرقدہ قصبۂ نانوتہ کے برگزیدہ علما اور سنجیدہ فضلا میں سے ہوئے ہیں۔ گوناگوں علوم کے منازل اور بوقلموں فنون کے نشیب و فراز کے رموز ان کی ہمت اور خدا داد طاقت کی بہ دولت طے ہو سکے تھے۔ ان کو معدنِ علوم اور خزانۂ فنون کہنا چاہیے۔ ان کی توصیف کا تب فکر جو کچھ لکھ سکے بجا ہے، اور جتنی بھی ان کی تعریف کی جا سکے درست ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے فیض و رہنمائی سے وہ تصوف اور صفائے باطن کے اسرار پر کامل عبور رکھتے تھے۔ میدانِ ورع و تقویٰ میں وہ بے مثال فرد تھے۔ ان کی ذکاوت و ذہانت کی روشنی بجلی سے بھی زیادہ درخشاں اور ان کی 'تقریر دل پذیر' علم و حکمت کی ہر قسم کی مشکلات حل کر کے رکھ دیتی تھی۔ ساری عمر جو کچھ دیکھا سنا سب ان کو محفوظ تھا۔ ان کے سینے کو لوح محفوظ کا نمونہ کہنا چاہیے۔ ان کے وعظ و نصیحت کے آب دار موتیوں کو رشتۂ جانی میں پرونا چاہیے۔ وہ انتہائی شیریں کلام اور خوش بیان تھے۔ اپنے زمانے کے تمام ہم عصر علما سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/ کو وہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ کر راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کا پیدائشی وطن نانوتہ اور دائمی خواب گاہ دیوبند ہے[1]۔

(۱) ماہ نامہ الرحیم حیدرآباد، نومبر ۱۹۶۶ء/ص: ۵۶-۴۳۹۔

قطعۂ تاریخِ وفات

قبلۂ اربابِ دین، کعبۂ اصحابِ یقین، حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ، بانی وسرپرست مدرسۂ اسلامیہ دیوبند، کہ بہ تاریخ ۴؍ جمادی الاولیٰ، یوم پنج شنبہ، وقت صلاۃ ظہر ۱۲۹۷ھ کو دارِ آخرت کی طرف رحلت فرمائی (۱)۔

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدا کی رحلت کا		کہ جرعہ نوش الم جس سے ہر دردنہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا		مثالِ خُمِ فلک جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے		لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیل گونہ ہے
ہے حامیانِ شریعت کو گر غم بے حد		تو سالکانِ طریقت کو اس سے دونہ ہے
کہاں ہے مدرسۂ دیں کا حامیٔ برحق		کہ ملکِ علم وعمل اُن بغیر سونہ ہے
نہ پوچھ حالِ دلِ زارِ تشنگانِ علوم		کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چہ گونہ ہے
کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب		تو آتشِ غمِ فرقت نے دل کو بھونا ہے
مگر مزارِ مقدس سے تیرے اے خوش خو		ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے
سرِ الم سے لکھی فضلؔ نے سنینِ وفات		وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے
		۱۲۹۷ھ (۲)

(۱) از نتائجِ طبع حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب عثمانی۔

(۲) (ماخوذ از) سوانح قاسمی، ج:۳، ص:۱۵۳۔

مرثیہ حضرت نانوتویؒ

مشتمل بر کیفیتِ اجرائے دار العلوم دیو بند

جانشین حجۃ الاسلامؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیو بندیؒ

یہ مرثیہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے جلسہ منعقدہ ۲۰ رصفر المظفر ۱۳۲۴ھ/ ۱۵ راپریل ۱۹۰۶ء رمیں سنا کر حضار مجلس کو مضطر و بے قرار بنا دیا تھا۔

ہیں مِن اور محن دونوں جہاں میں تـــــــوأم		حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم
رحمت و فضلِ خدا جب ہے غضب پر سابق		کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں لطف و کرم
اس کی آغوشِ غضب میں ہیں ہزاروں رحمت		اس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم
فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہونا مایوس		خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم
رحمتِ حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں		پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ والم
انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن		ہر تغیر سے صدا آتی فَـافْهَـمْ فَـافْهَـمْ
لِلّٰـــهِ الْـحَـمْـدُ میری جان اور اِنَّـا لِلّٰـــهِ		مرغِ ایمان کی ہیں بازوئیں دو مستحکم
دور اندیش وہی ہے کہ مصائب کے عوض		ہو کے خوش مرضی مولیٰ کی کرے بیع سلم
جزر و مدِ بحرِ حوادث کا بہ چشم حق بیں		طرۂ شاہد تقریر کا ہے پیچ و خم
گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے		كُـلَّ يَـوْمٍ هُـوَ فِـيْ شَـأْنٍ کا نقشہ ہر دم
کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھن گھور گھٹا		جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم
آبِ حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی		ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اعمیٰ واصم
رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکا یک اٹھے		چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم
یوسفِ علم شریعت کے خریدار بنے		جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود درم
سلسلہ ڈالا فقیرانہ بہ نام ایزد		گوردہ (دیوبند) میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو، ضعف کہے تھا ٹھہرو	ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم
اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مردِ خدا (نانوتوی)	آرہا تیز روی سے ہے لیے ساتھ علم
بے نیازی وتوکل رخِ روشن سے نمود	قطعِ منزل کے لیے دونوں قدم تیغ دو دم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور	پڑ گئی جان میں جان آ ہی گیا دَم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور	زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج	تھے عجائب کچھ اس شیرِ خدا کے دَم خم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی	یک بہ یک چونک پڑے اہلِ مَدَر اہلِ خیَم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی	کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم
عقل وانصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر	ذوقِ علمی کا تھا جس سینے میں تھوڑا سا بھی دَم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُوْدَع	خیر کا شمہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نَحْنُ مَعَکْ	جس جگہ اس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
اس مربیِ دل وجاں کی مسیحائی سے	علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم
ابر علم وعمل وفضل کا بادل برسا	جس جگہ اس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم
جہل کے جب سبھی کہنے لگے اِخْسَا اِخْسَا	چل دیا پاؤں دبے جھکے سے بادلِ ہمہ وزم
علم کو لا کے ثریا سے ثریٰ پر رکھا	آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
دواتِ علم سے سیراب کیا عالم کو	قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علم
اس کی آواز تھی بے شک دمِ عیسیٰ کی صدا	جس کے صدقے سے لیا علم نے دوبارہ جنم
طائرِ علم شریعت کے لیے یہ دیمن	برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے امصار وقریٰ تک جاری	اس کی امت سے ہوئے حل بے ترا نیض اُمم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کی	اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم
یک بہ یک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی	چل دیے چھوڑ کے یہاں سب کو سوئے باغِ ارم
لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوب ورفیع	خوں آنکھوں سے بہاتے تھے رشیدِ عالم
دیکھ کر حضرتِ امدادؒ کی زاری کو ملک	پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی اِرْحَم
اہلِ علم واہلِ ورع خاص وعوام عالم	سب نے تقسیم کیا پر نہ ہوا کم یہ غم
فرقِ درجات کا قصہ تو جدا ہے؛ لیکن	عام تھا عالمِ اجسام میں اس کا ماتم

متزلزل ہوئے سب مدرسے کے رکنِ رکین / ہل گئے ہائے غضب سلسلۂ خیر کے تھم
علم آتا تھا نظر ایک یتیم بے بس / اہلِ علم آہ تھے مایوس بہ چشمِ پُر نم
قاسمِ علم چلے علم بھی لو ساتھ چلا / کس کو تھاموگے کہو پکڑوگے کس کس کے قدم
ایک کا کرنا سفر دوسرے کا عزم سفر / جانِ عالم کے لیے دونوں تھے سوہانِ الم
ہوگیا سب کو یقین باندھ لیا سب نے خیال / سلسلہ علم کا ہوگیا بس درہم برہم
اسی مایوسی ومجبوری وحیرانی میں / مجتمع ہو کے اکابر نے بہ چشمِ پُر نم
حضرت مرشدِ عالم (مہاجر مکی) سے تمنا یہ کی / آپ اب اپنے تصرف میں لیں یہ کار اہم
عنایتِ خلق سے فرمایا: کما ہوں میں / باقی ہر حال میں ہوں ساتھ تمہارے منضم
چند کلمے کہے نرمی سے تسلی آمیز / ہوگئے زخم رسیدوں کے جگر کو مرہم
ہائے وہ نیچی نظر! ہائے شیریں الفاظ! / کس غضب کے تھے کہ دور ہوئی تلخیٔ سم
آپ کی پاک توجہ سے ہوا سب کو سکون / علم کے اکھڑے ہوئے جم گئے واللہ قدم
کام اس مدرسے کا فضل وکرم سے اس کے / الغرض رو بہ ترقی ہی رہا ہر ہر دم
مذہبی جتنے سلاسل تھے، رہے سب جاری / کام کوئی نہ رکا، سہل تھا وہ یا مہتم
بعد چندے ہوا نیرنگیٔ قدرت کا ظہور / یعنی یعقوب ورفیع ہر دو وزیرِ اعظم
ہو کے مشتاق تھا پہنچے یکے بعد دگر / خدمتِ قاسمِ خیرات میں شاد وخرم
دست وپا بھی لو چلے، سر تو تھا پہلے ہی گیا / قلب بس باقی رہا، یعنی رشید عالم
وہ بھی مجروح ستم دیدۂ ہجر احباب / جرعہ نوشِ ستم ودُرد کش ساغرِ غم
اسی اندوہ وغم ویاس میں سبحان اللہ! / رحمتِ حق ہوئی مبذول بہ حالِ عالم
بھردیا قلبِ مقدس میں تمام عالم کا / درد وغم خیر وصلاح خوب ملا کر باہم
خاص کر ترکۂ قاسم کی محبت واللہ! / بے طرح اس دلِ اقدس میں ہوئی مستحکم
سب کی الفت پہ تھی اس کی ہی محبت غالب / سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم
پھر تو کیا تھا! دی خدا نے وہ ترقی اس کو / دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم
پوچھتے کیا ہو دماغوں کا ہمارے احوال / ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم
نہ رُکا پر نہ رکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا / اس کا جو حکم تھا، تھا سیفِ قضائے مبرم
نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے / فتنے نے سر نہ اٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم

کلفتیں جھیلیں سبھی، پر نہ ہوا چیں بہ جبیں	ذلتیں دیکھیں، ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم
دشمن ودوست کے چہرے میں تفاوت ہے عیاں	سرسوں پھولی تھی وہاں اس نے ملا تھا عندم
سب مریضوں کے لیے ایک وہی تھا آثار	سیکڑوں زہر تھے، تریاق تھا بس اس کا دم
قاسم وحضرت امداد کو مرنے نہ دیا	بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علی وجہِ اتم
مردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا	اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم
ہائے غم! ہائے ستم! ہائے غضب! ہائے الم!	آج اس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم
آگے کہنے کی ہے کچھ بات، نہ سننے کی تاب	لب تلک آتا ہے؛ لیکن یہ مقولہ پیہم
رحم بر بے کسم ہیچ نہ کردی رفتی	ایکہ کفش کف پائے تو بود تاج سرم
آج تو قاسم وامداد سبھی مرتے ہیں	اس کا کیا ذکر ہے، برباد ہوئے تم یا ہم
خطر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گزرتا کیا ہے	قہر کا خوف ہے، پر ساتھ ہے امید کرم
تو رحیم وملک بار ہے مَلْم مَنْم	ہم جھول اور زیاں کار ہیں اِزْخَم
اے اسیرانِ غمِ قاسمِ خیر وبرکات	دے فقیران سیر کوئی رشید جانم
پیروی کرتے رہو، کسی کو ہاتھوں سے نہ دو	بدلے یا درمے یا قدمے یا بہ قلم
بے نمک ہیں مرے اشعار: مگر تلخ نہیں	خالی از درد نہیں، گرچہ ہیں نشم چشم (1)

(۱)(ماخوذ از) سوانح قاسمی، ج:۳، ص:۵۷-۱۵۴۔

ادبیات:

مرثیہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی قدس اللہ سرہٗ

مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم نے اس مرثیہ کی اشاعت کے وقت جو نوٹ لکھا تھا وہ یہ ہے:

''ہم سے پہلے جو لوگ عالمِ آخرت کا سفر کر جاتے ہیں، ان سے ہماری جدائی کی مدت اگرچہ غیر معین ہے؛ لیکن بہر حال عارضی ہے کہ اس دنیائے جنان و جاوداں میں ہم سب کو ایک دن زندگی کے ایک نئے تصور اور زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہو کر باہم اکٹھا ہو جانا ہے:

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ(۱).

لیکن ایک محبت کرنے والے کے لوحِ دل پر یہ عارضی جدائی بھی کیسا داغِ حسرت ڈال جاتی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے مرثیہ سے ہو سکتا ہے، جو حضرت شیخ الہندؒ جیسے باکمال شاگرد نے اپنے استاذ حضرت مولانا نانوتویؒ کی وفات پر کہا ہے''۔ (مرتب)

ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشک بار حیف		ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغ دار حیف
کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہاں کو		دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف
ہے کیا سبب جہاں میں آتا نظر نہیں		جز آہ درد ناک ودم شعلہ بار حیف
زیبِ جبین ماہِ مبین کیوں ہے داغِ غم		زخمی جگر ہے کیوں گہر آب دار حیف
مسکن پذیر دل میں ہے کیوں رنج و یاس و آہ		سب خواہشوں نے دل سے کیا کیوں فرار حیف
یہ کس کی تیغِ غم نے کیا قتلِ عام آج		جاتا ہے شورِ نالہ جو گردوں سے پار حیف
ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ		آتا نظر ہے ہر کوئی زار وزار حیف

(۱) سورۂ عنکبوت کی آیت: ۶۴ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور یہ دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے، اور بے شک جو پچھلا گھر ہے حقیقت میں وہی زندگی ہے، کاش یہ اس بات کو جانتے''۔

دشنہ کا کب گلو کو بھلا اشتیاق تھا		صبر وسکوں سے آتا تھا کب ہم کو عار حیف
کل تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضر کی		ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف
یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے		یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف
خورشیدِ علم آج ہوا کون سا غروب		عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف
یہ کون چل بسا ہے کہ جس کے فراق میں		آتا زباں پر ہے میری بار بار حیف
آنکھوں میں جوشِ اشک ہے، سینے میں درد ہے		دل میں غم والم ہے زباں پر ہزار حیف
سر ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک ہائے		دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف
مونس الم رفیق فغاں غم گسار غم		ہم درد وہم نفس اُف یار غار حیف
ہر بات جس کی مایۂ صبر شکیب تھی		عالم ہے اس کے ہجر میں اب بے قرار حیف
جو باعثِ نشاط دلِ ناصبور تھا		روتے ہیں ان کے ہجر میں اب زار زار حیف
جب باعثِ حیات ہی ہو موجبِ ممات		اللہ کیا کرے دلِ امیدوار حیف
ہاں اے اجل! خدا کے لیے چشمِ التفات		بے روئے یار زیست ہے اب ہم کو بار حیف
کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط وعیش		وردِ زباں اب تو ہے لیل ونہار حیف
زیرِ زمیں ہی چل کے رہو ہم دمو کہ ہاں		کچھ لطف زندگی نہیں بے روئے یار حیف
اس مایۂ حیات کی فرقت میں یا نصیب		ہو پائے دارِ ہستی نا پائے دار حیف
اوروں کی زندگانی پہ ہو خاک دست رس		اپنی موت پر بھی نہیں اختیار حیف
پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی		کیا اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار حیف
بن جائے اپنے واسطے خضرِ رہِ عدم		ملتا نہیں ہے ایسا کوئی دست دار حیف
کیوں کر کہوں نہ موت سے بد تر حیات کو		غم جی میں، درد سینے میں، دل میں غبار حیف
جتنی تھیں خواہشیں، ہوئی یاس سے بد دل		شاخِ امید لائی تو کیا لائی بار حیف
وہ دیوبند رشکِ ارم جس کا تھا لقب		کہتا ہے عالم آج اسے دشت خار حیف
عالم سے ظلِّ رحمتِ حق جب کہ اٹھ گیا		رہ رہ کے کیوں نہ آئے مجھے بار بار حیف
"تقریرِ دل پذیر" ہو جس کی غذائے روح		وہ لقمۂ اجل ستم روزگار حیف

کشاف دین وکتم عدم وائے بخت بد		شمس الہدی وپردہ نشین غبار حیف
بلو خزاں وگلشنِ دین اے زمانہ آہ!		برق فنا وخرمن صبر وقرار حیف
عیسیٰ دم اور صرصر مرگ اے فلک دریغ		گنج علوم وہبی وکنج مزار حیف
موسائے وقت وسحر اجل وا مصیبتا		خضرِ زمان وگوشہ نشین حصار حیف
یوسف لقا وچاہ لحد ہم دم الحذر		دیو قضا واصف دوران شکار حیف
کشتی نوح دمدمہ طوفان الاماں		طغیانی حوادث وکوہ وقار حیف
جور سپہر دیکھ کہ بے کساں نغاں		الطاف مرگ وعالمِ شب زندہ دار حیف
تحت الثریٰ وچشمۂ آب بقا غضب		سنگ مصایب وشجر بار دار حیف
وقف سموم ہو گل شاداب ہائے ہائے		پامال خارہ ہو دُرِ شاہ وار حیف
گو دم نہیں پہ نکلے ہے دل سے یہی صدا		پژمردہ آہ ہو گل خنداں ہزار حیف
جائیں عدم میں یوں کرم وفضل وجود آہ		عالم ہو اور حسرت وماتم ہزار حیف
فخر وہنر کمال وسخا جود واتقا		دستِ قضا سے بے سروپا ہوں ہزار حیف
مل جائیں فضل وعلم وعمل اب زمین میں		پیوند خاک زہد وسخا ہوں ہزار حیف(1)

(۱)(ماخوذ از) ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ربیع الاول ۱۳۷۳ھ/نومبر ۱۹۵۳ء، ص: ۴۷/۴۸۔

نگارشات اکابر سے منتخب مضامین مکمل ہوئے

آئندہ صفحات میں دو اہم مضمون دیئے جا رہے ہیں جو کہ ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم دیوبند وقف'' کے شمارہ شعبان ورمضان ۱۴۴۰ھ سے ماخوذ ہیں۔ (مرتب)

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

کے علوم وافکار کی تشریح وترجمانی "تقریر دلپذیر" کی روشنی میں

مولانا غلام نبی قاسمی ❖

اہل علم جانتے ہیں کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی دینی بصیرت اور فرق ضالہ باطلہ کی تردید میں مضبوط عقلی دلائل آپ کا ایک ایسا امتیاز ہے کہ جو حجۃ الاسلام امام غزالی اور حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے حصہ میں آیا، حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند نے بتوفیق ایزدی حضرت نانوتویؒ کی جملہ تصانیف کی تشریح وتسہیل کا عزم کیا ہے۔

افادۂ قارئین کے لیے آغاز حضرت قدس سرہٗ کی مشہور تصنیف **"تقریر دلپذیر"** سے کیا جارہا ہے، امید ہے کہ یہ سلسلہ اہل علم کو پسند آئے گا۔

محمد شکیب قاسمی

ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی

ایک کا بیان تو یہ ہے کہ عجب نہیں جو یہ لوگ بندگان مہذب اور خدا پرست میں سے ہوں، اور جیسے دنیا میں غلام جاں نثار، ہوشیار کا گاہ وبے گاہ کہا مان لیا کرتے ہیں اور اس کی سفارش اور غمازی جس کسی کے حق میں ہو، اکثر چل جایا کرتی ہے، اور یہ بادشاہ کے منہ لگنے کے بھروسے بادشاہ کے اموال خاص میں بسا اوقات تصرف کر بیٹھتا ہے، اسی طرح خدائے تعالیٰ جو بندوں میں سے حق شناسی میں زیادہ ہوں، ان کی دعاء، بددعا، قبول کرتا ہو، اور وہ بعض اشیاء میں ایسا تصرف کر بیٹھتے ہوں، کہ اوروں سے نہ بن پڑے، جیسے کرشمے اور خرق عادت وغیرہ، یا جیسے بادشاہان دنیا کسی کے جمال صورت کے سبب اس سے محبت کیا کرتے ہیں اور اس کے باعث محکومان بادشاہی مثل بادشاہ کے اس کے اشاروں پر چلا کرتے ہیں، اور سر مواطاعت میں تقصیر نہیں کرتے اور سامان شاہی اور اس کی اشیائے مملوکہ میں وہ تصرفات مالکانہ یعنی مثل بادشاہ مالک کے کیا کرتا ہے اور کسی کو مجال دم زدنی نہیں ہوتی، اسی طرح یہ لوگ بھی جمال سیرت اور کمال عقل اور خوبیٔ احوال اور تہذیب اعمال کے باعث پسندیدۂ خدا ہوگئے ہوں، اور اس وجہ سے محکومان خداوندی اور اسباب

❖ استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

مملوکۂ خدا۔ یعنی یہ موجودات کہ کسی طرح اس کے تصرفات اور ارادوں سے ان کو انحراف نہیں، یہاں تک کہ اگر درختوں کو چلائے، تو چلنے لگیں اور پہاڑوں کو ہلائے، تو ہلنے لگیں۔ ان کے ایسے مطیع ہو گئے ہیں کہ جس طرف کو چلائیں، چلیں اور کسی قسم کے تصرف سے نہ روکیں اور کسی بات میں نہ ٹولیں، پر جیسی حکومت محبوب اور تصرفات اس کے بہ ظاہر ہم سنگ حکومت اور تصرفات شاہی کے معلوم ہوتی ہے، ویسی ہی اس قسم کے تصرفات بھی، یعنی کرشمے بہ ظاہر تصرفات خداوندی معلوم ہوتے ہیں، سو عجب نہیں کہ دیکھنے والوں کو اس دھوکے نے خراب کیا ہو، سو اس صورت میں عقل بے چاری کیا اپنا سر کھائے؟ کیوں کہ عقل تو ایک آلۂ تمیز حق و باطل ہے، بدون اس کے کہ اس سے کوئی کام لے، کام نہیں دیتی، کہیں بھی سنا ہے کہ تیشہ بدون ہاتھ لگائے بڑھئی کے اپنے آپ کام کرنے لگا ہو؟

سو غرض جیسے بسولا کسی لکڑی کے چھیلنے سے انکار نہیں کرتا، پر جیسے چھیلو، ویسے ہی چھیلے گا، اسی طرح آلۂ عقل بھی کسی بات میں تمیز حق و باطل سے انکار نہیں کرتا، پر جس بات میں اس سے تمیز کراؤ گے، اسی کی تمیز کرے گی، اگر دین کے بھلے برے کو پوچھو گے، تو دین کے بھلے برے کو بیان کرے گی، دنیا کی پوچھو گے، دنیا کی سو جو لوگ کسی بھی طرف عقل نہ لگائیں اور لگائیں بھی، تو دنیا کی طرف، انھیں دین کے بھلے برے کی کیا خبر ہوگی؟۔

غرض، کہ اس قسم کے معاملات کے دیکھنے سے دیکھنے والوں کو یوں خیال آیا ہو کہ یہ تصرفات خداوندی ہیں، تو یہ خدا ہوں گے، اور یہ خیال ایسا جما ہو کہ عقل کی طرف کسی نے رجوع ہی نہ کیا ہو، کیوں کہ عقل کی طرف تو رجوع کی ضرورت تردد کے وقت ہوتی ہے، جب پہلے ہی اطمینان ہو جائے، تو عقل کیا ضرورت؟ اکثر غلطی کا باعث بھی کم توجہی اور عقل کی طرف رجوع نہ کرنا ہوتا ہے، اسی لئے عقلاء میں بیش تر باہم اختلاف مذاہب ہوتا ہے کہ کوئی کسی خیال کے باعث کسی بات پر جم گیا اور کوئی کسی خیال کے باعث کسی بات پر اڑ گیا، اور عقل بے چاری کی بات بھی نہ پوچھی۔ اس حکم سے دو باتیں معلوم ہو گئیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ انسان کو جس چیز کی محبت ہوتی ہے، اسی کی اسلوبی اور درستی کا اس کو فکر ہوتا ہے، اسی کے نیک و بد کے تمیز کی اس کو ضرورت ہوتی ہے، اور اسی باب میں عقل کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اس فن میں اس کو اتنا عبور ہو جاتا ہے دوسرے میں نہیں ہوتا اور دوسروں کو بھی نہیں ہوتا، دین کی محبت والوں کو دین میں اور دنیا کی محبت والوں کو دنیا میں۔

۲۔ دوسری یہ کہ عقل کی طرف وہ رجوع کرتا ہے، جو اور خیالات کو خیال میں نہیں لاتا، سو جس شخص میں یہ دونوں باتیں پوری ہوں گی، وہ تو ٹھکانے کی بات کہے گا، ورنہ اندھوں کی طرح کبھی کنوئیں میں، کبھی

کمائی میں ہر دم کرتا رہے گا، سوایسے لوگ دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈھیے، تو نہیں ملتے۔

دوسرے سبب کا بیان یہ ہے کہ زمان سابق کے بعضے مسلمانوں کی نسبت۔ کہ تجربتاً ان کا سچا ہونا اور دنیا باز نہ ہونا ایک جہان کو معلوم تھا اور بایں ہمہ ترک دنیا اور اپنے طور کی عبادت اور ذکر خدا میں اس درجے کو مشغول تھے کہ شہرۂ آفاق ہو گئے تھے۔ یوں مشہور ہے کہ بعض اوقات میں ان سے ایسے کلمات صادر ہوئے کہ جن سے سننے والے یوں سمجھ جائیں کہ ان کو اپنی نسبت خدائی کا گمان ہے، یہاں تک کہ بعضوں کو ان میں سے ان کے ہم مذہبوں نے بہ سبب اس بات کے کہ اہل اسلام ایسی باتوں کو کفر جانتے ہیں، مار ڈالا، اور انھوں نے تادم باز پسیں اپنی بات کو نہ بدلا اور وہی کلمات کہے گئے اور بایں ہمہ وہ عبادتیں بھی جو اہل اسلام خدا کے لئے ادا کرتے ہیں۔ ادا کرتے رہے۔

اب دیکھیے کہ جو ایسا سچا اور متدین ہوا کرتا ہے، اس سے ایسا بڑا طوفان عظیم سمجھ میں نہیں آتا، اور اگر خلاف عادت اس بات کو تجویز بھی کریں، تو پھر عبادت خداوندی کے کیا معنی؟، اور بایں ہمہ ایسی صورتوں میں غرض دینی تو ہوتی ہی نہیں، غرض دنیاوی کا بھی احتمال نہیں، کیوں کہ بادشاہ ہو کر دعوائے خدائی کرے، تو ایک بات بھی ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنے استحکام حکومت کے لئے یہ تدبیر سوچی ہو، اور اس فریب سے لوگوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہا ہو، فقیروں سے تو یہ بھی احتمال نہیں، مع ہذا نقل مشہور ہے: ''جان ہے، تو جہان ہے'' جان کھو کے کون سی بادشاہت کی توقع ہے؟ بجز اس کے کہ یوں کہیے کہ کسی قسم کا جنون تھا، اور سب بے موقع ہے، لیکن جنون بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں، قیس اگر لیلیٰ کی محبت میں مجنون تھا، تو عجب نہیں کہ یہ صاحب، خدا کی محبت میں دیوانہ بنے ہوں، چناں چہ کثرت عبادت اور کثرت ذکر سے خدا کی محبت کا پتہ بھی ملتا ہے، کسی کو کثرت سے وہی یاد کرتا ہے، جو اس کا دیوانۂ محبت ہوتا ہے، لیکن چوں کہ ان کے دلوں میں کثرت یادگاری سے خدا ہی بس گیا تھا اور اسی کی یاد ان کی رگ و پے میں سما گئی تھی، اور جنون کا کلام گو دل ہی کی بات کا پتہ دے، غیر مربوط ہوا کرتی ہے، عجب نہیں کہ اس غلبۂ محبت میں اپنی طرف نسبت خدائی کر بیٹھتے ہوں، اور خدا کی محبت ہونی ہر چند ہم کو، تم کو بعید معلوم ہوتی ہے، مگر بایں لحاظ سے کہ جیسے آفتاب کا پرتو ہر جسم کو، خاص کر آئینے کو منور کر دیتا ہے، اسی طرح موجودات میں خاص کر اچھی چیزوں اور حسینوں میں پرتو خداوندی جلوہ گر ہے، چناں چہ دلائل توحید میں کچھ اس کی طرف اشارہ گذرا۔

سو اگر آفتاب سے اوٹ میں آئینے کو منور دیکھ کر، اس کے نور پر عاشق ہو جائے، یا تعریف کرے، تو حقیقت میں وہ آفتاب ہی کے نور کا عاشق اور مداح ہے، گو وہ اپنی غلط فہمی سے اس نور کو آئینے کا نور سمجھے، اسی طرح حسینوں کے عاشق بھی خدا کے جمال باکمال کے عاشق ہیں، پر اپنی غلط بینی اور کوتہ نظری سے اس

حسن کو ان حسینوں کا حسن سمجھتے ہیں، خدا کے جمال با کمال کا پرتو نہیں جانتے، اور اسی لئے، جیسے آئینے کے نور کے عاشق کو آئینے ہی کی طلب رہتی ہے، آفتاب کا خیال بھی نہیں گذرتا۔ حسینوں کے عاشق بھی حسینوں ہی کے طلب گار رہتے ہیں، خدا کو یاد بھی نہیں کرتے۔

سو اگر یہ غلطی بیچ میں سے نکل جائے، تو یہی خالص خدا کا عشق ہو جائے، اور پھر حسینوں کا نام بھی نہ لیں، خدا ہی کو یاد کرتے کرتے مر جائیں۔(۱)

(۱) آخر کیا وجہ ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کی ایک کثیر تعداد اس غلطی کا شکار ہے، ایک فارسی کی مثل مشہور ہے۔

"تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا" کہ جب تک کوئی ایک بات نہ ہو، لوگ کئی طرح کی باتیں نہیں کہا کرتے، گویا غلطی کی کوئی وجہ تو ہے، میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) یہ کہ عجب نہیں کہ یہ لوگ مہذب اور خدا پرستوں میں سے ہوں اور جیسے دنیا میں ہوشیار و جاں نثار غلام کی سفارش بھی کبھی بادشاہ مان لیا کرتا ہے اور یہ بادشاہ کے سر چڑھے ہونے کی وجہ سے بادشاہ کے اموال خاص میں بسا اوقات تصرف بھی کر لیتا ہے، اسی طرح بندوں میں جو اللہ تعالیٰ کے خاص ہوتے ہوں ان کی دعاء بد دعا قبول کرتا ہو اور وہ بعض اشیاء میں ایسا تصرف کر بیٹھتے ہوں کہ جو دوسرے نہیں کر سکتے جیسے خرق عادت اور کرشمے وغیرہ یا جس طرح شاہان دنیا کسی کی خوبصورتی کی وجہ سے اس سے محبت کیا کرتے ہیں، جس کی بناء پر بادشاہ کے ماتحت اس خوبصورت شخص کے اشاروں پر اسی طرح چلتے ہیں جس طرح بادشاہ کے اشاروں پر چلتے ہیں اور وہ خوبصورت شخص بادشاہ کی مملوکہ اشیاء میں ایسے ہی تصرفات کرتا ہے جیسے بادشاہ کیا کرتا ہے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اسی طرح یہ لوگ بھی جمال سیرت، کمال عقل، خوبی احوال اور تہذیب اعمال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے پسند بندے بن گئے ہوں اور اس کی وجہ سے موجودات میں تصرف کرنے لگیں، عجب نہیں دیکھنے والوں کو اس دھوکہ نے خراب کیا ہو، تو اس صورت میں بیچاری عقل بھی کیا کرے؟

عقل تو ایک آلہ ہے جس سے حق و باطل اور صحیح و غلط کی تمیز ہوتی ہے بشرطیکہ اس کو صحیح طریقہ سے استعمال کریں۔

بہر حال مقربین الٰہی کے اس قسم کے تصرفات کو دیکھ کر ان لوگوں کو یوں خیال آیا ہو کہ یہ تصرفات خداوندی ہیں لہٰذا یہ خدا ہوں گے اور یہ خیال ذہن میں ایسا پختہ ہوا کہ انھوں نے عقل سے کام ہی نہیں لیا کہ انھوں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں؟ اس قسم کی غلطی عموماً کم توجہی اور عقل سے کام نہ لینے کی وجہ سے ہوتی ہے، اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کو صحیح حالت میں رکھنے اور صحیح صورت میں دیکھنے کی فکر کرتا ہے دوسری بات یہ کہ ایسا شخص عقل سے کام لیتا ہے دوسروں کے خیالات کو اہمیت نہیں دیتا، اور جس شخص کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں وہ ہمیشہ سمجھداری کی بات اور عقلمندی کے کام کرے گا۔

دوسری وجہ غلطی کی یہ ہوتی ہے کہ پرانے زمانہ میں کوئی سچا اور تارک دنیا بزرگ، اہل اسلام میں مشہور ہو اس بزرگ کی زبان سے ایسے کلمات صادر ہوئے ہوں کے سننے والے ان کی نسبت یہ سمجھنے لگے کہ ان کو اپنے بارے میں خدائی کا گمان ہے، جیسے منصور حلاج کی زبان سے "انا الحق" کے الفاظ نکلے تھے ایسے خدار سیدہ بزرگ کی زبان سے یہ الفاظ نکلنا واقعی باعث حیرت تھا، اسی لئے ظاہر بین علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، مگر حقیقت یہ ہے کہ منصور حلاج کے دل میں خدا ہی بسا ہوا تھا، اور اسی کی یاد ان کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی تھی، اس غلبہ محبت میں ایسی گول مول اور غیر مربوط بات زبان نکل گئی، جس کو سننے والے یہ سمجھے کہ یہ اپنے آپ کو خدا کہتے ہیں، اگر یہ غلطی بیچ میں سے نکل جائے تو "انا الحق" کا جملہ دعویٰ خدائی کے بجائے "عشق خدائی" کا بن جائے۔

مقالات و مضامین

الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی شخصیت کے

امتیازی پہلو

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ ✿

ایک عبقری شخصیت کے امتیازات کی ترکیز وتحدید ناممکن

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز عبقری شخصیت ہے، جن کے امتیازات کو قلمی تحدیدات میں محدود کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ جسے قدرت فیاض کی جانب سے دعاویٔ منقولہ پر ناقابلِ شکست منقول براہین آفرینی سے منوّرہ عقلِ عظیم عطا فرمائی گئی ہو، کہ جس نے اسلام پر عقلی ہتھیاروں سے مسلح حملہ آروں کو بار بار السناک شکست وپسپائی پر مجبور کر دیا ہو، اور جسے ایمانِ کامل سے پرنوردہ سراپا خشوع وخضوع قلب سلیم بخشا گیا ہو، کہ جس نے طالبانِ راہِ ہدایت کو حسب صلاحیت بہ نگاہِ معنوی "أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ" کے مقامات تک رسائی عطا فرما دی ہو، اور جسے حکمتِ قرآن کی ترجمان، وہ فیاض زبان مرحمت فرمائی گئی ہو، جس نے دین کے بارے میں شکوک وشبہات اور اعتراضات وتلبیسات کی دلدلوں میں پھنسنے والے محروم یقین طبقات کو دولتِ ایمان ویقین سے مالا مال فرما دیا ہو۔

فہرستِ امتیازات بر سبیلِ اجمال

غرض! فہرستِ امتیازات بر سبیلِ اجمال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ: جس کی ذاتِ گرامی علمِ کتاب وسنت میں بے مثال، عالمگیر فکرِ اسلامی میں بے تمثال، ترتیب روحانی میں باکمال، زندگی کے ہر جز وکل میں متبعِ سنت، معلّمیت میں منفرد، طاعت وعبادت میں شب زندہ دار، اصلاحِ باطن میں ماحیٔ ذوقِ معصیت، علم وتقویٰ میں مراقِ حق شناس، تصنیف وتالیف میں اطمینان آفریں نکتہ سنج، انفرادیت میں متین، اور اجتماعیت میں متدین، رہنمائے عظیم جیسے بے شمار بنیادی امتیازاتِ عظیمہ کی حامل ہو، اور ان کا اعتراف

✿ سابق صدر مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

اپنوں ہی نہیں؛ بلکہ مخالفین واعدائے اسلام نے بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہو، اُس سراپا عظمت وامتیاز کی ذاتِ گرامی پر ''سیمینار'' کے صاحبِ فکر ونظر، اربابِ بست وکشاد نے راقم بے بضاعت کو اس کے ''ذکرِ امتیازات'' پر مامور فرمایا ہے؛ اس لیے سوچنا پڑتا ہے کہ اس تیرھویں صدی کے اس مجددِ اعظم کے امتیازات پر قلم حرکت میں آئے، تو کیسے آئے؟ کیوں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی ذاتِ مقدسہ کے علاوہ کسی میں عہد آفریں شخصیت کے تمام نقوشِ حیات وخدمات کو اس طرح سمیٹنا کہ کوئی گوشہ اظہار وانکشاف سے رہ نہ جائے، نہ صرف ناممکن ہی ہے؛ بلکہ امت کے آفتابوں اور ماہتابوں کی تابناک تاریخِ حیات کے نہاخانوں سے اس کی کوئی مثال بھی بظاہر پیش نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے اس نکتۂ فکر کے تحت کسی تاریخ ساز شخصیت کے امتیازات کا تذکرہ مزید غیر معمولی اور مشکل ترین اہمیت کا حامل بن جاتا ہے:

(۱) اتباعِ سنت

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کا وہ اولین اور بنیادی امتیاز کہ جو تمام دیگر مہتم بالشان امتیازات کا مورث ہے، وہ ''اتباعِ سنت'' کا فطری ذوق تھا، کہ جس کو حق تعالیٰ نے چھ سال کی عمر میں ایک ''رویائے صادقہ'' کے ذریعہ اس معصوم بچے کی عظیم الرتبت اور تاریخ ساز شخصیت بننے کی امید کو توقع سے آگے بڑھا کر اہلِ علم وبصیرت بزرگوں کے لیے یقین میں تبدیل کردیا تھا۔

چھ سال کی عمر میں حضرت الامام النانوتویؒ کا دیکھا ہوا ایک خواب

جس کا اجمال یہ ہے کہ: حضرت الامام نے چھ سال کی عمر میں خواب دیکھا کہ ''میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں، اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کی تمام انگلیاں پانی کا چشمہ بنی ہوئی ہیں، اور ان سے صاف وشفاف پانی نکل کر چار دانگ عالم میں پھیل رہا ہے''۔

اس خواب کی تعبیر

حضرت الامامؒ کے خاندانی عالم وبزرگ، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواب سن کر تعبیراً فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ محمد قاسم کے ذریعہ دینی تعلیم کا فیضان عالم گیر پیمانے پر جاری فرمائے گا''۔

اس سچے خواب کی سچی تعبیر حضرت الامامؒ کے تاسیس فرمودہ اس دارالعلوم دیوبند کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے کہ جس کے عالم گیر فیضان پر کسی توضیحی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) جامعیتِ علومِ اکابرِ عظامؒ اور ان کی ترجمانی

اس اساسی امتیاز کے ذکر کے بعد، تعمیلاً للحکم، آغازِ کلام کے لیے یہ عرض کرنا ان شاء اللہ! بے محل نہ ہوگا کہ: تیرہ صدیوں پر مشتمل اسلام کی مسلّمہ عظیم علمی اور دینی شخصیاتِ عظیمہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ان کے بے شمار صاحبِ فضل وکمال منتسبین وتلامذہ میں سے عام طور پر کسی ایک ہی کو قدرتِ فیاض نے ان کے علومِ دقیقہ اور معارفِ عمیقہ کی تشریح وتحقیق کی توفیق سے نوازا ہے۔ جیسے حضرت شمس تبریزؒ عالم رنگ وبو سے پردہ کناں ہوئے، تو ان کے کثیر التعداد تلامذہ میں سے حق تعالیٰ نے حضرت شیخ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے القائی علوم کی ترجمانی کی توفیق سے شرف فرمایا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علوم کے بحرِ زخار سے ہزاروں سیراب ہوئے؛ لیکن ترجمانی کی فضیلت ابن قیم رحمہ اللہ کا مقدر بنی۔ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مقبور ہوے، تو ان کے لاتعداد تلامذہ خدمتِ حدیث کے لیے موفق ہوے؛ لیکن ترجمانیٔ علومِ ابن حجرؒ کا عز وشرف علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے حصے میں آیا۔

صاحبِ فتح القدیر ابن ہمام رحمہ اللہ کے بعد ان کے متنوع علوم کو ترجمانی کے ذریعہ آفاقی شہرت عطا کرنے کا اعزاز قاسم ابن قطلو بغا رحمہ اللہ کو نصیب ہوا۔

محسنِ ملت، مسند ہند، محدث جلیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب وسنت میں بے مثال استنباطی حکمت سے بے شمار فیضیاب ہوے؛ لیکن اس مشکل ترین حکمت آفریں علم کی ترجمانی کا شرفِ کبیر رب العزت نے اُن کے عظیم الرتبت صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ عطا فرمایا۔

اور سرتاجِ مشائخِ کرام حضرت اقدس الحاج حضرت شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی قدس سرہ کو لدنی علوم اور مربیانہ معارف سے حق تعالیٰ نے بہرہ یاب فرمایا تھا۔ ان کی ذاتِ گرامی سے یہ عرفان اور فیضان بے شمار طالبینِ حق کو پہونچا؛ لیکن فہم وفراست کی معقول ترین امتیازی بنیادوں پر امدادِ الٰہی علوم کی آخری گہرائیوں تک رسائی، اور ان سے دُررِ نایاب وعجیب کی دریافت وترجمانی کا اعزازِ عظیم حق تعالیٰ نے حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ العزیز، بانیٔ دار العلوم دیوبند کو عطا فرما کر نہ صرف اس بحرِ زخار کے بڑے بڑے شناوروں کو ہی صفِ مستفیدین میں شامل فرمادیا: بلکہ یہ عرض کرنا قطعاً مبالغہ سے مبرا ہے کہ: سرزمینِ نانوتہ کے اس عظیم الافادہ ''شمس تبریز''، علومِ ربانیہ کے ''حافظ ابن تیمیہ''، آفاقی عظمت ووسعتِ فکر کے ''ابن حجر عسقلانی''، اور ''امدادِ الٰہی علوم لدنیہ'' کے ترجمان کو امت کے لاتعداد عظمائے علم کی رمز شناسی، زعمائے فکر کی دقت شناسی، اور اپنی ذاتی عرفانِ تابی کے شرف وامتیاز نے جس باعظمت مقامِ

اختصاص پر فائز فرمادیا تھا، اس نے ہمہ جہت ایمانی بزرگی اور مسلّم عرفانی برگزیدگی کے ساتھ آپ کی حیرت ناک علمی اور استدلالی ندرت وقدرت کے اعتراف میں انصاف وعرفان ناشناسوں کو چھوڑ کر آج تک ہر دور کے منصف اہلِ علم وایمان، رطب اللسان بنے ہوئے ہیں۔

(۳) علومِ نانوتویؒ کی ترجمانی کا شرف

حضرت الامامؒ کا یہ تیسرا امتیاز بھی قابلِ ذکر تاریخی اہمیت کا حامل ہے، کہ جس طرح قدرتِ فیاض نے انہیں اپنے منفرد علوم عظیمہ کے ساتھ بیشتر مشاہیر اسلاف کرام کے علوم کا حامل بنایا تھا، اسی طرح ان کے بعد ان کے بے نہایت نادر الوجود علوم عمیقہ کی ترجمانی وتوضیح بھی طرزِ مذکور کے مطابق کسی ایک فرد کے نہیں؛ بلکہ راسخین فی العلم کی ایک پوری جماعت کے حصے میں آئی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں صرف ان مخلص ترین عرفائے کاملین کے اسمائے گرامی سپرد قلم کردوں کہ جنہوں نے حضرت الامامؒ کے فیضانِ علم ومعرفت کے بعد کی نسلوں کو مستفید ہونے کی راہ ہموار فرمائی ہے، اور حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم الحروف کو ان کی زیارت اور ان کی مبارک زبانوں سے دیگر اکابر رحمہم اللہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت الامامؒ کے ایمان آفریں کلمات وواقعات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا، جو درج ذیل ہے:

ترجمانانِ علومِ نانوتویؒ کا اجمالی تذکرہ

(۱) محقق جلیل، حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی، قدس سرہ، سابق سرپرست دارالعلوم دیوبند۔

(۲) امین علوم قاسمیہ، جامع المعقول والمنقول، استاذ الاساتذہ، حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، رحمہ اللہ، سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔

(۳) متکلم اسلام، محدث جلیل، دانائے رموزِ قاسمیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، رحمہ اللہ، سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔

(۴) عارف جلیل، نمونۂ اسلاف حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری، رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) غواصِ بحرِ معارف، واقفِ اسرارِ علم قاسمیہ، خطیب اعظم، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، رحمہ اللہ، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(۶) مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، رحمہ اللہ، سابق مفتی دارالعلوم

دیو بند، دبانی دار العلوم کراچی۔

(۷) عالمِ ربانی، فقیہِ عظیم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری، رحمہ اللہ، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور۔

(۸) مربیٔ کامل، مثیلِ شیخ تھانوی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب، رحمہ اللہ، کراچی، پاکستان۔

(۹) مرشد کبیر حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جلال آباد، (مظفر نگر)۔

(۱۰) نمونۂ شیخ تھانوی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب، رحمہ اللہ، الہ آباد۔

(۱۱) مستفیدِ باکمال حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری، رحمہ اللہ، سابق مہتمم مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

(۱۲) عارف کامل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری، بانی وسابق مہتمم مدرسہ خیر المدارس، ملتان (پاکستان)۔

(۱۳) مہیب باکی حضرت مولانا فقیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، پشاور، (پاکستان)۔

(۱۴) عارف عرفانِ شیخ تھانویؒ، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، رحمہ اللہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۱۵) خطاطِ کبیر حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب، رحمہ اللہ، سابق صدر شعبۂ کتابت دار العلوم، دیوبند

(۴) اے دشمنِ جاں! تجھ سے تو تیرا خیال اچھا ہے

حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علمِ وقیع اور عالم گیر اسلامی فکر وسیع کے امتیاز کا جس طرح اعتراف وقت کے بلند پایہ علمائے اسلام نے فرمایا، ٹھیک اسی طرح دیگر مذاہب کے اختصاص علمی میں ممتاز شمار کیے جانے والے غیر مسلم اہلِ علم کو بھی آپ کی قوتِ استدلال اور ہر دعوٰی کو ثابت کرنے والے ناقابلِ شکست دلائل وبراہین قائم کرنے کی بے مثال صلاحیت پر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس ذیل میں حضرت الامامؒ کی جانب سے معاندینِ اسلام کے حملوں کے ان دندان شکن جوابات کو بلاخوف وتردد پیش کیا جاسکتا ہے، کہ جنہوں نے اعدائے اسلام کی زبانوں کو نہ صرف گنگ کردیا تھا؛ بلکہ عقلِ انسانی کو براہِ راست اپیل کرنے والے اُن جوابات کو سن کر بدترین دشمنانِ اسلام نے اپنی لاجوابی کا اعتراف اس انداز میں کیا کہ:

”اگر کسی کی تقریر پر ایمان لایا جاسکتا، تو مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر پر ہم ایمان ضرور لے آتے“۔

جس کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ: حق کے ناقابلِ تردید مدلل ثبوت کے بعد ان کے دین حق کو قبول نہ کرنے کی توجیہہ بجز دنیوی اعزاز و منافع سے محرومی کے خطرے کے سوا کچھ نہیں کی جا سکتی۔

(۵) فروغِ تعلیم، یا اتباعِ کتاب وسنت کے انمٹ نقوش

حضرت الامامؒ کی یہ عظیم سیاسی رہنمائی، تاریخی اہمیت کے حامل ہونے کے باوجود عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے کہ فرنگی حکومتِ غاصبہ سے نبرد آزمائی میں ناکامی اور اس کے پرفریب امنِ عام کے اعلان کے بعد حضرت الامامؒ نے بھی بلا تاخیر اپنی فراستِ ایمانی سے شمشیر وسنان کے بجائے جنگ کا رخ ملت میں علمی اور ایمانی استقامت اور جذبۂ حریتِ وطن کی برقراری کے لیے نہ صرف تعلیم دین ہی کی جانب موڑ دیا؛ بلکہ وہ دور چوں کہ ملت اسلامیہ پر اقتدار سے محرومی کے بعد غالب وظالم انگریزوں کے بے تحاشا مظالم سے پیدا شدہ شکست خوردگی اور عجز ومایوسی کا دور تھا، جس میں ملی زندگی کا دائرۂ فکر وعمل پست فکری سے دوچار ہو چکا تھا؛ اس لیے ایسے شدید اور نازک وقت میں عام سیاسی قائدین کا محورِ فکر ملت کو اس فکری پستی وناامیدی کی ذلت ناکیوں سے نکالنے کے سوا دوسرا نہیں ہوتا، جو بادیٔ النظر میں وقیع اور صحیح بھی معلوم ہوتا ہے اور ضروری بھی۔

لیکن حضرت الامامؒ نے اپنی فراستِ ایمانی آمیز سیاستِ اسلامی سے اس کو ملت کے مرض کی صحیح تشخیص نہ قرار دے کر اپنا محورِ فکر، ملت کی ان فطری صلاحیتوں کو بنایا، کہ جو عہد مغلوبیت میں مستور تو ہو سکتی ہیں؛ لیکن معدوم نہیں ہوتیں، اور قیادتِ سلیمہ پر بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ صلاحیتیں بروئے عمل آنے کے بعد شکست خوردگی کے بجائے "ہمت آفریں شعور"، ذلت ومغلوبیت کے بجائے "مددِ خداوندی پر یقین"، شدید وقبیح حوادث سے ہمت شکنی کے بجائے "حوصلہ مندانہ عزم"، رفعت پسندانہ اقدامات کے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے بجائے "کامیابی کا یقین"، اور بااقتدار معاند قوتوں کے سامنے خود سپردگی کے بجائے "غیرت مندانہ موقف استقامت" قومی زندگی کے دھارے میں انقلاب برپا کرنے والا ایسا موثر ذریعہ بنتے ہیں کہ جس کا ادنیٰ تصور بھی مغلوب ومفتوح ملت کو محض پست فکری اور یاس وناامیدی سے نکالنے کے طرز قیادت سے متصور نہیں ہو سکتا۔

بہ نظر غائر اگر جائزہ لیا جائے، تو فطری قیادت کے یہ اصول خود ساختہ نہیں؛ بلکہ کتاب اللہ سے ماخوذ ومستفاد ہیں، جن کو فرائضِ نبوت میں گنواتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ، يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ"(۱)

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۶۴

(الف) ''تلاوتِ آیات'' کے ذریعہ مخاطب ملت کو مقصدِ قیادت پر مطلع کرنے کی راہنمائی کے ساتھ اس پر مکمل اعتماد۔

(ب) ''تزکیہ'' کے وسیع تر مفہوم سے شکست خوردگی، اور اس کے لوازم سے قلب ودماغ کو فراغ بخشنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

(ج) ''تعلیم کتاب'' سے قائدانہ احکام کی صحت وافادیت پر ایسا یقین محکم پیدا کرنا کہ اس کے بر خلاف کوئی بھی اور کسی کا بھی حکم مخاطبین کے لیے ادنیٰ درجے میں لائقِ التفات نہ رہے۔

(د) ''حکمت'' سے مقصدِ حیات کی یاددہانی کے ساتھ دنیوی زندگی کے علمی، عملی منافع عامہ کو حاصل کرنے کے لیے "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ" کے تحت کامیابی کے تمام ضروری وسائل کو استعمال کرنے پر یہ کثیر الجہات کلمۂ حکمت مشیر ہے۔

پس حضرت الامامؒ نے ان ہی قرآنی نقاطِ طیبہ پر اپنی قیادت کی بنا قائم فرما کر اپنے دورِ اتباعِ کتاب وسنت پر انمٹ نقوش قائم فرمادی۔

(۶) تحریک بنائے مدارس

حضرت الامامؒ کی یہ قیادتِ اسلامیہ جس کی صحت پر وقت کی نزاکت من جانب اللہ مہر تصدیق ثبت کرچکی تھی، اس کی عملی تشکیل میں بے سروسامانی کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انگریزوں نے برصغیر کی حکومت چوں کہ مسلمانوں سے چھینی تھی؛ اس لیے اپنے غاصبانہ اقتدار کی تاراجی کے بارے میں انگریز اگر خائف تھا، تو صرف مسلمانوں ہی سے تھا، اسی خطرہ وخوف کے تحت اس نے ۱۸۵۷ء میں مکمل تسلط کے بعد مسلمانوں کے برخلاف قتل وغارت گری، لوٹ مار، اور جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کو اپنے ظالمانہ اقتدار کی برقراری کا واحد ذریعہ قرار دے کر ان کو دانہ دانہ کا محتاج بنادیا؛ لیکن دین وایمان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے، اور حریت طلبی کو قومی، ملکی اور سیاسی ضرورت سے آگے بڑھ کر مذہبی اور دینی فریضہ باور کرنے والے، قائلینِ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کو بے تحاشا ظلم وستم کی گرم بازاری، آزادئ وطن کے لیے جراٴت مندانہ اقدامات سے روکنے میں حکومتِ وقت کو ذلت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ جس کا انگریز نے ایک دانا دشمن کی حیثیت سے گہرا جائزہ لے کر اس حقیقت کو پالیا کہ مسلمانوں کے آزادئ وطن کے جذبۂ صادق کو ناقابلِ شکست قوت وطاقت دینے والے صرف یہ مدارس ہیں، جن کا باقابلِ شمار تعداد میں ملک بھر میں جال پھیلا ہوا ہے۔

شاطر انگریز کی عیارانہ پالیسی

مسلمانوں میں ان دینی تعلیمی سرچشموں سے اسلامی غیرت وحمیت اور جذبۂ حریت طلبی کی آبیاری کے راز کو پالینے کے بعد شاطر دشمن انگریز نے قتل وغارت گری کی پالیسی کو ناکام دیکھ کر اپنی عیارانہ سیاست کے امنِ عام کا اعلان کر دیا؛ لیکن اس سے زیادہ مسلم کش؛ بلکہ اسلام کش دوسری نئی پالیسی کے تحت مدارسِ اسلامیہ کو محورِ انتقام بنایا، اور ملک بھر کے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر لیا کہ جو اس دور میں مدارسِ دینیہ کی بقا کا واحد ذریعہ تھے، اور دوسری جانب مسلمان اپنی اقتصادی بدحالی کے باعث ان دینی مراکز کو سنبھالنے کے قابل رہے نہیں تھے؛ اس لیے اس خطرناک صورتِ حال کے نتیجے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ لاتعداد مدارسِ دینیہ میں تالے پڑ گئے۔

ہندوستان کے تین بڑے مکاتبِ فکر اور ان کی تاراجی

پھر یہ ہی نہیں؛ بلکہ اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک کے درج ذیل تین اسلامی مکاتبِ فکر کہ جو پورے ملک کے مدارسِ دینیہ کے دینی اور علمی محتسب کا وقیع کردار ادا کر رہے تھے، وہ بھی وقت کی اس قہرمانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ کر ختم ہو گئے۔

(۱) مکتبِ فکرِ ولی اللّٰہی (مرکزِ علمِ حدیث)

ان میں اولین ''مکتبِ فکرِ ولی اللّٰہی'' دہلی میں تھا، جس نے دین کے مصدرِ ثانی ''علمِ حدیث'' کو شرحِ کتاب اللہ کی حیثیت سے پیش کرنے کا اس دور میں اہم فریضہ اس وقت ادا کیا، کہ جب حتمی اور قطعی اور یقینی مراداتِ ربانی کو واضح کرنے والی حدیث رسول اللہ سے کتاب اللہ کو علمائے سوء نے یکسر منقطع کر کے اور کتاب اللہ کو اپنی زرطلبی اور جاہ طلبی کی حقیر وذلیل اغراض فاسدہ کے لیے ایسا قوی وسیلہ بنا رکھا تھا کہ اس کے برخلاف آواز اٹھانا دعوتِ مبارزت کے مترادف بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ ہی مکتبِ فکرِ ولی اللّٰہی تھا کہ جس نے ایسے شدید ترین صبر آزما احوال وحوادث سے دوچار ہونے کے باوجود حدیث رسول اللہ کو معتبر شرحِ قرآن کی حیثیت سے پیش کیا، اور صحیح مراداتِ ربانی کی مدلل توضیحات سے ملت کو آشنا بنانے کا زبردست فریضہ انجام دیا، جس کے نتیجے میں علمِ دین کے معتبر ومستند ہونے کے لیے ''فنِ حدیث'' کی لازمی ضرورت سے واقفیت عام ہوئی، اور مکتبِ فکرِ ولی اللّٰہی سے اس مصدرِ ثانی، یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضِ عظیم حاصل کرنا فضلائے مدارس کا ذوق عام بن گیا۔

(۲) مرکزِ علم فقہ واصول فقہ

دوسری جانب لکھنؤ ''فقہ اور اصول فقہ'' کا ملک گیر مکتب فکر تھا؛ اس لیے فقہی ذوق رکھنے والے فضلاء لکھنؤ سے مستفید ہوتے تھے۔

(۳) مرکزِ علم منطق وفلسفہ

اور تیسرا منطق وفلسفہ کا معقول مکتب فکر ''خیر آباد'' تھا؛ اس لیے معقولات سے مناسبت رکھنے والے خیر آباد کا رخ کرتے تھے۔

ان تینوں مکاتب فکر کے ختم ہوجانے کے بعد اس نازک اور خوفناک صورت حال نے دردمندانِ دینِ متین کو عمومی طور پر بے چین بنا رکھ دیا تھا؛ لیکن حضرت الامام النانوتویؒ قلب وذہن مبارک پیش آمدہ صورت حال کی وحشت ناکی کے احساس کے ساتھ اس کی امکانی تلافی پر مرکوز تھا، جو ایک نئے مرکزِ علم ودین کی تاسیس کے بغیر ممکن نہیں تھی؛ لیکن جس وقت دشمن اسلام ومسلمین انگریز حکومت کی پوری معاندانہ سیاسی توتیں مستقل پالیسی کے تحت مدارس اسلامیہ کو تاراج کرنے پر لگی ہوئی ہوں، ایسے وقت میں کسی نئے مرکزِ علم ودین کی تاسیس کا تصور جس درجہ خطرناک ہوسکتا تھا، وہ کسی وضاحت کا طالب نہیں۔

حضرت الامام النانوتویؒ اور تشخیص مرض بہ شکلِ تاسیس دارالعلوم

لیکن حضرت الامامؒ کا یہ عزم الہام خداوندی سے مؤید تھا؛ اس لیے آپ اپنے اس عزم صمیم کو اپنی فراست ایمانی سے اس طرح معرض وجود میں لائے کہ ''دیوبند'' جیسی چھوٹی سی بستی میں ایک چھوٹی سی مسجد جو ''مسجد چھتہ'' کے نام سے معروف ہے، اس میں ایک انار کے درخت کے نیچے صرف ایک استاذ محمود اور ایک شاگرد محمود کے ذریعہ اس عالم گیر مرکزِ علم ودین کی تاسیس فرمائی۔

حضرت الامامؒ کا یہ تاسیسی عمل ایک طرف آپ کی سیاستِ اسلامی اور فراستِ ایمانی کا بایں معنی مظہر اتم تھا کہ اس مدرسہ کو ظاہری طور پر ایک معمولی مکتب کی متواضعانہ صورت دے کر دشمنِ مدارس حکومت وقت کی نظر میں ناقابل التفات بنائے رکھا، اور دوسری جانب من جانب اللہ بلاتشبیہ برِ صغیر کے بیشتر علمی اور دینی حلقوں نے حضرت الامامؒ کی کتاب وسنت پر مبنی عالم گیر علمی عظمت، فکری وسعت اور کلامی ندرت کی معروف صفات کی بدولت اس دارالعلوم کو ضبطیٔ اوقاف سے پیدا شدہ نقصانِ عظیم کی تلافی کا ذریعہ تسلیم کیا۔ چناں چہ پہلے ہی سال میں اس مرکزِ علم ودین میں ملک کے دور دراز مقامات سے علماء وطلبہ کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

بہر حضرت الامامؒ کے بے شمار امتیازات میں یہ امتیاز سب سے فائق تر قرار دیے جانے کے مستحق ہے کہ آپ نے اپنے قائم فرمودہ بلند معیار "حدیثی مکتبِ فکر دار العلوم دیوبند" میں ملک کے اہم ترین منتشر و متدرس مکاتب کو سرزمین دیوبند پر جمع فرما کر حسبِ تقاضائے وقت ایک جامع ترین علمی اور دینی مجموعہ مکاتبِ فکرِ ملتِ اسلامیہ کو عطا فرمادیا، اور اس طرح آپ نے نہ صرف عظیم نقصان کی عظیم ترین تلافی ہی فرمادی؛ بلکہ ہندوستان میں اسلام کا نام تک ختم کردینے کے انگریزی ناپاک عزائم کو بھی ہمیشہ کے لیے خاک میں ملادیا۔

دار العلوم دیوبند کی یہی وہ علمی فکری اور قاسمی جامعیت ہے کہ جو طرۂ امتیاز کی حیثیت سے دار العلوم کو چار دانگ عالم میں بلا استثناء تمام صحیح العقیدہ دینی مدارس و معاہد کی مرکزیت کا حامل بناتی ہے۔

(۷) دار العلوم دیوبند علم و عشق کا گہوارہ اور عالم گیر مرکز

اس عالم گیر مرکز علم و دین کا کتاب و سنت سے ماخوذ درج ذیل تاسیسی فکر بھی حضرت الامامؒ کے عظیم امتیازات میں ایک ایسا بیش قرار اضافہ ہے کہ جو مقبولیت عند اللہ کی بدولت نہ صرف ایشیا؛ بلکہ پوری دنیا میں تاسیسِ مدارس کے لیے آج اسوۂ عمل بن چکا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حسبِ روایت حدیث: حق تعالیٰ نے پشتِ آدم علیہ السلام سے کل اولادِ آدم کو نکالا اور تمام حجابات اٹھا کر اپنی ذات سراپا جمال و کمال کی جلوہ نمائی کے ساتھ "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کا سوال فرمانا، اور اس پر سراپا عمل حکمت کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے بھوکے قلب کو اپنے جمال کے ذریعہ "سوزِ عشق" کیف علم کے تحفۂ غذا عنایت فرما کر آسودہ فرمادیا، اور سوال کے ذریعہ بھوکے دماغ کو "کیف علم" کے تحفۂ غذا سے سیری مرحمت فرمائی۔

یہ دو ازلی خدائی تحفے اس طرف مشیر ہیں کہ انسانیت ارتقائے مطلوب کی منزلِ مراد تک صرف اسی نظام کے ذریعہ باریاب ہوسکتی ہے کہ جو بے کراں وسعتیں رکھنے والے انسانی دماغ کو علوم بے نہایت عطا کرے، اور عروج الی اللہ کے داتائے راز قلب انسانی کو سوزِ عشق سے راہِ عروج کی رہنمائی بخش سکتا ہو۔

اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ انسانی نظامِ حیات میں علم و عشق کی یہ بہم آمیزی عقل انسانی نہیں، صرف خالقِ انسان کی قدرت بے نہایت ہی کرسکتی ہے، اور بواسطۂ انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت کی جانب سے دین اسلام جیسے علم و عشق سے مرکب نظام کامل و مکمل پر انسان کو عمل کا مخاطب بنایا جانا، اس اعلان کو کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں بننے دیتا کہ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرنے کے باوجود یہ دین فطرت انسان کو مقفّن تسلیم نہیں کرتا۔

علم بے عشق اور عشق بے علم ''شرک و بدعت'' کے وجود کا مرکز

نیز اسی سے یہ ناقابل انکار انکشاف بھی برملا سامنے آجاتا ہے کہ نہ تنہا ''علم'' مسائل انسانیت کا حل ہے، اور نہ تنہا ''عشق''؛ کیوں کہ یہ امر مشاہد اہل علم کے لیے مسلم حقیقت ہے کہ شرک و کبر نے جب بھی جنم لیا، تو وہ ''علم بے عشق'' ہی کے بطن سے جنم لیا ہے، اور بدعت جب بھی معرضِ وجود میں آئی ہے، تو ہمیشہ اس کا ذریعہ تخلیق ''عشق بے علم'' ہی بنا ہے۔

لہٰذا علم و عشق کی باہم آمیزی کے معنی یہ ہیں کہ: ''عشق'' علم کو تواضع آمیز کر کے صحت و پرتاثیری عطا کرتا ہے، اور ''علم'' اتباعِ سنت کی رہنمائی کے ذریعہ عشق کو وسیلۂ قرب و معرفت بناتا ہے۔ اور ماضی کی طرح آج بھی ملت اسلامیہ میں علم بے عشق جو فتنے جگا رہا ہے، اور ایسے عشق بے علم کی کوکھ سے جن نوایجادات بدعات کی روز بروز تولید ہورہی ہیں، وہ اظہر من الشمس ہے۔

بانیٔ دارالعلوم اور اساتذہ وطلبہ کے لیے دو جامع اصول

پس بانیٔ دارالعلوم حضرت الامام النانوتویؒ نے اپنے رفیع القدر اتباعِ سنت پر مبنی ذوق کے تحت اس مرکز کے نظام میں علم و عشق کو اس طرح باہم آمیز فرمایا کہ درس گاہوں میں طلبہ کو دورانِ درس اساتذہ سے علمی تحقیق پر مبنی ہر قسم کے سوالات کی اصولاً آزادی عطا فرما کر اور اساتذۂ کرام کو اطمینان بخش جواب دہی کا مکلف بنا کر طلبہ کے دماغوں کو زیادہ سے زیادہ غذائے علم سے آسودگی کا موقع مہیا فرمایا۔ اور طلبہ پر درس گاہ سے باہر ''ماحولِ مدرسہ'' میں احترام کامل کے ساتھ اساتذہ کی بلاچوں چرا ایسی اطاعت وفرمانبرداری پر مامور فرمایا، جیسی خانقاہوں میں مرید اپنے شیخ کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اس ذریعہ سے سوزِ عشق سے حصہ پانے کی طرح ڈال کر حضرت الامامؒ نے خانقاہی مقصد سے بھی طلبہ کو مانوس کرنے کی معقول وموثر تدبیر فرمادی۔

بالفاظِ دیگر علم و عشق کی باہم آمیزی کی ضرورت وعظمت پر مشتمل معروف دانائی آمیز مقولے ''ہر طالب علمے کہ چوں و چرا نہ کند، و ہر طالبے کہ چوں و چرا کند؛ ہر دو را در چراگاہ باید رسانید'' کو حضرت الامامؒ نے اصولی حیثیت دے کر شاملِ نظامِ تعلیم فرمادیا۔

پھر علم وعشق چوں کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ظہور و بروز کے طالب ہیں۔ پس مذکورہ پرداز تعلیم وتربیت پر تاریخ شاہد ہے کہ اس مرکزِ علم و دین کے وابستگان کے ذوقِ علم کو عشق آمیز تواضع نے شرک و کبر سے نہ صرف دور؛ بلکہ نفور بنادیا ہے، اور داعیۂ عشق کو علم کی رہنمائی کتاب وسنت نے تمام نوایجاد بدعتوں

سے پورے طور پر تحفۃً عطا کردیا ہے۔ اور آج الحمد للہ! ملک و بیرونِ ملک میں لاتعداد مدارس اسلامیہ حضرت نانوتویؒ کے جاری فرمودہ اسی علم و عشق آمیز نظام پر نہایت کامیابی کے ساتھ مصروفِ خدمت ہیں۔

(۸) فکرِ قاسمی کا نقطۂ امتیاز

اس جامع ترین اسلامی فکرِ قاسمی کا وہ بنیادی نقطۂ امتیاز جس کو ہر دور میں وارثینِ فکرِ قاسمی کے اکابر و اصاغر نے بقوت سنبھالا ہے، وہ ملتِ اسلامیہ میں ناصواب مکاتبِ فکر کی تولید پر چراغ پا نہ ہوکر ان کی اصلاح کی جد و جہد کرنا ہے۔

جس کی قرینِ عقل وجہ اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ جس امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کو ظاہر و باطن میں سراپا علم و حکمت کتاب قرآنِ عظیم کی صورت میں مرحمت فرمائی گئی۔ اور "أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ" کے ذریعہ عالم گیر اعلان ختم نبوت، اور "أُوْتِيْتُ عِلْمَ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ" کے عالم گیر اعلان اور علم عظیم و کثیر کا منفرد دعویٰ لے کر آنے والی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پیکرِ علم و عرفان ذات مقدسہ عطا فرمائی گئی ہو، اس بے حساب کثرتِ علم کے بعد یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں رہتی، کہ مکاتبِ فکر کی کثرت وہیں ہوسکتی ہے، جہاں علم کی کثرت ہو، پس بلا امتیاز حق و باطل اور بلا فرق خطا و صواب مکاتبِ فکر کی بکثرت تولید صرف اسی امت میں ہو بھی سکتی تھی، اور اسی امت میں ہوئی بھی ہے، دیگر تمام مدعیانِ علم امم و اقوام میں چوں کہ یہ کثرتِ علم نہیں ہے: اس لیے نتیجتاً کثرتِ مکاتبِ فکر بھی نہیں ہے۔

یہودیت و عیسائیت میں تقلیلِ مکاتبِ فکر کی وجہ قلتِ علم

چناں چہ دعویٰ علم کے باوجود یہودیت میں اسلام سے بہت قدیم ہونے کے باوجود کوئی بھی دینی اور مذہبی مکتبِ فکر معروف و معلوم نہیں ہے۔ ایسے ہی دنیائے عیسائیت "پروٹیسٹنٹ" اور "کیتھولک" کے ناموں سے موسوم صرف دو بنیادی مکاتبِ فکر پر منقسم ہے، جو بذاتِ خود اس کی دلیل ہے کہ یہودیت و عیسائیت میں مذہبی اساس پر تقلیلِ مکاتبِ فکر کی وجہ قلتِ علم کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

(۹) امتِ مسلمہ میں کثرتِ مکاتبِ فکر، ان کا عدمِ توازن اور فکرِ قاسمی کا اعتدال

اس کے برخلاف کتابِ اسلام "قرآن کریم" اور "نبی اسلام" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سرچشمۂ علوم بے نہایت ہیں: اس لیے عہدِ نبوت ہی سے علمی بنیادوں پر خطا و صواب کے جزوی اختلافات پر مبنی مکاتبِ فکر کی تولید کا آغاز ہوگیا تھا۔ پھر علمی ارتقا کے ساتھ کتاب و سنت میں مکنون و مستور بے نہایت علوم و معارف کی تخریج نے مخالفینِ اسلام کی رگِ حمیت و جاہلیت کو جھنجھوڑا، اور ان باطل

پسندوں نے کتاب اللہ کی سنت رسول اللہ سے مؤید متبادر مرادات و مدلولات میں تاویلات باطلہ کر کے اپنے زیغ قلبی کے تحت تعلیمات اسلام سے یکسر منحرف باطل مکاتب فکر کی ابھار دیا، لیکن مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھا کہ اس کی پیشین گوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت پہلے اس طرح فرما چکے تھے کہ:

''یہود ونصاریٰ تو بہتر فرقوں میں بٹے تھے، اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی، جن میں میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر چلنے والے طبقہ کے سوا باقی سب جہنمی ہوں گے''۔

بہتر کا عدد مطلقاً کثرت کی جانب مشیر ہوتا ہے۔ پس یہ روایت اس حقیقت کو واشگاف کرنے لیے کافی ہے کہ اس امت میں ایک حق کے بالمقابل باطل مکاتب فکر بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہیں گے؛ کیوں کہ یہ سب باطل فرقے قطعی طور پر ثابت شدہ حقائق کے منکر ہونے میں شریک ہوں گے؛ البتہ ان کی تاویلات باطلہ کے پرداز میں فرق ہوگا؛ اس لیے ان سب کے مقابلے میں بلا تامل اول مرحلہ میں ایک حق صریح کے ومدلل پیش کر دینے کے بعد دفاع عن الاسلام کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

لیکن دوسری جانب صواب کے بالمقابل وہ خاطی مکاتب فکر ہوں گے، کہ جو اسلام کے امور کلیہ کے اقرار میں تو شریک ہوں گے؛ لیکن امور جزئیہ میں تاویلات غیر صحیحہ کی وجہ سے افہام وتفہیم کے مستحق ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خاطی مکاتب فکر، باطل مکاتب فکر کے مقابلہ پر بدر جہا تعداد میں ہمیشہ زیادہ ہوں گے، اور طالب حق کی مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے "اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِي وَيُصِيبُ" کے تحت ماجور ہوں گے۔

لیکن اس کے برخلاف کتاب وسنت کے علم صحیح سے مستفید وترجمان علمائے کرام کا یہ ایک دائمی اہم فریضہ ہوگا کہ وہ ہر زمانہ میں باطل مکاتب فکر کے بالمقابل متصلب ہوں، اور خاطی مکاتب فکر کو برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل اور وسیع الحوصلہ ہوں؛ کیوں کہ یہ مکاتب فکر ضروریات دین سے منحرف نہیں ہیں؛ لیکن ان کی جزئیات، غلط تاویلات قابل تصحیح واصلاح ہونے کے باوجود ان کے دین پر قائم رہنے کے جذبہ کی یقین دہانی کے لیے کافی ہیں۔

اس لیے خاطی مکاتب فکر کے بارے میں اس تحمل پسندی اور وسعت حوصلہ کو دار العلوم دیوبند کا اجتماعی دینی مزاج بنا دیا۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا افراط وتفریط کے مابین اسلامی اعتدال کا وہ بیش قرار نمونہ ہے کہ جس کو حضرت الامام کا ممتاز ترین امتیاز قرار دینا عین انصاف ہوگا۔

اسی معتدل مزاجی کا خوش آئند نتیجہ ہے کہ بعض طبقات نے علمائے دیوبند کو اپنی قلت علم اور حق

ناشی کی بنا پر ہدف تکفیر بنایا؛ لیکن اسی اعتدالی جماعتی مزاج سازی کے تحت اکابر وعلمائے دیوبند مکفرین کی ضروریات دین کے مقر ہونے کی بنا پر ان کے اس سراسر غیر اسلامی ایذا رساں حملے کو برداشت کر کے انہیں درس خیر خواہی سے نوازتے رہے، اور صحیح تعلیمات اسلام کے تحت ان کی تکفیر سے ہمیشہ ممکن احتراز فرماتے رہے۔

(۱۰) اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ذوقِ جہاد

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے امتیازات میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کا امتیاز بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ذوقِ عظیم وسلیم سے بھی حق تعالیٰ نے آپ کو وہ حصۂ وافر عطا فرمایا تھا کہ جو اس دور میں بھی عوام میں تو آج کل کی طرح مضمحل ہو ہی چکا تھا، خواص میں بھی صرف اخص الخواص ہی ذوقِ جہاد سے آشنا تھے۔

اسلام میں جہاد کی غیر معمولی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے ہونے والے جہاد پر اجر وثواب کا وعدہ فرما کر اس کو مہتم بالشان عباداتی حیثیت واہمیت عطا فرمائی ہے۔

کسی مذہب کی دعوت، یا کسی مخصوص نظریۂ حیات کی پیشکش کی صورت میں مخاطب کو اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے مکمل اختیار کرنے کا دیا جانا ایک ایسا مسلّم اور ناقابل اختلاف متین ضابطہ ہے، کہ تمام معقولیت پسند انسانی طبقات میں کبھی یہ ضابطہ دورائیوں میں دوچار نہیں ہوا۔ اس ضابطۂ مسلّمہ کو جذباتیت یا غیظ وغضب، یا جہالت کے تحت نہ کرنا، وہیں سر ابھارتا ہے کہ جہاں مدعی کا فکر وذہن اپنے دعاوی پر، یا دلائل قویہ سے خالی ہو، یا طریق اثبات کی قوی اور مسکت صلاحیت سے عاری ہو۔

حضرت الامام النانوتویؒ کے فکر وذہن کو حق تعالیٰ نے کمال علم وحلم کے ساتھ اپنے دعاوی پر مسکت دلائل قویہ قائم کرنے کی ایسی منفرد صلاحیت عظیم سے نوازا تھا، کہ احباب واغیار ہی نہیں؛ بلکہ اعداء بھی ان کی استدلالی قوت پر بصد اعتراف سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' حضرت الامام النانوتویؒ کی امتیازی قوت استدلال پر ایسی ناقابل انکار شہادت ہے، کہ جس سے مؤرخ صرفِ نظر کر کے اپنے اوپر تنگ نظری اور حقائق ناشناسی کا الزام لینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔

(۱۱) اصابتِ رائے، عالمانہ وعارفانہ ذہانت اور توکل علی اللہ

میدانِ شاملی میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کی تیاری کے دوران جماعت میں ایک افتراق

انگیز اختلاف پیدا ہوا، جس کے سد باب میں حضرت الامامؒ کی عالمانہ وعارفانہ ذہانت کی یہ امتیازی کار فرمائی بھی تاریخ کا ایک اہم باب بنی کہ انگریزوں کے برخلاف جنگ کے منصوبے پر علمائے وقت کے بھرپور اتفاق کے باوجود جماعت کے ایک مسلّم بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنی رائے کی وجہ سے ہمنوا نہیں تھے کہ مسلمان جنگ کی قرار واقعی تیاری سے بے سروسامان ہیں، کہ بے سروسامانی میں جنگ ہلاکت وتباہی کے سوا کسی دوسرے نتیجے تک نہیں پہونچ سکتی۔ حضرت موصوف کی اس رائے کی وجہ سے ان کے وابستگان کی معتدبہ تعداد کے عدم اتفاق کا خطرہ یقینی تھا۔ اس کے پیش نظر مؤثر وممتاز علماء متفرقاً اور مجتمعاً معتدبہ تعداد میں حاضر ہوکر عرض ومعروض کرتے رہے، لیکن ان کی رائے نہ بدلوا سکے۔

اور وقت کے تمام بزرگ بہ خطرۂ اختلاف حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی تائید کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے متؤش تھے، جب کوشش کے باوجود ان کی ہمنوائی سے مایوسی ہوگئی، تو جماعت کے حضرات کی آخری کوشش کے طور پر ''حضرت الامامؒ'' نے بہ موجودگی حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ وغیرہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ سے ملاقات فرمائی، اور آغازِ گفتگو اسی پرداز سے فرمایا، جس پر اب تک بیشتر علمائے کرام فرما چکے تھے، اور ان کا جواب بھی وہی تھا، کہ جو دوسروں کو دے چکے تھے۔ اس پر حضرت الامامؒ نے سوال فرمایا کہ:

''حضرت! کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں''؟

یہ سن کر سب سے پہلے حاجی امداداللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ: ''بس! اب الحمدللہ! شرحِ صدر ہوگیا''۔

اسی پر اختلاف ختم ہوگیا، اور جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ پس جس خطرۂ اختلاف کو بزرگانِ جماعت محسوس کرکے غیر معمولی خدشہ محسوس فرما رہے تھے، وہ حق تعالیٰ نے حضرت الامامؒ کے صرف ایک توکل علی اللہ پر مبنی سراپا دانش سوال کے ذریعہ ختم فرماکر جماعت کو اختلاف سے محفوظ فرمادیا۔

(۱۲) سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

حضرت الامامؒ کی علمی وسعت پر درج ذیل ایک مزاحی جملہ کا عرفانی تجزیہ بھی شاہد ہے کہ ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی کے چیلنج پر تاریخ مناظرہ طے کرنے کے لیے حضرت الامام النانوتویؒ کی جانب سے دو تلامیذ خصوصی: مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہیؒ، اور ایک شیخ نہال احمد صاحبؒ اس وقت رُوڑکی پہونچے کہ جب پنڈت جی کے لیے کھانے کا انتظام کیا جارہا تھا، ملاقات کے کمرہ کے باہر ان حضرات کی موجودگی میں پنڈت جی لیے کھانا اتنی بڑی مقدار میں تھا کہ جو بہت

سے لوگوں کے لیے کافی ہوتا؛ لیکن گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ تنہا ہی پنڈت جی کھانا کھایا ہے۔ واپسی میں شیخ نہال احمد صاحبؒ نے اپنے رفقاء سے مزاحاً کہا کہ: علم میں مناظرہ ہوگا، تو پنڈت جی ایک منٹ بھی ہمارے حضرت کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے؛ لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ ہوگیا، تو کیا ہوگا! کیوں کہ حضرت الامامؒ اتنے کم خوراک تھے کہ اکثر اوقات تو نصف روٹی پر ہی بس فرمادیتے تھے۔

دیوبند واپس آنے کے بعد شیخ نہال صاحبؒ کا یہ مزاحی جملہ حضرت الامامؒ کو پہونچا، تو آپ نے شیخ نہال صاحبؒ کو بلایا، وہ بہت گھبرائے؛ لیکن جواب دینے کے لیے ان کی زبان سے حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ: اس کا ایک جواب الزامی تو یہ ہے کہ: کیا ہر مناظرہ کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں، کھانے میں مناظرہ ہوا، تو تم مناظرہ کردگے۔ پھر فرمایا: تمہارے ذہن میں کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ نہ کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں نہ پیدا ہوا؟ کیوں کہ کھانا بہیمیت کی علامت ہے، جس کا تعلق بے کمال سے ہے، اس میں مناظرہ کے لیے ہم بیل، بھینس اور ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھانے میں ان کا مقابلہ کرو۔ اور نہ کھانا ملکیت کی خصوصیات میں سے ہے، جو کمال سے تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا کہ: ہمیں اور پنڈت جی کو کھانا کھلا کر الگ الگ دو کمروں میں بند کرکے تالا لگادو، اور چھ مہینے بعد نکالو، جو زندہ نکلے، اسے برحق قرار دیا جائے۔ اور تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ: ''الحمد للہ! اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتباعِ سنت اور اظہارِ عبدیت کے لیے کھاتا ہوں''۔

حضرت الامامؒ کے کمالِ اتباعِ سنت کے نتیجے میں اس صفت ملکیت سے ہر حصہ یابی کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ: آپ ''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت'' کا مصداق تھے۔

(۱۳) عظیم عرفانی ارتقا اور اس کی واضح مثال

حضرت الامامؒ کے روحانی و معنوی امتیاز پر یہ ایک واقعاتی شہادت ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند علم حدیث میں باامتیاز اور صاحب نسبت بزرگ تھے، جو حضرت الامامؒ اور حضرت گنگوہیؒ سے عمر میں کم تھے، اور دونوں کے استاذ زادے بھی تھے؛ اس لیے دونوں حضرات نہایت ادب واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کے قلب میں اپنی جلالی شان کے ساتھ ایک سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ ان ہی دونوں بزرگوں نے مجھے یہاں دارالعلوم میں طلبہ کے ساتھ تعلیم میں مشغول کردیا، جس کی وجہ سے میں ریاضت ومجاہدات کے ذریعہ روحانی ترقیات سے محروم ہورہا ہوں۔ اسی فکر کے نتیجے پر حضرت والا نے فرمایا کہ: یہ آپ کی روحانی ترقی بمشیت اللہ اس تعلیم دین ہی

میں مضمر ہے۔ اسے سن کر سکوت تو فرمایا؛ لیکن اور روحانی ترقی کے جذبۂ صادق کے تحت حسب عادت اچانک حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کچھ روز غائب رہے۔

کچھ روز کے بعد واپس تشریف لائے، تو معلوم ہوا کہ اجمیر شریف گئے تھے، اور وہاں حضرت خواجہ غریب نوازؒ سے ان دونوں بزرگوں کا یہی شکوہ کیا کہ خود مجاہدات سے روحانی ترقی کر رہے ہیں، اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ: تیری ترقی تعلیم دین ہی ذریعہ ہوگی۔ اس پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہ سے القائی جواب یہ ہی ملا کہ: وہ دونوں صحیح کہتے ہیں، آپ کی ترقی روحانی عند اللہ اسی تعلیم میں مضمر ہے۔

دیوبند واپسی کے بعد یہ تفصیل کسی کو نہیں بتائی، اس کے باوجود بوقتِ ملاقات حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ: وہی بات جب بڑی سرکار سے بھی سامنے آئی، تو اب تو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہم خدام جو کچھ عرض کرتے تھے، وہ سراپا اخلاص وخیر خواہی پر مبنی تھا۔

حضرت الامامؒ کے اس جملہ پر جہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا چہرہ اعتراف کا اظہار کر رہا تھا، وہیں یہ جملہ حضرت الامامؒ کے عرفانی ارتقائے عظیم پر شاہد عدل بھی بن رہا تھا۔

(۱۴) بحرِ معرفت کے حقیقی غواص

حضرت الامامؒ کی مقدس زندگی کے آخری لمحات میں یہ ہی امتیاز بھی آپ کی ولایت کاملہ کا مکمل مصداق بن کر سامنے آیا، کہ عالم نزع میں متوسلین ومحبین نے تلقین شروع کی؛ لیکن حضرت الامامؒ انقباض کے ساتھ کبھی چہرہ داہنی جانب پھیر لیتے اور کبھی بائیں جانب، جس سے تلقین کنندگان تشویش وحیرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھے، اور حضرت الامامؒ کے اس انقباض کی کوئی توجیہ نہیں کر پا رہے تھے، کہ اس وقت حضرت الامامؒ کے بحرِ معرفت کے شناور، رفیقِ لبیب، فقیہ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تشریف لے آئے، اور تلقین بند کرا کے خود حضرت الامامؒ کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ گئے، چند لمحے بعد وقت موعود آپہونچا، اور حضرت الامامؒ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

اس کے بعد متوسلین نے بوقتِ تلقین حضرت الامامؒ کے انقباض کے بارے میں استفسار کیا، تو حضرت فقیہ الاسلامؒ نے فرمایا کہ: میرے بھائی اپنی قوتِ معنوی سے مسمّٰی، یعنی ذات بابرکاتِ حق تک تک واصل ہو چکے تھے، اور آپ لوگ تلقین کے ذریعہ اسم کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، تو یہ عروج سے نزول ہی طرف لانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے موجبِ انقباض ہونا ہی چاہیے تھا، وہی ہوا۔ تلقین بند کرنے کے بعد انقباض ختم ہو گیا، اور ان شاء اللہ! وہ مقبولیت کے ساتھ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

(۱۵) زعفران زار تھی فضا لحد سے تیری

اختتامِ کلام پر وفات کے بعد کے اس عظیم قرینۂ مقبولیت پر ایک خاص واقعہ کا ذکر اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس کا بھی اس وقت کوئی جاننے والا موجود نہیں ہے۔ یہ واقعہ میرے نانا خسر جناب شیخ حامد حسن صاحبؒ مرحوم نے غالباً ۱۹۵۴ء میں بطورِ خاص مجھے بلا کر بالمشافہ سناتے ہوئے فرمایا کہ: اس وقت حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دیکھنے والوں میں شاید میرے سوا کوئی زندہ نہیں ہے، اور حضرت الامامؒ کی وفات کے وقت میری عمر چودہ سال کی تھی، وفات کی اطلاع پر پورے شہر کے ہر مسلمان گھرانے میں ماتم کی کیفیت تھی۔ میں نمازِ جنازہ اور تدفین میں بھی حاضر رہا۔ قبرستانِ قاسمی کی زمین پر سب سے پہلی قبر بھی حضرت الامامؒ ہی کی بنی تھی۔ جنازہ جب قبرستان میں پہونچا، تو قبر ایک عجیب وغریب دل لبھانے والی حیرتناک نہایت تیز خوشبو پورے قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی، جس کے بارے میں تمام لوگوں کی زبانوں پر یہ ہی الفاظ تھے کہ: قبر کی یہ حیرتناک اور دل کش خوشبو حضرت الامامؒ کی عند اللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

اس غیر معمولی خوشبو کی وجہ سے لوگوں نے قبر سے نکلی ہوئی مٹی مٹھیاں بھر کر لے لیں، تو میں بھی مٹھی میں وہ مٹی لے کر گھر واپس آیا، اور اپنی والدہ سے سارا واقعہ سنایا، تو انہوں نے کہا کہ: تو بھی مٹی لایا ہے، یا نہیں؟ میں نے کہا کہ: لایا ہوں۔ وہ مٹی میں نے دی، تو انہوں نے اسے اپنے دوپٹے کا پلّا پھیلا کر بڑے احترام سے لیا، اور فوراً اس کو اندر لے جا کر صندوق میں محفوظ کر دیا۔ میرا بچپن تھا؛ البتہ کانوں میں پڑی یہ بات یاد پڑتی ہے کہ والدہ نے اس مٹی کو اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کسی کو کی تھی۔

احقر کے لیے ایک زائرِ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ سے ملاقات ایک سعادتِ کبریٰ ہے، جس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

حرف از زبانِ یار شنیدن چہ خوش بود
یا از زبانِ آں کہ شنیدن از زبانِ دوست

⁂

ماہنامہ "ندائے دارالعلوم دیوبند وقف" کے دو مضمون مکمل ہوئے۔ (مرتب)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ

کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بیان فرمودہ

چند ملفوظات وواقعات

تین انوکھی کتابیں

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تین کتابیں الابیلی ہیں قرآن شریف، بخاری شریف اور مثنوی شریف کہ کوئی ایسا ضابطہ نہیں جس سے یہ قابو میں آجائیں البیلی کے یہ معنی ہیں۔

لطیفہ

حضرتؒ نے شیعہ کے اثبات نسب بلواطت پر ظرافتہ لکھا ہے کہ ان صاحبوں کے پاس کوئی منتر ہوگا کہ نطفہ پیچھے سے آگے چلا جاتا ہے اور یہ شعر لکھا ہے۔

نہیں ہیں خون سے مژگان تر یہ خار دل نشیں نکلے
جنوں یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

حضرت حاجی صاحبؒ کی زبان

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت ظاہر فرمایا ہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ہر ایک بزرگ کو ایک خاص لسان دی جاتی ہے میری لسان مولوی محمد قاسم صاحب ہیں۔

اولیاء کی خوش پوشاکی

حضرتؒ کے پاس ایک گاؤں کا شخص ایک ٹوپی لایا جس پر گوٹ تو سرخ قند کی تھی۔ اور باریک باریک گوٹے کی دھاری سلی ہوئی تھی آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر وہ ٹوپی اوڑھ لی اور جب وہ چلا گیا تب کسی بچہ کو دے دی اور فرمایا یہ خوش ہوگا کہ میری ٹوپی اوڑھ لی تو یہ حضرات اپنے ہی دل کو خوش کرنے کو نہیں پہنتے بلکہ کبھی دوسروں کے دل خوش کرنے کو بھی پہنتے ہیں۔ پس ان حضرات کی خوش پوشاکی اور خوش لباسی صرف اپنے ہی حظ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ حکمتیں ہوتی ہیں۔

حاضر جوابی

حضرتؒ نے شاہ جہانپور میں ابطال الوہیت مسیح پر یہ کہا تھا کہ وہ خدا کیسے ہو جس کو کھانے کی ضرورت ہو ہگنے موتنے کا محتاج ہو اس پر پادری نے اعتراض کیا کہ گوہ موت کہنا بے ادبی ہے تو مولانا نے فرمایا کہ گوہ موت نہ سہی بول و براز سہی مگر بات ایک ہی ہے (صرف عنوان کا فرق ہے)

پیر کی سختی

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جس کا پیر بڑا (سخت گیر) نہ ہو اس مرید کی اصلاح نہیں ہو سکتی حضرت نے ایک لفظ میں حقیقت کو ظاہر فرمادیا اور یہ ان بزرگ کی رائے ہے جو مجسم اخلاق تھے۔

باطنی مقام

حضرتؒ میرٹھ میں مثنوی پڑھاتے تھے اور ایک درویش بھی شریک ہوتے تھے کئی روز مثنوی شریف سن کر کہتے ہیں کہ مولانا اگر درویش بھی ہوتے تو کیا اچھا ہوتا اس لئے انہوں نے ایک روز محبت سے کہا کہ میں آپ کو توجہ دینا چاہتا ہوں ذرا بیٹھ جایئے اور ان کی نیت یہ تھی کہ کسی کیفیت محمودہ کا مولانا پر القا کریں حضرت مولانا براہ تواضع

بیٹھ گئے اور وہ متوجہ ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر کہنے لگے کہ حضرت بڑی گستاخی ہوئی معاف فرمائیے مجھ کو کیا خبر تھی کہ آپ اتنی دور پہنچے ہوئے ہیں۔

شیعوں کا رونا

ایک صاحب نے عرض کیا کہ مجالس میں شیعہ رونے ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور اس کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ رنج ہی کیا ہوا جو اتنے سامان کے بعد رونا آوے۔

مشتبہ کھانا سے اجتناب

حضرتؒ کی ایک شخص نے دعوت کی مگر کھانا مشتبہ تھا آپ نے اس کی دلجوئی کے لئے کھا تو لیا مگر گھر آ کر قے کر کے سب نکال دیا۔

اس میں ایک طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ تناول کا تو ارتکاب ہو ہی چکا تھا جو مذموم ہے پھر ایسا کرنے سے کیا نفع ہوا جواب یہ ہے کہ ایک تو فعل ہے یعنی کھانا وہ تو بے شک واقع ہوا مگر دوسری چیز ہے جز بدن بنا تو جز بدن بننے سے جو ظلمت ہوتی اس سے بچاؤ کیا جیسا حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے خبری میں اجرت کا دودھ پی لیا تھا جس پر کوئی مواخذہ نہ تھا مگر پھر بھی خبر ہونے کے بعد قے کر دی اس کا بھی یہی نفع تھا حدیث **کل لحم نبت من السحت فالنار اولی به** میں اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے باقی شبہ مشتبہ کھانے کا تو وہ فتویٰ سے حرام نہ تھا اور دلجوئی کی مصلحت اس میں بھی کراہت پر راجح تھی۔

یہاں جزو بدن بننے کے متعلق ایک ضروری تنبیہ ہے کہ اگر حرام کا تناول بقصد نہ ہو تو محض جزو بدن بن جانا موجب نار نہیں پھر اشارہ کی حقیقت یہ ہوگی کہ گو یہ خود معصیت نہ ہو مگر اس سے اب بار پیدا ہوگا کہ وہ معصیت کی طرف داعی ہوگا سو اگر کوئی مقاومی قوی نہ ہوا تو بواسطہ صدور اختیاری کے نار کیلئے موجب ہو جاویگا۔

شیخ سے عشق

ایک مرتبہ حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی پڑھنا پڑھانا تو اور چیز ہے مگر بیعت تو ہوں گے حضرت امدادؒ ہی سے حضرت مولانا کو حضرت کے ساتھ عشق کا درجہ تھا۔

امراءاور درویشوں کا فرق

اس پر حضرتؒ کا فرمانا یاد آ گیا کہ دنیا ہمیں بھی ملتی ہے اور امراءکو بھی مگر اتنا فرق ہے کہ ہم کو عزت کے ساتھ ملتی ہے اور ان کو ذلت کے ساتھ مگر اس استغنا کا حاصل اپنی عزت کی حفاظت ہے نہ کہ امراء کی تحقیر کہ یہ بھی برا ہے۔

شکایت سے نفرت

حضرتؒ تو شکایت سنتے ہی نہ تھے فرما دیتے کہ میں سننا نہیں چاہتا۔

دوسرے کی ذمہ داری لینے سے پرہیز

حضرتؒ کا قصہ ہے کہ بریلی کے ایک رئیس نے غالباً چھ ہزار روپیہ پیش کیا کہ کسی نیک کام میں لگا دیجئے فرمایا کہ لگانے کے بھی تم ہی اہل ہو تم ہی خرچ کر دو۔ اس نے عرض کیا کہ میں کیا اہل ہوتا فرمایا کہ میرے پاس اس کی دلیل ہے وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو اہل سمجھتے تو مجھ کو ہی دیتے تبسم فرماتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس کا جواب تو تھا کہ حضرت اللہ میاں دے تو رہے ہیں۔

ہیبت

ملا محمود صاحبؒ نہایت سادہ بزرگ تھے ایک مرتبہ سبق میں ایک طالب علم کے گھونسہ مارا مگر وہ ہٹ گیا تو گھونسہ زمین پر لگا اور غصہ بھڑک گیا پھر جوتہ پھینک کر مارا اس کی زد سے بھی بچ گیا تو اور بھی غصہ بھڑک گیا اور بڑا شور وغل مچا میں ان کی درسگاہ سے ایک طرف کو جا رہا تھا اس طرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تشریف رکھے ہوئے تھے مجھ کو بلایا اور واقعہ پوچھا باوجودیکہ نہایت شفقت فرماتے تھے مگر جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی اور بات نہ کی جاتی تھی حتیٰ کہ گھونسہ کا لغت بھول گیا یہ ہیبت ان حضرات کو خداداد عطا ہوتی ہے۔

انکساری و بے نفسی

حضرتؒ کے والد شیخ اسد علی صاحب حقہ بہت پیتے تھے جب ضرورت ہوتی فرماتے کہ بیٹا قاسم حقہ بھر دو اور مولانا کی یہ حالت تھی کہ فوراً حکم کی تعمیل فرماتے باوجود اس کے کہ مرید اور شاگرد سب موجود ہوتے مگر کچھ پرواہ نہیں اگر کوئی کہتا بھی تو فرماتے کہ یہ تمہارا کام نہیں یہ میرا کام ہے اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس انکسار اور فنا کا کہ بالکل ہی اپنے کو مٹا دیا تھا مولوی معین الدین صاحب کہتے تھے کہ ایک ولایتی درویش آئے بڑے غصہ میں بھرے ہوئے نماز پڑھ کر مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے جب لوگ نماز پڑھ کر نکلنے لگے تو مولانا کے والد بھی آئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ تم مولانا سے حقہ بھرواتے ہو آخر باپ تھے کہا کہ جی ہاں۔ ان درویش نے کہا کہ کبھی باپ ہونے کے بھروسہ رہو تم جس وقت مولانا کو حقہ بھرن کو کہتے ہو حاملان عرش کانپ اٹھتے ہیں اگر تم نے عنقریب توبہ نہ کی تو کوئی وبال نازل ہوگا پھر انہوں نے ایسی فرمائش نہیں کی۔ دوسرا واقعہ حضرت مولانا ہی کا ہے کہ جلال آباد کے ایک خان صاحب حضرت کے مہمان ہوئے اور آدھی رات کو پلنگ پر پڑے ہوئے کروٹیں بدل رہے تھے۔

مولانا بڑے ذہین تھے سمجھ گئے کہ غالباً حقہ کے عادی ہیں مولانا اسی وقت محلہ سے حقہ مانگ کر لائے اور بھر کر چارپائی کے برابر میں لاکر رکھ دیا اور فرمایا کہ میں پیتا نہیں اس لئے بھرنا بھی نہیں آتا۔ دیکھ لیجئے کہ کسی چیز کی کمی بیشی ہو تو ٹھیک کر دوں خان صاحب بے چارے پلنگ سے اتر کر الگ ہو گئے اور بڑی عذر معذرت کی فرمایا کہ تم مہمان ہو تمہارا حق ہے اس میں شرمندگی اور محجوب ہونے کی کونسی بات ہے ان خان صاحب کے ساتھ ایک بازاری عورت تھی بے نکاحی اور یہ پہلے سے علماء کے

معتقد نہ تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ سب کو دیکھ لیا ہے صبح ہی کو مولانا سے مرید ہو گئے اور اس عورت سے نکاح پڑھوا کر اس کو بھی مرید کروایا تو حضرت مولانا اس قدر منکسر المزاج تھے کہ اپنے مہمانوں تک کا حقہ بھرتے تھے۔ بھلا باپ کا حقہ بھرنا کیسے چھوڑ سکتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ بڑا بننے میں کیا رکھا ہے۔

سرسید کا جواب

حضرتؒ نے بضرورت اہل زیغ سے تحریری گفتگو بھی فرمائی ہے سرسید کے جواب میں بھی رسالہ تحریر فرمایا ہے سرسید نے اپنی ایک تحریر میں کسی شخص کے اس استفسار پر جواب میں کہ کسی عالم کو تمہارے سمجھانے کے لئے آمادہ کیا جاوے یہ شعر لکھا تھا۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ ودل فرش راہ　　کوئی ہم کو یہ تو سمجھاوے کہ سمجھائیں گے کیا

جب مولانا کو وہ تحریر دکھائی گئی تو مولانا نے جواب کے ساتھ اسی غزل کا یہ شعر لکھا۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک　　ہم کہیں گے حال دل اور فرمائیں گے کیا

علی گڑھ کالج پر تبصرہ

جس وقت سرسید نے اس علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے اپنے ایک خاص معتمد کو گنگوہ بھیجا اس لئے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کر کے مولانا کو یہ پیغام پہنچائے کہ میں نے مسلمانوں کی فلاح اور بہبود وترقی کے لئے ایک کالج کی بنیاد ڈالی ہے کیونکہ دوسری قومیں ترقی کر کے بہت آگے پہنچ چکی ہیں مگر مسلمان پستی کی طرف جارہے ہیں اگر آپ حضرات نے اس میں میرا ہاتھ بٹایا تو میں بہت جلد اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا جو حقیقت میں مسلمانوں کی کامیابی ہے غرضیکہ وہ سفیر گنگوہ آئے۔ اور حضرت مولانا کے پاس حاضر ہو کر بعد سلام مسنون کے سرسید کا پیام عرض کیا حضرت مولانا نے سرسید کا پیام سن کر فرمایا کہ بھائی ہم تو آج تک مسلمانوں کی فلاح بہبود اور ترقی کا زینہ اللہ اور رسول کی اتباع ہی میں

سمجھتے ہیں مگر آج معلوم ہوا کہ ان کی فلاح و بہبود و ترقی کا زینہ اور بھی کوئی ہے۔

تو اسکے متعلق یہ ہے کہ میری ساری عمر قال اللہ تعالیٰ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزری ہے اس لئے مجھے ان چیزوں سے زیادہ مناسبت نہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا کہ وہ ان باتوں میں مبصر ہیں ان سے ملو وہ جو فرمائیں گے اس میں ہم ان کی تقلید کریں گے کیونکہ ہم تو مقلد ہیں تو یہ مصاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ملے اور سرسید کا پیام دیا اور حضرت مولانا گنگوہی سے جو گفتگو ہوئی تھی اور اس پر حضرت مولانا نے جو جواب دیا تھا سب حضرت مولانا محمد قاسم کو سنا دیا گیا حضرت مولانا نے سنتے ہی فی البدیہہ فرمایا کہ بات یہ ہے کہ کام کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ نیت تو ان کی اچھی ہوتی ہے مگر عقل نہیں دوسرے وہ کہ عقل تو ہے مگر نیت اچھی نہیں تیسرے یہ کہ نہ نیت اچھی نہ عقل اور سرسید کے متعلق ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ نیت اچھی نہیں مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عقل نہیں اس لئے کہ جس زینہ سے مسلمانوں کو وہ معراج ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کا سبب سمجھتے ہیں یہ ہی مسلمانوں کی پستی کا سبب اور تنزلی کا باعث ہوگا اس پر ان مصاحب نے عرض کیا کہ جس چیز کی کمی کی شکایت حضرت نے سرسید کے اندر فرمائی ہے اسی کو پورا کرنے کے لئے تو آپ حضرات کو شرکت کی دعوت دی جارہی ہے تا کہ تکمیل ہو کر مقصود انجام کو پہنچ جائے یہ ایسی بات تھی کہ سوائے عارف کے دوسرا جواب نہیں دے سکتا تھا حضرت مولانا نے فی البدیہہ جواب فرمایا کہ سنت اللہ یہ ہے کہ جس چیز کی بناڈالی جاتی ہے بانی کے خیالات کے آثار اس بناء میں ضرور ظاہر ہوں گے اور اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک تلخ درخت کی پود قائم کر کے ایک مٹکے میں شربت بھر کر اور ایک ولی کو وہاں بٹھلا کر ان سے عرض کیا جائے کہ اس شربت کو اس درخت کی جڑ میں سینچا کرو۔ سو جس وقت وہ درخت پھول پھل لائے گا سب تلخ ہوں گے واقعی ہی عجیب بات فرمائی میں نے اس تحریک کے زمانہ میں ایک

موقعہ پر کہا تھا کہ جس کو تم اب پچاس برس کے بعد سمجھے ہو کہ علی گڑھ کالج کی وجہ سے انگریزیت اور دہریت اور نیچریت پھیلی ہے اور لوگوں کے دین وایمان برباد ہوئے اس کو ایک مبصر پچاس برس پہلے کر چکے تھے۔

خواب کی تعبیر

مولوی محمد منیر صاحب نے خواب دیکھا کہ بریلی کی طرف سے کچھ بطیں ہمارے گھر میں آئی ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ خواب بیان کیا حضرت نے تعبیر بیان فرمائی کہ بریلی کی ملازمت آئے گی اور تنخواہ کی نسبت فرمایا کہ کہو تو گیارہ روپیہ کی تعبیر دوں اور اگر مٹھائی دو تو بیس روپیہ کی انہوں نے کہا کہ مٹھائی لے لیجئے اور بیس روپیہ دلوا دیجئے چنانچہ بیس روپیہ کی تنخواہ پر بریلی کے اسکول میں ملازمت مل گئی اور گیارہ اور بیس کی حقیقت یہ فرمائی کہ بط عربی لفظ ہے اور ط مشدد ہے اور فارسی میں بلا تشدید مستعمل ہے تو دوسرے استعمال پر نوط کے اور دوب کے کل گیارہ ہوئے اور اول استعمال پر ط کو مکرر لینے پر اٹھارہ کا عدد حاصل ہوگا اور دوب کے سب بیس ہوئے یہ معبر کے اعتبار پر ہے مگر پھر بھی خواب ایسی چیز نہیں کہ اس پر کسی چیز کا مدار ہو اگر کوئی ساری عمر خواب نہ دیکھے نہ خواب کو سمجھے تو جرح کیا ہے کیونکہ اصل چیز تو عبدیت ہے اللہ تعالیٰ یہ اصلی دولت نصیب کرے۔

مولانا کا علم

حضرت رحمہ اللہ عجیب جامع کمالات تھے مولانا کا علم بالکل لدنی تھا مولانا میں حق تعالیٰ نے علمی کمالات بڑے عالی درجہ کے جمع کر دیئے تھے اور یہ عطاء حق ہے جس پر بھی فضل ہو جاوے۔

اعتدال پسندی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے حضرات میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ

جامع مراتب اعتدال تھے نہ متکبر تھے نہ تصنع کے متواضع مگر سادگی کے ساتھ ان میں استغنا کی شان تھی چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی دینی ضرورت سے ایک مرتبہ ریاست رامپور تشریف لے گئے اور نواب صاحب کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں۔

تو نواب صاحب نے مولانا سے ملاقات کے لئے تشریف لانے کی درخواست کی مگر مولانا تشریف نہیں لے گئے اور یہ عذر فرمایا کہ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں اور آداب شاہی سے ناواقف ہیں نہ معلوم ہم سے کیا گڑبڑ ہو جائے جو آداب شاہی کے خلاف ہو اس لئے آنا مناسب نہیں اس پر نواب صاحب نے جواب کہلا بھیجا کہ آپ تشریف لائیں آپ سے آداب کون چاہتا ہے ہم خود آپ کا ادب کریں گے کیونکہ ملنے کا بہت اشتیاق ہے مولانا نے پہلے تو انکسار کا جواب دیا تھا مگر جب اصرار ہوا پھر ضابطہ کا جواب کہلا کر بھیجا کہ عجیب بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو ہے اور آؤں میں غرضیکہ مولانا تشریف نہیں لے گئے اور باوجود اس فطری آزادی اور استغنا کے روڑکی میں دوسرا رنگ ظاہر ہوا کہ مجسٹریٹ کے بلانے پر انکار نہیں کیا اس کا قصہ یہ ہے کہ روڑکی میں دیانند نے حضرت مولانا سے مناظرہ کا اعلان کیا حضرت مولانا کو اطلاع ہوئی حالانکہ آپ اس زمانہ میں ضیق النفس سے سخت علیل تھے مگر باوجود اس کے رڑکی تشریف لے گئے اور بھی چند خدام ہمراہی میں تھے اور آپ نے سب سے فرمایا کہ کھانا سب بازار سے کھاویں اور کسی پر بار نہ ڈالیں وہاں کے مجسٹریٹ کو تشریف آوری کی خبر پہنچی تو سنتے ہی اول یہ کہا کہ ایسے ہی روٹیاں کھانے والے مولوی ہوں گے مگر لوگوں نے واقعہ بازار سے کھانا کھانے کا بیان کیا تب اس کے دل میں قدر ہوئی اور اس نے مولانا سے تشریف آوری کی درخواست کی جو مولانا کی عادت کے بالکل خلاف تھی کیونکہ مولانا دنیا کے بڑے لوگوں سے ملتے نہ تھے حتیٰ کہ نواب صاحب سے ملاقات نہیں کی مگر مجسٹریٹ سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے اور یہاں مصلحت دین کو اپنی

فطری عادت پر مقدم فرمایا اور وہ مصلحت مکالمہ سے معلوم ہوگی۔

چنانچہ اس نے رڑکی آنے کی وجہ دریافت کی مولانا نے فرمایا کہ دیانند دعوت مناظرہ دیتا پھرتا تھا اس سے مناظرہ کے لئے آیا ہوں اب جب میں آ گیا ہوں تو وہ انکار کرتا ہے مجسٹریٹ نے کہا ہم اس کو بلائیں گے غرضیکہ دیانند کو بلایا اور دریافت کیا کہ اعلان مناظرہ کے بعد اب مناظرہ کیوں نہیں کرتے دیانند نے کہا کہ فساد کا خوف ہے مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کا تم خوف مت کرو کیونکہ فساد کے ہم ذمہ دار ہیں مولانا نے فرمایا کہ اگر مجمع میں فساد کا اندیشہ ہے تو اس وقت تو مجمع نہیں اب سہی دیانند نے کہا کہ اس وقت تو میں اس ارادہ سے نہیں آیا مولانا نے فرمایا کہ ارادہ تو فعل اختیاری ہے اس لئے اب ارادہ کرلو مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوا یہ شان ہے ہمارے بزرگوں کی کہ نہ تکبر کہ باوجود مصلحت کے مجسٹریٹ سے بھی نہ ملیں اور نہ تذلل کہ خوانخواہ نواب صاحب کی ملاقات کو سبب عزت اور فخر کا سمجھیں کیونکہ ان حضرات کی نظر میں مقصود اصلی دین ہی تھا کہ دین کی وجہ سے تو مجسٹریٹ سے مل لئے اور دنیا کی وجہ سے بڑے لمبے بڑے نواب کو بھی منہ نہیں لگایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بڑے بڑے لوگ ٹوٹے اور غبار بھرے بوریوں پر آ کر بیٹھتے تھے اور ان میں جو دین کے لئے آتا ان کی رعایت بھی ہوتی تھی پس یہ حدود تھے۔

سادگی

ان حضرات میں تو نفس کا شائبہ بھی نہ تھا بلکہ نہایت سادگی اور بے نفسی تھی چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کی ایک لوہار نے دعوت کی مگر اتفاق سے کھانے کے وقت تک زور کی بارش ہوتی رہی اور وہ سمجھا کہ ایسے میں کیا تشریف لائیں گے اس لئے نہ کھانا پکایا اور نہ بلانے آیا تو مولانا شام کو خود ہی کمبل اوڑھ کر اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہ بڑا شرمندہ ہوا اور عرض کیا کہ میں نے بارش کی وجہ سے کچھ سامان بھی نہیں کیا۔ فرمایا آخر گھر کے لئے کچھ تو پکایا ہوگا۔ چنانچہ گھر کے لئے

ساگ روٹی تھی وہی بیٹھ کر کھالیا۔ غرضیکہ ان حضرات کی کوئی بات امتیازی نہ ہوتی تھی اور یہ سب اتباع سنت کی برکت اور اسی کا غلبہ تھا۔

طالب علم کی دعوت

حضرت کی ایک طالب علم نے دعوت کی تو فرمایا کہ اس شرط سے قبول کرتا ہوں کہ جو کھانا محلہ میں تمہارا مقرر ہے اس ہی میں سے کھلاؤ اور بکھیڑا نہ کرو۔

دنیا کی حالت

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ذہن تو دنیا سے رخصت ہو چکا مگر کچھ حافظہ باقی ہے اور وہ بھی اندھوں میں۔

اسلام کیسے پھیلا

مخالفین کا یہ اعتراض ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا خوب جواب فرمایا کہ شمشیر خود تو چلا نہیں کرتی کوئی چلاتا ہے جبھی تو چلتی ہے تو ان چلانے والوں میں سے کس نے شمشیر چلائی تھی بس معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور ہی چیز تھی کہ جس نے شمشیر زنوں کو جمع کر دیا اور وہ چیز آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبوبیت ہے جس کا دوسرا نام حسن خلق ہے اور یہ تو انسانوں کا ذکر تھا مگر آپ کی شان محبوبیت تو ایسی ہے کہ حجۃ الوداع میں جب حضور نے اونٹ قربان کیے تو ہر اونٹ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ حضور پہلے مجھے ذبح کریں تو ان جانوروں پر کونسی تلوار کا اثر تھا کسی نے خوب کہا ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف   بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ سب کچھ کیا تھا محض حضور کا عشق تھا اور جس کے دل میں عشق ہوگا وہ تو محبوب کے سامنے گردن جھکا کر یہی کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہدیہ کے بارے میں معمول

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ شخص ہم کو غریب سمجھ کر ہدیہ دے رہا ہے تو لینے کو جی نہیں چاہتا کہ ہم غریب ہی سہی مگر اس کو کیا حق ہے کہ وہ غریب سمجھ کر دے تو مولانا نے دفع حاجت کی مصلحت کی آمیزش کو پسند نہیں فرمایا اور ایک یہ بھی معمول تھا کہ سفر میں ہدیہ لینا پسند نہ فرماتے تھے کیونکہ بعض اوقات پہلے سے آمادگی نہیں ہوتی مگر منہ دیکھ کر خیال ہو جاتا ہے تو طیب قلب سے نہ ہوا۔

تدابیر بدعت نہیں ہیں

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ یہ غیر مقلد ہر بات کو بدعت کہتے ہیں خصوص طریق کے اندر جن چیزوں کا درجہ محض تدابیر کا ہے ان کو بھی بدعت کہتے ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایسی چیزوں کی عجیب مثال دی تھی کہ ایک طبیب نے نسخہ میں شربت بزوری لکھا مگر ایک موقع تو ایسا ہے کہ وہاں شربت بزوری بنا بنایا ملتا ہے وہ لاکر استعمال کر لے گا اور ایک موقع ایسا ہے کہ وہاں بنا بنایا نہیں ملتا تو وہ نسخہ کے اجزاء خرید کر لایا چولہا بنایا دیگچی لی آگ جلائی اب اگر کوئی اس کو بدعت کہے کہ طبیب کی تجویز پر زیادت کی تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا اس طرح دین کے متعلق کسی چیز کی ایجاد کی دو قسمیں ہیں ایک احداث فی الدین اور ایک احداث للدین اول بدعت ہے اور دوسری قسم چونکہ کسی مامور بہ کی تکمیل و تحصیل کی تدبیر ہے مگر خود مقصود بالذات نہیں لہٰذا بدعت نہیں سو طریق میں جو ایسی چیزیں ہیں یہ سب تدابیر کے درجہ میں ہیں سو اگر طبیب جسمانی کی تدابیر کو بدعت کہا جائے تو یہ بھی بدعت کہلائی جاسکتی ہیں ورنہ نہیں۔

حدود کی رعایت

حضرتؒ نے باوجود اس کے کہ حضرت مولانا فانی محض تھے مگر اپنے ایک سمدھی سے ایک موقع پر صاف فرما دیا تھا کہ شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہونے کی وجہ

سے تم کولڑکی دیدی ورنہ تم بھی ہو پسند میں ہمارے برابر نہیں اور حضرت مولانا کا یہ فرمانا فخر کی راہ سے نہ تھا بلکہ ایک نعمت کا اظہار تھا اگر فخر ہوتا تو یہ شادی کیوں واقع ہوتی۔ یہ حضرات جامع ہیں اس لئے ہر چیز ان کے یہاں حد پر رہتی ہے اور حدود سے باہر کوئی بھی بات نہیں ہوتی اور یہ ان کی شان ہوتی ہے۔

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن

نصیحت کی حکمت عملی

حضرت کا قصہ سنئے کہ ایک خان صاحب آپ کے معتقد تھے اور بچپن کے دوست بھی تھے حتیٰ کہ جمعہ کو ایک ہی جگہ غسل کر کے کپڑے بدلتے تھے مگر بظاہر وضع خلاف شریعت تھی ایک روز حضرت مولانا نے خان صاحب سے کہا کہ خان صاحب آپ کو معلوم ہے کہ ہماری تمہاری پرانی دوستی ہے اس لئے اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ تم اس وضع میں رہو اور میں اس وضع میں اس لئے جب آج نہانے آؤ تو اپنے دو جوڑے لے کر آنا ایک اپنے لئے اور ایک ہمارے لئے کیونکہ میں بھی آج تمہارے جیسی وضع اختیار کروں گا تو خان صاحب مارے شرمندگی کے پانی پانی ہوگئے اور اسی روز سے شرعی لباس پہن لیا تو ناصح اگر عالم نہ ہوگا اور نصیحت کرے گا تو اس میں بھی تکبر ہوگا کیونکہ وہ اس خیال سے نصیحت کرے گا کہ میں اس سے اچھا ہوں تو اس کا اثر برا ہوگا اس لئے مناسب طریق سے نصیحت کرنا یہ عالم ہی کا کام ہے دوسرے فطری طور پر مخاطب کے قلب میں اس کی عظمت ومحبت ہوتی ہے اس لئے اس کی سختی بھی گوارا کرلی جاتی ہے۔

علم کی عظمت کا سبب

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ علوم کی بھی قسمیں ہیں بعض کا علم تو طولی عرضی ہوتا ہے اور بعض کا عمقی جس میں تقویٰ کو خاص دخل ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کے علم کی خاص شان کے بہت اسباب ہیں جن میں اعظم سبب تقویٰ ہے ایک مولوی صاحب میرے دوست ہیں انہوں نے ایک مرتبہ اپنے استاذ سے نقل کیا کہ تبحر کی دو قسمیں ہیں ایک تبحر کدو اور ایک تبحر مچھلی کدو تو تمام سمندر پر اوپر ہی اوپر پھر جاتا ہے مگر اس کو اندر کی کچھ خبر نہیں اور مچھلی عمق تک پہنچتی ہے تو آج کل کے اکثر تبحر کدو ہیں کہ جن کی نظر محض سطحی ہے۔

بحث وجدال سے پرہیز

ایک شخص نے ایک فتویٰ پر اعتراض کیا اس کا جواب دے دیا گیا اس نے پھر بحث کی تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں یہ لکھ دو کہ ہم مرغان جنگی نہیں ہیں کہ تو تو میں میں کریں اور بھی بہت علماء ہیں ان سے معلوم کرلو یہ طرز اپنے بزرگوں کا دیکھا اور یہی پسند ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ تحذیر الناس کی اشاعت پر مولانا پر کفر کا فتویٰ دیا گیا مگر مولانا نے سن کر پڑھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لو بھئی اب تو مسلمان ہوں۔

عوام کی رعایت کا ضابطہ

رعایت عوام کو حکیم ہی سمجھ سکتا ہے ہر ایک کا کام نہیں دیکھئے نکاح زینب میں عوام کی رعایت نہیں کی گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ اگر میرا نکاح زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہوا تو عوام طعن کریں گے کہ متبنی کی بیوی سے نکاح کرلیا۔

اس وجہ سے حضور زینب سے نکاح کو پسند نہ فرماتے تھے مگر آخرکار بحکم خداوندی آپ نے حضرت زینب سے نکاح کیا تو اس مقام پر عوام کی بدنامی کے خیال سے اس فعل کو ترک نہیں کیا گیا بخلاف قصہ ادخال حطیم فی البیت کے کہ وہاں پر عوام کے طعن کے خیال سے اس فعل کی اجازت نہیں دی گئی۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے اندر تفصیل ہے اسی کو حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ یہ سمجھنا حکیم کا کام ہے کہ کہاں پر خوف ملامت سے کسی فعل کو ترک کرنا چاہئے اور کہاں پر نہیں یہاں تک تو مولانا کا ارشاد تھا اب آگے ان دونوں واقعوں میں فرق جس کی وجہ سے ایک میں یعنی حضرت زینب سے نکاح میں ملامت کے خوف سے رعایت نہیں کی گئی۔

اور دوسرے واقعہ میں یعنی ادخال حطیم فی البیت کے واقعہ میں ملامت کے خوف سے رعایت کی گئی سو وہ فرق میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ کتاب وسنت میں نظر کرنے سے یہ قاعدہ مستنبط ہوتا ہے کہ وہ فعل جو لوگوں کے نزدیک قابل ملامت ہے۔ اگر واجب یا مقصود فی الدین ہے تب تو بدنامی کے خوف سے اس کو ترک نہ کیا جاوے گا اور اگر وہ فعل جو لوگوں کے نزدیک قابل ملامت ہے۔ نہ واجب ہو اور نہ مقصود فی الدین ہو کہ اس کے ترک میں کوئی حرج نہ ہو تو اس کو نہ کیا جاوے گا پس حضرت زینب کے واقعہ میں جو لوگوں کے بدنام کرنے کی وجہ سے ترک نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ زید بن حارثہ حضور کے متبنی رہ چکے تھے اور اس زمانہ میں عوام الناس متبنی کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو نا جائز اور حرام اور ایسا قبیح سمجھتے تھے کہ عوام کے اس فساد عقیدہ کی اصلاح کے لئے اس وقت صرف تبلیغ قولی کافی نہ تھی بلکہ ضرورت تھی کہ تبلیغ فعلی کی جاوے اور یہ نکاح کرنا تبلیغ فعلی تھی اور تبلیغ واجب اور مقصود فی الدین ہے لہٰذا یہ نکاح کرنا مقصود فی الدین تھا اس لئے حضور نے یہاں لوگوں کی ملامت کی پرواہ نہ کی اور نکاح فرمایا۔ بخلاف ادخال حطیم فی البیت کے کہ وہ کوئی ضروری فعل فی الدین نہ تھا بلکہ محض ایک فعل مستحسن تھا جس پر کوئی ضروری مقصود موقوف نہ تھا (اس لئے اس کو ملامت کے خوف سے ترک کر دیا گیا)

دو آیات کی تفسیر

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کے متعلق یہ اشکال ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ تو اکثر بہت خائف اور محزون رہتے ہیں اس اشکال کا جواب بھی

اسی اصل پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے **لا خوف لھم** یا **لاحزن بھم** نہیں فرمایا بلکہ **لا خوف علیھم** فرمایا ہے یعنی ان پر آخرت میں خوف واقع نہیں ہوگا اور یہ نہیں کہ ان میں خوف نہیں۔

خلاصہ اس توجیہ کا یہ ہے کہ ان میں خوف ہے مگر ان پر خوف نہیں اسی طرح **ذلک الکتاب لاریب فیہ** پر جو اشکال ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تو بہت لوگوں کو شک ہے پھر یہ کیوں فرمایا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس کی توجیہ بھی مولانا نے اسی اصل پر یہ فرمائی کہ وہ شک اس کتاب میں نہیں ہے بلکہ جن کو شک ہے خود ان میں خباثت ہے کہ درحقیقت ان کے فہم میں کھوٹ ہے مگر اس کتاب میں کوئی کھوٹ نہیں یہ تو حضرت مولانا کی تحقیق ہے اور مجھ کو اس کی ایک مثال مل گئی جس سے مولانا کا مقصود اور واضح ہو گیا وہ مثال یہ کہ یرقان اصفر والے کو جو سب چیزیں زرد ہی زرد نظر آتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں زردی ہوتی ہے نہ کہ ان چیزوں میں جب وہ کسی چیز کو دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ اس میں زردی ہے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ لاصفرۃ فیہ کہ اس میں زردی نہیں ہے بلکہ تیری آنکھوں میں ہے اسی طرح درحقیقت قرآن میں کوئی شک نہیں ہے اور جو اس میں شک کرتا ہے تو اس کے فہم کا قصور ہے۔

بڑوں کی بڑی ذمہ داری

حضرتؒ ایہام نقص کے بارہ میں مثال کے طور پر فرماتے تھے کہ گو ویسرائے کو سب اختیارات حاصل ہیں کانسٹیبل کے بھی اور تحصیلدار وغیرہ کے بھی لیکن اس کو کوئی کانسٹیبل اور تحصیلدار کہہ کر تو دیکھے کہ کیسے گردن ناپی جاتی ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے نقص کا سبحان اللہ یہ حضرات محقق ہیں اور یہ حضرات عارف ہیں خصوص خواص کی تو ایسی ایسی باتوں پر بھی گردن ناپی جاتی ہے جن پر عوام سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہوتی چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا فرمایا کہ مجھ سے یہ سوال ہوا کہ تم کیا عمل لائے ہو میں نے اپنے

جس عمل پر بھی غور کیا اس کو پیش کرنے کے قابل نہ پایا۔ بالآخر میں نے کہا کہ آپ کی توحید کا عقیدہ لایا ہوں کیونکہ یہ تو ہر عامی مسلمان کو بھی حاصل ہے ارشاد ہوا اما تذکر لیلة اللبن۔ کیا دودھ والی رات یاد نہیں ہے۔

بات یہ تھی کہ ایک شب حضرت بایزید کے پیٹ میں درد ہوا کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے رات دودھ پی لیا تھا اس سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے دودھ والی رات یاد دلائی کہ کیا تم کو اسی برتے پر توحید کا دعویٰ ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے دودھ کو موثر بتایا کیا یہی توحید ہے اس گرفت پر حضرت بایزید کانپ اٹھے اور عرض کیا کہ حضور میں کچھ نہیں لایا سوائے امید رحمت کے اس پر ارشاد ہوا کہ ہاں اب کہی آدمیوں کی سی بات گو تمہارا کوئی عمل اس قابل نہیں کہ تم اس کو آج ہمارے سامنے پیش کر سکو لیکن خیر تمہاری اس امید رحمت پر محض اپنی رحمت ہی سے جاؤ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا دیکھئے حضرت بایزید کا کتنا بڑا درجہ تھا لیکن ان کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوا اور ایسی بات پر گرفت کی گئی جو ہم سوال رات دن کہتے رہتے ہیں کہ فلاں سبب سے یہ مرض پیدا ہوا اور فلاں بے احتیاطی کی اس سے یہ نقصان ہوا۔

مقرباں را بیش بود حیرانی

اور ؎

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

شفقت کا غلبہ

بعضوں میں اتنی شفقت ہوتی ہے کہ مخلوق کی اصلاح کی خاطر احیاناً اپنے معمولات میں بھی وہ تغیر و تبدل کر دیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت و اخلاق کی تو یہ حالت تھی کہ بعد نماز فجر لوگ گھیر لیتے تو آپ مجمع کی طرف رخ کئے دیر دیر تک بیٹھے رہتے یہاں تک کہ بعض دن تو اشراق چاشت اوراد و وظائف سب مؤخر ہو جاتے تھے۔

اہتمام فکر

اب رہا یہ سوال کہ ایسی باتوں پر نظر کیونکر پہنچتی ہے سو اس کا حقیقی سبب تو فضل ہے مگر ظاہری سبب اہتمام اور فکر اور ہر وقت اس میں ڈوبا رہنا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو علوم موہوب ہوئے اس میں اسی اہتمام کو خاص دخل ہے خود فرماتے تھے کہ جب میں حدیث پڑھتا تھا کوئی تو لغات دیکھتا کوئی ترکیب وصفی نحوی وصرفی دیکھتا کوئی سند ہی دیکھتا مگر میں زیادہ تر اس پر غور کرتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشا کیا ہے اور اس سے ناشی کیا ہے تو اس غور وفکر کی یہ برکت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے علوم خاصہ موہوب فرمائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ومن یومن باللہ یھد قلبہ** دوسری جگہ ارشاد ہے **والذین جاھدوا فینا لنھد ینھم سبلنا** پس جب بندہ کی طرف سے تقویت ایمان اور کوشش ہوتی ہے تو اس کی صحیح راستوں کی طرف رہبری کی جاتی ہے۔

متقین کا مفہوم

فرمایا کہ ایک بار مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے کسی نے سوال کیا کہ قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے **ھدی للمتقین** سو متقین تو پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہوا اس کے جواب مختلف حضرات نے مختلف دیئے ہیں چنانچہ ایک جواب صاحب جلالین نے دیا ہے کہ مراد متقین سے صائر الی التقویٰ ہیں مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک دوسرا جواب دیا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں۔ بلکہ لغوی معنے ہیں یعنی خوف اور کھٹک تو آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر ہے اور قصد ہے اپنی اصلاح کا ان کو قرآن ہدایت کرتا ہے باقی جو شخص اپنی اصلاح کا قصد ہی نہ کرے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے اور قرآن کا اس میں کیا نقص ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب کا جب یہ جواب میں نے سنا تو فوراً اس

جواب کی ایک تائید قرآن سے میری سمجھ میں آئی وہ یہ کہ سورہ واللیل میں ارشاد ہے فاما من اعطی واتقٰی وصدق بالحسنٰی اس کے بعد ارشاد ہے واما من بخل واستغنٰی وکذب بالحسنٰی یہاں صفت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ بخل کا استعمال کیا گیا ہے اور اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے اسی طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق ہے اور صدق اور کذب میں بھی تقابل موجود ہے بس اسی طرح پہلی آیت میں استغناء ہے تو دوسری میں اس کے مقابل کوئی مفہوم ہونا چاہئے اور وہ واتقی ہے پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقویٰ کے وہ معنی مراد ہوں گے جو استغنی کے مقابل ہوں پس استغنا کے معنی ہیں بے فکری کے تو یہاں تقویٰ کے معنی ہوں گے فکر اور کھٹک ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے بیان فرمائے وہ قرآن سے ثابت ہیں اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کو حل کرنا چاہتے ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کا جواب محض ترجمہ سے حل کر سکتے تھے۔

نوٹ: مذکورہ بالا ملفوظات وواقعات ''الافاضات الیومیہ'' سے ماخوذ ہیں۔

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی چند حکایات

(از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ)

الہامی علوم

(۱) بروایت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ چھلنیوں کا وعظ کہا تھا۔ ہر چیز کیلئے ایک چھلنی ثابت کی تھی۔ اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک نہایت لطیف مضمون فرمایا تھا۔ حدیث پڑھنے والوں کے سمجھنے کے لائق واقعی محقق سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث کا وہ مضمون یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن اس زمین کا پیڑا بنا کر اس کی روٹی پکا کر اول غذا جنتیوں کو یہ دیں گے اب اس میں ظاہر میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ کیا اہل جنت کو خاک پتھر کھلا دیں گے۔ یہ اچھا انعام جنتیوں کو ملے گا تو اس کو اسی قاعدہ پر متفرع کر کے سمجھو کہ تم اپنے مہمان کو بے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھلاتے تو حق تعالیٰ بلا چھانے ہوئے کیوں کھلانے لگے۔ چنانچہ زمین اس طرح چھانی جائے گی کہ مٹی پتھر سب نکل جائیں گے اور صرف اجزاء لطیفہ رہ جائیں گے باقی یہ بات کہ اس میں اجزا لطیفہ کہاں ہیں سو اس کو یوں سمجھو کہ جتنی نعمتیں کھانے پینے کی نکلتی ہیں ظاہر ہے کہ وہ سب زمین ہی سے نکلتی ہیں اور وہ زمین ہی کے اجزاء ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اس میں ایسے ایسے اجزاء لطیفہ مبطن ہیں۔ بس ان اجزاء کو حق تعالیٰ علیحدہ کر دیں گے اور وہ ان کی غذا بنے گی۔ سو وہ تو الذ جمیع الاشیاء ہوگی اور غالباً حکمت اس میں یہ ہوگی

کہ بہت سے بندگان خدا مجاہدات و ریاضات میں دنیا کی لذتوں سے متمتع نہیں ہوتے ان کو اگر پیشتر یہ غذا نہ کھلا دی جاوے تو وہ جنت کی غذاؤں کا موازنہ نعماء دنیا سے کس طرح کر سکتے ہیں۔ اور بدون موازنہ کے حظ کم ہوگا اس لئے ان کو وہ غذا کھلا کر دکھلا دیا جائے گا کہ دیکھو دنیا کی نعمتوں کا خلاصہ یہ ہے پھر اس کے بعد فرمائیں گے کہ لو اب کھاؤ یہ ہے جنت کی چیز۔ تو اصل تو اس کے کھلانے سے مقصود یہی ہوں گے مگر ان کے طفیل میں اور سب کو بھی یہ غذا دیں گے پھر فرمایا کہ یہ مضامین ہمارے اساتذہ کے الہامی اور کشفی ہیں۔ (ص ۱۴۵ ام نمبر ۲۱۴ جلد اول حسن العزیز)

اکابر کے مزاج کا فرق

(۲) بروایت مولوی محمد یحییٰ صاحب سیوہاری فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ سے کسی نے مولود شریف کی بابت دریافت کیا۔ فرمایا بھائی نہ اتنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اتنا اچھا ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔

پھر ہمارے حضرت (مولانا مرشدنا شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہ) نے فرمایا کہ یہ اس قدر جامع جواب ہے کہ ایک رسالہ کا رسالہ اس کی شرح میں لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ گول جواب ہے عوام نہیں سمجھ سکتے۔ ہر فریق اس جواب کو اپنی تائید میں پیش کر سکتا ہے۔ حضرت مولانا کھلم کھلا کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔

ایسے سوالات کے بہت نرم جواب دیتے تھے۔ البتہ حضرت مولانا گنگوہی بالکل صاف صاف کہتے تھے ایک ہی دفعہ میں چاہے ٹھہر و یا جاؤ۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ پہلے میں بھی نرم جوابات کو پسند کرتا تھا لیکن اب تجربہ کے بعد مولانا گنگوہی کا طرز نافع ثابت ہوا۔ نرم جواب میں یہ مصلحت سمجھی جاتی ہے کہ مخاطب کو وحشت نہ ہو اور وہ ہم میں آ جائے حالانکہ یہ غلط ہے وہ ہم میں نہیں آتے وہ تو اپنے اسی خیال کی بناء پر ہم میں آئے ہیں تو یہ دراصل ہم میں آنا نہ ہوا ہاں ہم ہی کچھ ادھر چلے گئے وہ ہم میں نہیں آئے۔ (ص ۱۷۱ ام ۲۸۱ حسن العزیز جلد اول)

حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی کا طرزِ عمل

(۳) فرمایا کہ ایک صاحب سماع درویش حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کی تعریف سن کر آئے۔ حسب معمول مولانا نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا اور سب طالب علموں کو سمجھا دیا کہ خبردار کوئی گفتگو ان کے طریقہ کے خلاف نہ کی جاوے کیونکہ مہمان کی دل شکنی نہیں ہونی چاہئے۔

کسی نے اس واقعہ کی خبر حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں کر دی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ بہت برا کیا بدعتی کا اکرام جائز ہی کہاں ہے۔ اس شخص نے یہ اعتراض حضرت مولانا نانوتوی کے پاس پہنچا دیا فرمایا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر مہمان تک کا اکرام فرمایا ہے۔ اس شخص نے اس جواب کو مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ کافر کے اکرام میں غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں بدعتی کے اکرام میں عوام کی غلط فہمی اور فساد عقیدہ کا اندیشہ ہے اس لئے ناجائز ہے اس جواب کو پھر اس شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں پہنچ کر بیان کیا تو مولانا نے اس کو ڈانٹ دیا یہ کیا واہیات ہے۔ ادھر کی ادھر لگاتے پھرتے ہو بیٹھو اپنا کام کرو۔ (ص ۱۷۱ نمبر ۲۸۱ جلد اول حسن العزیز)

علم کی وجہ سے اعتقاد

(۴) حضرت حاجی صاحب بھی اصطلاحی عالم نہ تھے لیکن حضرت کے علوم سے علماء دنگ تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کتنے بڑے عالم تھے۔ یوں فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب کا کوئی تقوے کی وجہ سے معتقد ہے کوئی کرامت کی وجہ سے میں حضرت کے علم کی وجہ سے معتقد ہوں۔ ایسا شخص یوں کہے پھر حد ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرت دیکھے ہوئے تھے۔ وہ دیکھی ہوئی باتیں فرما رہے تھے۔ نرا سننے والا طالب علمی شبہات کرے گا کچھ دیکھے ہوئے ہو تو سمجھ سکتا ہے سنے ہوئے میں اور دیکھے

ہوئے میں بڑا فرق ہے۔ دیکھنے والا سننے والے کو اس طرح کیسے سمجھا سکتا ہے۔

(ص ۲۲۸ م نمبر ۳۸۴ جلد اول حسن العزیز)

مہدی کی دلجوئی

(۵) فرمایا کہ ایک شخص حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک چھینٹ کی ٹوپی لائے اس میں شالباف کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا تھا۔ مولانا نے سر پر رکھ لی۔ پھر کسی بچہ کو دیدی اور فرمایا کہ اس بیچارے کا دل خوش کرنے کے لئے میں نے سر پر رکھ لی تھی۔ (ص ۱۴۱ م نمبر ۱۱۶ حسن العزیز جلد دوم)

عاشقانہ شان

(۶) فرمایا کہ مولانا نانوتوی کی شان نہ عالمانہ تھی نہ درویشانہ تھی۔ بلکہ عاشقانہ شان تھی اور آپ کی مجلس دوستانہ ہوتی تھی۔ گاڑھے کے کپڑے پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ دیوبند سے نانوتہ کو تشریف لے جاتے تھے۔ ایک جولاہے نے بوجہ سادگی کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ سوت کا آج کیا بھاؤ ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ بھائی آج بازار جانا نہیں ہوا۔ وہ جولاہا کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ (ص ۵۸ م نمبر ۲۶۰ جلد مذکور)

بیعت کا حیلہ

(۷) فرمایا کہ مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک شخص شکر لے کر حاضر ہوئے، حاضرین میں وہ تقسیم ہوگئی پھر انہوں نے بیعت کے لئے عرض کیا حضرت نے انکار فرمایا انہوں نے عرض کیا کہ اگر بیعت نہیں کرتے تو میری شکر واپس کردو۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی ان کی شکر لا کر دے دو۔ انہوں نے کہا کہ میں تو وہی شکر لوں گا۔ مولانا نے فرمایا بھائی وہ تو صرف آ گئی عرض کیا تو مجھے بیعت کر لیجئے یا شکر میری وہی واپس کیجئے۔ آخر حضرت مولانا نے مجبور ہو کر بیعت فرمالیا۔

(ص ۸۶ م نمبر ۲۶۲، جلد دوم حسن العزیز)

شانِ تقویٰ

(۸) فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو سبزی کا شوق تھا کچھ پودینہ دھنیہ وغیرہ کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ان میں مینگنی ڈالنے کی ضرورت ہوئی کسی زمیندار کا وہاں کو گزر ہوا۔ مولانا نے ان سے فرمائش کر دی۔ انہوں نے رعایا میں سے ایک گڈریہ کے سر پر ٹوکری میں مینگنیاں بھیج دیں۔ مولانا اپنے ہاتھ سے اس سبزی میں ڈال رہے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سامنے سے آ گئے بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اس شخص کا حال معلوم نہیں کہ ظالم ہے اس نے ضرور زبردستی ظلماً اس بیچارے غریب شخص سے بیگار لی ہے۔ اس کو ابھی واپس کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اسی وقت وہ مینگنیاں اپنے ہاتھ سے جمع کر کے سب واپس کر دیں۔ (ص ۱۰۳ نمبر ۳۲۳ جلد دوم حسن العزیز)

اسرار شریعت کا علم

(۹) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرماتے تھے کہ حدیث پڑھنے کے وقت میں یہی سوچا کرتا تھا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی چنانچہ یہی علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر منکشف فرمائے اسرار و حکم شریعت (ص ۱۱۴ نمبر ۳۶۱ جلد اول حسن العزیز)

ایک فتویٰ

(۱۰) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کی جائیداد خریدنا جائز نہیں کیونکہ وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا تھا۔ البتہ جہاں ایسا نہ ہو کچھ حرج نہیں۔ (ص ۱۳۴ نمبر ۴۲۷ جلد مذکور)

ملفوظ حضرت نانوتوی

(۱۱) فرمایا کہ خواجہ میں مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ اور ہمارے سب بزرگ تشریف لے جاتے تھے ایک بڑی بی نے وہاں ایک خواب دیکھ لیا تھا وہ مولانا احمد حسن

صاحبؒ کی بڑی خدمت اور بہت محبت کرتی تھیں۔ ویسے بھی مولانا سید تھے میں نے ایک صاحب سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا ایک مقولہ سنا ہے مولانا نے ایک مثال دی تھی کہ میرا ذہن تو سونے کا بہت بڑا ڈھیر ہے۔ اور مولوی احمد حسن صاحب کا ذہن سونے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر اور مولانا صاحب کا ذہن چاندی کا بہت بڑا ڈھیر ہے۔ مولوی احمد حسن صاحب کا ذہن میرے مناسب ہے اگر چہ زیادہ نہ ہو اور دوسرے کا اگر چہ زیادہ ہے مگر میرے مناسب نہیں۔ (ص ۱۵۸ام نمبر ۵۱۳ جلد مذکور)

ادب شیخ

(۱۲) فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب مولانا محمد قاسم صاحب کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ مولانا نے ایک مسودہ حضرت حاجی صاحب کا دیا ہوا نقل کیا اس میں ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا۔ اس کو مولانا نے صحیح نہیں کیا۔ ادب کی وجہ سے' بلکہ وہاں جگہ چھوڑ دی۔ حضرت حاجی صاحب نے درست فرمادیا۔ (ص ۱۸۱ام نمبر ۵۷۷ جلد مذکور)

علوم نانوتوی کے اسباب

(۱۳) مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کسی نے پوچھا کہ یہ علم مولانا محمد قاسم صاحب پر کہاں سے کھلا مولانا نے فرمایا کہ اس کے اسباب متعدد ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ مولانا فطری طور پر معتدل القوی اور معتدل المزاج تھے۔ پھر ان کے استاد بے مثال تھے۔ پھر پیر کامل ملے جن کا نظیر نہیں ان کی وجہ سے فن کی حقیقت منکشف ہوگئی اساتذہ کا ادب بہت کرتے تھے اور متقی بہت تھے جب اتنی چیزیں جمع ہوں تو پھر کیوں نہ کامل ہوں۔ (جلد مذکور)

سلامتی فہم

(۱۴) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہئے تو مطلب بالکل صاف ہے مگر مولانا کا سا فہم بھی تو ہو قرآن مجید

کے الفاظ کافی ہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ (ص ۱۹۰ م نمبر ۶۱۰ جلد مذکور)

اکابر کے علوم

(۱۵) فرمایا کہ سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی سے فرمایا کہ بھائی تم بڑے فقیہ ہو اس پر ہم کو رشک آتا ہے۔ مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ خود مجتہد بن بیٹھے ہو مگر ہمیں اس پر کبھی رشک نہ آیا اور ہم کو جو دو چار جزئیات یاد ہو گئے ہیں تمہیں ان پر رشک آتا ہے۔ پھر ہمارے حضرت (مولانا مرشدنا ہادینا شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہ) نے فرمایا کہ اگر ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرا دیا جاوے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازی وغزالی کے زمانہ کی بتلاویں گے۔ چنانچہ سنا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ البالغہ کا ترجمہ جب یورپ میں گیا تو وہاں لوگوں نے کہا کہ یہ پہلے زمانہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے اس زمانہ میں اس دماغ کا شخص نہیں ہو سکتا ہے۔ کسی کو پرانی کتاب مل گئی ہو گی اور سرقہ کی راہ سے اس لئے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔ (ص ۲۲۸ م نمبر ۳۶۷ جلد دوم حسن العزیز)

مجالس کا رنگ

(۱۶) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ایک یار باش ہیں اور مولانا گنگوہی کے یہاں اتنی تو کثرت نہ تھی مگر ہاں کبھی ذرا سی بات کہہ دیتے تھے کہ سب ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے اور خود نہیں ہنستے تھے۔ (ص ۲۴۰ م ۷۸۰ جلد مذکور)

ایک ملفوظ

(۱۷) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ دعوت کا کھانا اور جماعت کی نماز ایسی چیز ہیں کہ ان میں اپنے اوپر کچھ بوجھ نہیں پڑتا۔ دعوت کے کھانے کی کچھ فکر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا ہے اسی طرح جماعت میں اللہ اکبر کہہ کر کھڑے ہو گئے

اب کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو گا۔ سب بار امام کے ذمہ۔ پھر تبسم کر کے فرمایا کہ تیسری چیز شوق طالب علم کے لئے جماعت کا سبق کہ پڑھیں نہ اور کتابیں ختم ہو جاویں۔

(ص۲۴۴م نمبر ۲۸۴ جلد مذکور)

کمال کسر نفسی

(۱۸) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے اگر چار حرف جاننے کی تہمت نہ ہوتی اور اس سے لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔ (ص۲۳ ااربعین مصطفائی)

ظرافت طبعی

(۱۹) ایک بچہ بڑے پیٹ والا سامنے سے گزرا تو مسکرا کر فرمایا چلا کچھالا گڑ بڑ جھالا اور فرمایا یہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا ٹکڑا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک لڑکا بڑے پیٹ کا تھا اس کے بارہ میں فرمایا تھا۔

(ص۱۸۸ ااربعین مصطفائی)

عالمانہ شان

(۲۰) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رڑکی دیانند سے مناظرہ کے لئے گئے اور بھی چند آدمی ساتھ ہو گئے سنا ہے کہ مولانا ایک جگہ ٹھہرے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا کھانا بازار میں کھاویں۔ مجسٹریٹ کو خبر پہنچی تو اول وہ سمجھا کہ یہی دعوت خورے آئے ہوں گے۔ مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں تو اس کے دل میں بڑی قدر ہوئی اور اس نے مولانا کو بلایا اور اشتیاق ظاہر کیا۔ مولانا کی عادت تھی کہ کبھی کسی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رام پور گئے نواب صاحب کو خبر ہوئی تو مولانا کو بلایا مگر مولانا نہیں گئے اور یہ حیلہ کیا کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں آداب شاہی سے واقف نہیں خدا جانے کیا بے ادبی ہو جاوے۔ نواب صاحب نے کہا آپ

کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں۔ آپ تشریف لایئے ہم کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے مولانا نے جواب دیا کہ تعجب کی بات ہے اشتیاق تو آپ کو ہو ملنے کا۔ اور آؤں میں۔ غرض نہ گئے۔ باوجود ایسی آزادی کے رڑکی میں مجسٹریٹ سے ملنے سے انکار نہ کیا۔ کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔ اس نے مولانا سے بارش کی کمی کی وجہ پوچھی تو مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کردیا کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے۔

وہ بہت ہی محظوظ ہوا اور مولانا کے علم کا قائل ہوگیا اور بہت ہی اچھی طرح پیش آیا پھر مولانا سے رڑکی آنے کی وجہ پوچھی فرمایا دیانند سے مناظرہ کے لئے آیا ہوں۔ مگر وہ پہلے تو مناظرہ کی دعوت دیتا پھرتا تھا اب جو میں آگیا تو پیچھے ہٹتا ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا ہم اس کو بلاتے ہیں چنانچہ بلایا اور پوچھا کیوں مناظرہ نہیں کرتے کہا فساد کا خوف ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا فساد کے ہم ذمہ دار ہیں۔ دیانند نے کہا میں اس ارادہ سے نہیں آیا ہوں مولانا نے کہا ارادہ فعل اختیاری ہے اب کر لیجئے مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ آخر بھاگ گیا۔ یہ شان ہے علماء کی کہ نہ تذلل کہ خواہ مخواہ نواب سے ملیں اور نہ تکبر کہ مجسٹریٹ سے بھی نہ ملیں۔ ضرورت دین کی وجہ سے ملے اور دنیا کی ضرورت کے لئے کبھی کسی بڑے سے بڑے کو بھی نظر میں نہ لائے۔ (ص ۱۲۰ جلد چہارم حسن العزیز)

عجیب مہمان نوازی

(۲۱) فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب کی کسی لوہار نے دعوت کی اور وقت پر بارش ہونے لگی مولانا خود کمبل اوڑھ کر پہنچے اور کھانا بھی یہ تھا کہ فقط دال ساگ پکایا تھا وہی بخوشی کھالیا۔ (ص ۱۶۰ حسن العزیز جلد چہارم)

کمالات حضرۃ نانوتوی

(۲۲) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے رام پور افغاناں میں وعظ کہا اس میں جزلا یتجزی کا ثبوت دیا۔ اذا وقعت الواقعة لیس لوقعتها کاذبة سے اور علی

الاعلان کہا کہ میں معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں۔ مولانا کا علم لدنی تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ مولانا میں وہبیت کے ساتھ ذکاوت بھی غالب تھی۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس سے ہمارے مجمع کا کوئی آدمی کم اتفاق کرے گا۔ مولانا میں حق تعالیٰ نے بہت سے اوصاف جمع کر دیئے تھے۔

شرمگیں ایسے تھے کہ نکاح کے بعد کسی نے غسل جنابت کرتے نہیں دیکھا سرد سے سرد موسم میں بھی قصبہ سے باہر جا کر تالاب میں نہاتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کسی نے میرے سامنے پوچھا کہ مولانا کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے۔ فرمایا کئی سبب جمع ہو گئے۔ مولانا میں یہ کمالات یکجا ہونے کے ایک خلقۃً مزاج کا معتدل ہونا کیونکہ حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے نفس کامل فائض ہوتا ہے دوسرے استادان کو کامل ملے۔ جیسے مولانا مملوک علی صاحب کہ ہر فن کے محقق اور طرز تعلیم میں بے مثل تھے۔ تیسرے پیر کامل تھے۔ چوتھے قدرتی طور پر مولانا میں ادب بہت تھا اور جتنا ادب زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی فیضان زیادہ ہوتا ہے۔ پانچویں تقویٰ کامل تھا۔ ادب اس قدر تھا کہ اللہ کا نام لینے والے بدعتیوں سے بھی نہ الجھتے۔

ایک بزرگ کا اکرام

ٹھسکہ ایک مقام ہے وہاں کے ایک بزرگ مولانا محمد قاسم صاحب کے یہاں آئے وہ اہل سماع میں سے تھے مگر دوکاندار نہ تھے۔ مولانا نے فوراً ایک روپیہ نذر کیا اور خدام سے کہہ دیا۔ بدعت کا ذکر مطلق نہ کرنا کیونکہ مہمان کو رنج ہوگا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو کھانا شاہ صاحب کو تو خدام سے کھلوایا اور ان کے سائیسوں کو خود کھلایا (ان کے سائیس بھنگی تھے) چلتے وقت شاہ صاحب نے فرمایا کہ درویش آپ ہی ہیں اور ہم تو محض نقال ہی ہیں۔ یہ قصہ مولانا گنگوہی نے سنا تو فرمایا اچھا نہیں کیا۔

من وقر اھل بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام حدیث ہے کسی نے یہ مقولہ حضرت کا وہاں جا نقل کیا تو مولانا نے کہا یہ تو بدعتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے تو وفد بنی ثقیف کا جو کہ کافر تھا اکرام کیا پھر یہ جواب حضرت نے سنا تو فرمایا غور نہیں فرمایا مولانا نے اکرام کافر سے فتنہ نہیں ہوتا اور اکرام بدعتی سے فتنہ ہوتا ہے پھر اس شخص نے یہ خبر مولانا کو پہنچائی تو اس کو ڈانٹ دیا اور کہا جاؤ تمہیں کیا پڑی یہ باہمی تصفیات تھے ان حضرات کے اور وہ شان علم تھی۔ باہم علمی اختلاف رہا اور جب وہ بڑھنے لگا فوراً روک دیا۔ مولانا گنگوہی پر نقشبندیت کی شان غالب تھی اور مولانا پر چشتیت کی اور یہی چشتیت حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ پر غالب تھی۔ خواجہ صاحب (حضرت عزیز الحسن صاحب جامع ملفوظات) نے عرض کیا اور حضور (حضرت سیدی مرشدی شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہ میں اعتدال ہے فرمایا کچھ نہیں ہے پھر فرمایا کمال تو اہل کمال ہی میں ہوتا ہے مگر الحمد للہ ہم نے اہل کمال کو دیکھا ہے اور اب بھی ان کے قائم مقام حضرات غنیمت ہیں۔

چونکہ شد خورشید مارا کرد داغ چارہ نبود برمقامش از چراغ

پھر فرمایا کہ ظاہر میں ہے تو بے ادبی مگر بعضے متاخرین بعضے متقدمین سے افضل ہیں۔ کمال کسی پر ختم نہیں یہ نبوت تھوڑا ہی ہے جو ختم ہو جائے۔ مجھے مولانا گنگوہی کے ساتھ زیادہ عقیدت ہے بہ نسبت مولانا کے اور بعض لوگ اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں۔ مولانا گنگوہی کی شان سلف کے بہت مشابہ ہے زمانہ میں متاخر سہی مگر حالات وہی ہیں جو سلف کے تھے جیسے۔

حضرت سید الطائفہ کا مقام

حضرت حاجی صاحب کہ اکابر سلف کی شان رکھتے تھے مثل جنید وغیرہ حضرات کے۔ حضرت حاجی صاحب کو وہ کمالات حق تعالیٰ نے دیئے تھے کہ نظیر ملنا مشکل ہے اور حضرت کے حالات شروع ہی سے عالی تھے۔ حضرت جوانی میں ہندوستان سے تشریف لے گئے اسی زمانہ میں حضرت کی شہرت امراء اور غرباء اور بیگمات تک میں سب میں ہو چکی تھی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء حالانکہ حافظ ضامن

صاحب حضرت کے معاصرین میں بھی بعض کمالات زائد تھے۔ ان حضرات کے سامنے حضرت سے کرامتیں بھی صادر ہوئی تھیں۔

ایک کرامت

ایک دفعہ حضرت کے یہاں مہمان بہت سے آ گئے کھانا کم تھا۔ حضرت نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو کھانے پر ڈھانک دو کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھا لیا اور بچ بھی رہا۔ یہ کرامت تو کمال ہی ہے دوسرا کمال دیکھئے کہ حضرت حافظ صاحب کو خبر ہوئی تو بطور اعتراض فرمایا کہ اب کیا ہے آپ کا رومال سلامت چاہیئے اب قحط کیوں پڑنے لگا اور انتقاص رزق میں جو حکمتیں ہیں اب وہ سب معطل ہو جائیں گی تو حضرت بہت شرمندہ ہوئے اور فرمایا واقعی خطا ہوئی۔ توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا یہ ہے کمال کہ جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں وہ ان کے نزدیک توبہ کرنے کے لائق ہے۔ حافظ صاحب بھی بڑے شخص تھے۔

حافظ ضامن کا اتباع سنت

حافظ صاحب کا ایک مقولہ ہے جس کو حضرت گنگوہی نے بے حد پسند کیا وہ یہ کہ ذکر ہوا کہ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ کھانا کھانے میں ہر لقمہ پر بسم اللہ کہے اس پر حافظ صاحب فرماتے ہیں ہمیں تو طریقہ سنت زیادہ پسند ہے کہ اول میں ایک دفعہ بسم اللہ کہہ لی اور اخیر میں الحمد للہ کہے۔ اس سے زیادہ ثابت نہیں ان حضرات کو سنت کے ساتھ کس قدر عشق ہے اور حافظ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ذکر میں ہمیں تو صرف یہ نیت اچھی لگتی ہے جس کا وعدہ قرآن شریف میں ہے۔ **فاذکرونی اذکرکم** اور واقعی یہی بات ہے اس میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اس کا معتقد کبھی بددل نہ ہوگا۔

اکابر کی مختلف شانیں

مولانا محمد قاسم صاحبؒ میں شان ولایت کا رنگ غالب تھا اور مولانا گنگوہیؒ

میں شان نبوت کا۔ مولانا محمد قاسم صاحب سے حضرت حاجی صاحب کو بہت محبت تھی اور حضرت کے پاس تو جو کوئی جاتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ سب سے زیادہ خصوصیت حضرت کو میرے ہی ساتھ ہے۔ حضرت مرید ہر شخص کو کر لیتے تھے بجز اس شخص کے جس کا پیر زندہ ہو اور اہل حق میں سے ہو۔

مجسمہ رحمت کی تواضع

حق تعالیٰ نے حضرت کا وجود رحمت مجسم بنایا تھا بی بی ایسی دی تھی کہ ان بی بی خیر النساء میں اور حضرت حاجی صاحب میں صرف فرق ذکورت وانوثت کا تھا۔ ورنہ بڑی کاملہ تھیں۔ مثنوی کی عالم تھیں مثنوی انہوں نے اور حضرت نے ایک ہی بزرگ سے پڑھی تھی۔ بیعت کے متعلق حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دو وجہ ہیں کہ میں کسی کو انکار نہیں کرتا ایک تو یہ کہ وہ کہیں بے جگہ نہ پھنس جاوے دوسرے یہ کہ معلوم نہیں عند اللہ کون بہتر ہے ممکن ہے کہ کوئی مجھ سے اچھا ہو اور ہاتھ میں ہاتھ دینے سے قیامت میں اسی کا ہاتھ مجھ کو کھینچ لے۔ سبحان اللہ کیا تواضع ہے حضرت اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب حافظ قرآن بھی تھے۔ (اس وقت حضرت والا پر حضرت حاجی صاحب کے ذکر سے ایک خاص اثر تھا) (ص ۱۶۹ تا ۱۷۲ احسن العزیز جلد چہارم)

دین کی اہمیت

(۲۳) ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشا کے وقت ایک مسئلہ پوچھا آپ نے اس کا جواب دیا۔ مستفتی کے چلے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے۔ آپ نے فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور مستفتی کو تلاش کرنا شروع کیا لوگوں نے عرض کیا رات زیادہ ہوگئی ہے آپ آرام فرمائیے۔ ہم صبح ہونے پر اس کو بتلا دیں گے لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا اور اس کے مکان پر تشریف لے گئے گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا کہ ہم

نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا اور وہ اس طرح ہے۔ جب یہ فرما چکے تب چین آیا اور واپس آ کر آرام فرمایا۔
(امثال عبرت جلد اول نمبر ۹)

معیت حق کا رعب

(۲۴) فرمایا کہ نرم مزاج اہل اللہ میں بھی رعب ہوتا ہے چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نہایت نرم مزاج تھے مگر جب تک وہ نہ بولیں کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور جب وہ گفتگو شروع کر دیتے تھے تو پھر لوگ مزاح تک کرتے تھے۔ یہ رعب معیت حق کا ہوتا ہے حدیث میں ہے انا جلیس من ذکرنی (ص ۱۲۷ جلد دوم حسن العزیز)

اساتذہ کی بے ادبی کا انجام

(۲۵) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے روافض کے حفاظ نہ ہونے کی ایک لطیف وجہ بیان فرمائی کہ عادۃ اللہ تعالیٰ جاری ہے کہ اساتذہ کی بے ادبی سے علم نہیں حاصل ہوتا چونکہ حضرات صحابہ قرآن مجید کے اساتذہ اور نقل کرنے والے ہیں لہذا ان کی گستاخی کا یہ وبال ہے کہ حفظ قرآن سے محروم ہیں۔ (ص ۵۰ م نمبر ۲۷ اخبرت حصہ سوم)

شان حضرت نانوتوی رحمہ اللہ

(۲۶) مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اتتہ الدنیا وھی راغمۃ کا مصداق دیکھا مولانا محمد قاسم صاحبؒ حجرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ بڑے بڑے معزز لوگ نواب و رؤسا زیارت کو حاضر ہوتے تھے وہاں کسی سے پوچھا کب تشریف لائیں گے۔ اس نے کہا اب تھوڑی دیر میں نکلیں گے حجرہ کے آگے ایک چٹائی بچھی تھی جس پر کبھی جھاڑو نہیں ہوئی تھی۔ سیروں گرد پڑی ہوئی تھی۔ وہاں بھلا کیوں جھاڑو ہوتی جن کا مذاق یہ تھا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ جو مسجد میں دبا دبا کر جھاڑو دیتے ہیں ہمیں بھلا نہیں معلوم ہوتا اتنا تو

کرے کہ خدا کے سامنے خاکساری کی شکل تو بنالے وہ سجدہ ہی کیا ہوا جس میں ماتھا اور ناک مٹی میں نہ بھرے۔ بس کچی زمین ہو مٹی ناک کو ماتھے کو ہاتھوں کو اور تمام موضع سجدہ کو لگتی ہو۔ ہمارا تو اسی میں جی بہلا ہوتا ہے تو جن کا یہ مذاق ہو ان کی چٹائی پر کون جھاڑو دے وہ روٴسا اسی چٹائی پر بیٹھ جاتے تھے اور کھلی آنکھوں نظر آتا تھا۔ اتتہ الدنیا و ھی راغمۃ (اس کے پاس دنیا ناک رگڑتی ہوئی آتی ہے ۱۲) کہ اہل دنیا خاک آلودہ ہوتے تھے۔ (روح الافطار نمبر ۴)

ذہانت

(۲۷) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ بہت ذہین تھے صدرا الشمس بازغہ کا کبھی ترجمہ نہیں کیا نہ مطالعہ ایسا پڑھتے تھے جیسا تلاوت ہو رہی ہو۔ (لمعان الدین ص ۱۶ ام نمبر ۴۸)

علمی شان

(۲۸) فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا مگر مولانا کا علم ان کے رسائل سے ملاحظہ فرمالیجئے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے ایک مضمون نیا بیان کیا کسی نے حاضرین میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے بھی بیان فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کی برابر کھلتا تھا ہمارے لئے سوئی کے ناکہ کی برابر کھلتا ہے۔ (ص ۵ انفی الحرج)

واعظ کون ہو

(۲۹) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے ایک محقق کا اور ایک بے حیا کا اور اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں۔ اور صاحبو یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے

ہر واعظ زبان سے کہہ دے مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولانا بے بناوٹ کہتے تھے کیونکہ ان کو کمالات حقیقہ کا مبلغ معلوم تھا اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے اور ہماری یہ حالت ہے۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاست زمین و آسمان وے ہماں ست

تربیت اولاد

(۳۰) ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس بھی کپڑوں کی گٹھڑی نہ تھی نہ کوئی تنک بکس تھا ایک مرتبہ کسی شخص نے مولانا کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی خود نہیں کہا فرمایا ہاں تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا۔

ایسا دماغ بگڑا ہے اب یہ تکلف سوجھے گا۔ دیکھو تو کیسی ٹوپی پہنتا ہوں اور ان کے کپڑوں کی گٹھڑی دیکھی۔ تقدیر سے صاحبزادے کی گٹھڑی بھی بھڑکدار نکلی بس آگ بگولہ ہو گئے کہ اوہو اس بھڑکدار گٹھڑی میں آپ کا لباس رکھا جاتا ہے یوں کپڑے تہ ہوتے ہیں یہ اچکن بھی تہ ہوا رکھا ہے۔ غرض سب کپڑوں کو کھول کھول کر صحن میں پھینک دیا۔ (وعظ ازالۃ الغین ص ۳۵ سلسلہ التبلیغ نمبر ۱۴۶)

فنا فی اللہ کی شان

(۳۱) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ مغلوب الحال و مغلوب الاخلاق تھے۔ اپنے شاگردوں کو مخدوم مکرم لکھتے تھے۔ پھر فرمایا کہ فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں۔ (حسن العزیز جلد دوم ص ۲۰۶ ملفوظ ۶۴۶)

ایک لطیفہ

(۳۲) مولانا فخر الحسن صاحبؒ گنگوہی کا لطیفہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ کہا کہ اگر مجھ کو سلطنت مل جائے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کو وزیر بناؤں۔ اور حضرت

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی نسبت کہا کہ ان کو جرنیل بناؤں غرضیکہ سب کے عہدہ وتجویز کرنے کے بعد کہا کہ میں بادشاہ ہوں۔

ایک صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا کوتو وزیر اور خود کو بادشاہ تجویز کیا۔ کہا میاں بادشاہ تو بیوقوف ہوتا ہے اور وزیر عاقل اس لئے بادشاہ ہونا میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور مولانا کو وزیر تجویز کیا ہے۔ (افاضۃ الیومیہ حصہ دوم ص ۲۴ نمبر ۳۶)

سادگی کی شان

(۴۴) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کی یہ حالت تھی کہ لباس ایسا پہنتے تھے جس سے کوئی نہ سمجھ سکے کہ یہ عالم ہیں نہ عبا پہنتے تھے نہ چوغہ نہ ململ پہنتے تھے۔ نہ تنزیب بلکہ گاڑھا مارکین آپ کا لباس تھا اور اسی لباس سے آپ بڑے بڑے مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے مگر آپ کے سامنے سارے عبا اور جبے والے دھرے رہ جاتے تھے۔ آپ ہی کا نام چمکتا تھا اور کسی کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔

چنانچہ علمی شان اور حقیقی عزت مباحثہ شاہجہاں پور میں جو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا بڑے بڑے عبا قبا والے موجود تھے اور حضرت مولانا اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے مگر جب آپ نے تقریر کی ہے تو عوام پر اتنا اثر تھا کہ شاہجہان پور کے ہندو مہاجن اور بنئے یہ کہتے تھے کہ نیلی لنگو والا مولوی جیت گیا۔ ایسی تقریر کی جیسے دریا بہتا ہے کسی کو اس کی بات کا جواب نہیں آیا۔

نیز مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ سفر میں اپنا نام کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے اور ساتھیوں کو بھی ممانعت تھی کہ کسی پر نام ظاہر نہ کریں اور اگر کوئی آپ سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے فرماتے خورشید حسین کیونکہ آپ کا تاریخی نام یہی ہے مگر اس نام سے لوگ واقف نہ تھے اس لئے کوئی نہ سمجھتا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ یہی ہیں اور اگر کوئی وطن کا نام پوچھتا تو فرماتے الٰہ آباد نانوتہ کا نام نہ لیتے رفقاء نے کہا حضرت آپ کا وطن الٰہ آباد کدھر سے ہوگیا۔

یعنی یہ تو کذب ہے فرمایا کہ نانوتہ بھی تو خدا ہی کا آباد کیا ہوا ہے پس اخذ ہر بستی اللہ آباد ہے یعنی کذب لازم نہ آیا بلکہ یہ توریہ ہوا و فی المعاریض مندوحة عن الکذب مگر باوجود اس قدر اخفاء کے چھپے تھوڑا ہی تھے اللہ تعالیٰ ان کو پکارتے تھے۔ حضرات اہل اللہ کی عزت اتنی بڑی ہے کہ ان کو ظاہری اسباب شہرت وسامان شوکت کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ تو وہ کرے جس کو حقیقی عزت حاصل نہ ہو وہ اسباب عزت وسامان شہرت اختیار کیا کرتا ہے متنبی کہتا ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية وفی البداة حسن غیر مجلوب

الذی ظباء ثلاة ماعرفن بها مضغ الکلام ولا مبغ الحواجیب

ولا برحزن من الحمام مائلة او راکهن صقبلات العراقیب

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

(وعظ الفاظ القرآن ص ۲۰)

روایت ودرایت کا رنگ

(۳۵) فرمایا مولانا عبدالحئیؒ صاحب لکھنوی کو ہمارے بزرگوں سے بہت تعلق تھا چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ جب مرض وفات سے بیمار ہوئے تو مولانا کی طبیعت ککڑی کھانے کو چاہی اس کی خبر کسی طرح مولانا عبدالحئی صاحب کو بھی ہو گئی تو مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے لکھنو سے بڑے اہتمام سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے لئے ککڑیاں بھیجیں۔ اسی طرح جب مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے کتاب تحذیر الناس لکھی تو سب نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی مخالفت کی مگر مولانا عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ نے موافقت میں رسالہ لکھا مگر دونوں رسالوں میں یہ تفاوت ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کے رسالہ میں درایت کا رنگ غالب ہے اور مولانا عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ کے رسالہ میں روایت کا رنگ۔ (القول الجلیل ص ۳۰ م نمبر ۲۰)

زمانہ طالب علمی کی حکایت

(۳۶) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب رحمہا اللہ کی حکایت سنی ہے کہ یہ حضرات جب دہلی میں پڑھتے تھے تو آپس میں مزاحاً ایک دوسرے سے کہتے کہ میاں کیا بات ہے کہ ہم ان بڈھوں سے کسی بات میں کم نہیں بلکہ ہمارا علم تو تازہ ہے اور ان بڈھوں کا علم پرانا ہو گیا پھر ہم ذہین بھی ان سے زیادہ ہیں مگر پھر بھی جوان کی قدر ہے ہماری نہیں ان کے سامنے ہم کو کوئی پوچھتا ہی نہیں یہ کیا بات ہے دوسرے صاحب کہتے کہ میاں ذرا ان بڈھوں کو کھسکنے دو بس پھر تو ہم ہوں گے اور تم ہو گے۔ (قلت و قد کان کما تفرسا رضی اللہ عنہما)

(وعظ اجر الصیام)

حُجّة الاسلام

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے واقعات

(حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے خطبات سے ماخوذ)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی بصیرت

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مظفر نگر میں ایک تھانیدار معتقد تھا ایک دن اس نے حضرت مولانا نانوتویؒ کی دعوت کی مولانا نے دیکھا تھا کہ تھانیدار کی کمائی مشتبہ اور مشکوک ہے اس وجہ سے اس کی دعوت کو نامنظور فرمادیا۔ تھانیدار نے دعوت قبول نہ کرنے کی وجہ معلوم کی تو حضرت نے فرمایا میں معذور ہوں۔ اس نے کہا کہ اگر آپ بیمار ہوں تو علاج کرادوں۔

حضرت نے فرمایا نہیں کوئی اور عذر ہے۔ اس نے کہا اگر جانے میں تکلیف ہو تو سواری کا انتظام کردوں۔ حضرت نے فرمایا یہ مجبوری نہیں بلکہ دوسرا عذر ہے۔ اس نے پھر درخواست کی کہ کھانا آپ کے یہاں بھیج دوں۔ آپ نے انکار فرمایا اس نے عرض کیا میں خود حاضر ہوکر کھانا پیش کروں گا۔ حضرتؒ نے صاف انکار فرمادیا۔ وہ تھانیدار ایک دم غصہ ہوگیا اور کہا کہ آپ نہ بزرگ ہیں اور نہ نیک کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے دعوت قبول کرو اور آپ قبول نہیں کرتے۔ اس پر مولانا نانوتویؒ نے فرمایا کہ جو عیوب تو نے بیان کئے ہیں ان سے زیادہ عیوب کا مرتکب اور مستحق ہوں۔ اس وقت تھانے دار کو ہوش آیا اور سوچا تو معلوم ہوا کہ حضرت میری دعوت میرے مال کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے رد فرما رہے ہیں۔ اس نے اسی دن سے

تھانیداری چھوڑ دی۔ کچھ دنوں بعد پھر دعوت کی اور عرض کیا کہ:

''حضرت! اب میری اپنی جائیداد کی حلال کمائی ہے آپ کی دعوت کرتا ہوں''

مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے دعوت منظور فرمائی اور اس سے فرمایا کہ ''ملازمت بھی کرو لیکن دیانتداری سے کام لو کیونکہ تھانیداری کرنا دیانت داری کے ساتھ تمام بھلائیوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ محتسب کے درجہ میں تھانے دار ہوتا ہے''

ف: پس معلوم ہوا کہ امر بالمعروف کیلئے حکمت عملی اور نرمی کا ہونا ضروری ہے۔

(فلسفہ نماز و تبلیغ ص ۱۹، ۲۰)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا کمال ادب

مدینہ منورہ میں جب روضہ مبارک نظر آتا تھا تو جوتہ پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے چونکہ ادب غالب تھا' اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابرین اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینار نظر آنے لگتے ہیں اس آخری منزل کا نام ہے ''بیر علی'' یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے منارے سامنے آجاتے ہیں تو یہ قافلہ جب ''بیر علی'' پر پہنچا اور حرم شریف کے منارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر زمین پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جا رہے تھے۔ مدینہ کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں پیروں میں ایسی چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہو گئے مگر حضرت محبت اور عشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔ دیکھا

بھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم چل کر رک گیا کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا ہی مشکل ہے۔

مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ تو معذور ہے اسے تو کچھ خبر ہی نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش وحواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون خرابہ بھی ہو گئے تو در محبت تلخہا شیریں بود یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔ (خطبات طیب)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے حلم کا بے نظیر واقعہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (م ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) تحریر فرماتے ہیں۔ ’’اس سلسلہ میں مجھ تک جو واقعہ پہنچا ہے وہ عرض کرتا ہوں، مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاوڑ ضلع میرٹھ نے بیان کیا اور انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پھلاودہ ضلع میرٹھ سے سنا جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں ایک زبردست عالم تھے۔

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت نانوتویؒ مباحثہ شاہجہان پور کے لئے روانہ ہوئے تو شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب سنیوں نے (جو مقامی شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے بے بس تھے۔

کیونکہ زمیندارہ شیعوں ہی کا تھا) حضرت کو لکھا کہ جاتے یا آتے حضرت والا اس گاؤں کو اپنے قدوم سے عزت بخشیں اور ہمیں کچھ پند ونصیحت فرمادیں۔ تاکہ ہمارے لئے اصلاح وفلاح اور تقویت کا باعث ہو۔

حضرت والا نے بخوشدلی ان کی دعوت منظور فرمالی۔ جیسا کہ غرباء کی دعوت و پیشکش بطوع ورغبت قبول فرمانے کی عادت تھی۔ اور جاتے یا آتے ہوئے اس گاؤں میں اترتے۔ شیعوں میں اس سے کھلبلی مچی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تنظیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے متوقع اثرات کی کاٹ کے لئے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر یہ چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیے گئے کہ اثنائے وعظ میں اس طرح کئے جائیں کہ اول فلاں سمت کا مجتہد دس اعتراض کرے اس سے حضرت نمٹیں تو دوسرے کونہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں مبتلا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔

اب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سنی ہو گئے۔

مجتہدین اور مقامی شیعہ چوہدریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرت والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آ کر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔

پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ اک دم اٹھ

کھڑا ہو، اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟

شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرمالیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے "ہونہہ" کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سسکار دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی غصے کے لہجہ میں فرمایا کہ "اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔"

دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا، اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خود ان کی سبکی اور سبکی ہی نہیں سب کی موت آگئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔" (جواہر پارے)

دنیا استغنا سے آتی ہے

حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ جو کہ بانی دارالعلوم دیوبند ہیں کا واقعہ ہے۔ حضرت رحمہ اللہ چھتہ کی مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ شیخ الٰہی بخش صاحب میرٹھی جو لکھ پتی لوگوں میں سے تھے اور حضرت رحمہ اللہ کے معتقد تھے، ملنے کے لیے آئے اور بہت بڑا ہدیہ لے کر آئے، دو تھیلیاں جس میں اشرفیاں اور ہزاروں روپے کا مال تھا مگر دل میں یہ سوچتے ہوئے آئے کہ حضرت کو آج اتنا بڑا ہدیہ دوں گا کہ اب تک کسی نے نہیں دیا ہوگا۔ تو اپنے ہدیہ کے اوپر ایک فخر کی کیفیت موجود تھی۔

مگر پیش اہل دل نگہ دارید دل تا نہ باشد از گماں بہ خجل

اہل اللہ کے سامنے دل تھام کے جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں احساس پیدا کردیتا ہے کہ فلاں کے دل میں کیا چیزیں کھٹک رہی ہیں۔ وہ علاج بھی کرنا جانتے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ کے دل میں اس کا ادراک ہوا کہ ان کے دل میں فخر و ناز کی کیفیت ہے۔ یہ بڑی چیز سمجھ رہے ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ حجامت بنوا رہے تھے اب وہ بیٹھ تو سکتے نہیں تھے جب تک کہ حضرت اجازت نہ دیدیں تو کھڑے رہے اور ہاتھ میں دونوں تھیلیاں ہیں، ان میں وزن تھا کھڑا ہوا نہیں جاتا اور کپکپا رہے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں تو حجامت بنواتے ہوئے چہرہ کو نیچے کردیا۔ دیکھا ہی نہیں کون آیا؟ تجاہل عارفانہ کے طور پر، پھر دائیں طرف کو منہ پھیرا تو وہ پشت کی طرف سے چکر کھا کر دائیں طرف آئے تو آہستہ سے بائیں طرف منہ پھیرلیا، پھر وہ ادھر کو آئے تو ادھر کو منہ پھیرلیا، غرض ان کو اسی طرح چکر دیئے۔ یہاں تک کہ حضرت رحمہ اللہ حجامت سے فارغ ہوگئے تب ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سلام عرض کیا، حضرت نے معمولی جواب دیا، رسمی مزاج پرسی کے بعد بیٹھ گئے اور وہ ہدیہ پیش کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ کو ضرورت نہیں ہمیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر حضرت قبول نہ فرمائیں یا حاجت مند نہ ہوں تو طلبہ کو تقسیم کردیں۔ فرمایا کہ الحمد للہ! میری آمدنی ساڑھے سات روپے مہینے کی ہے اور میرے گھر کی ساری ضروریات اس میں پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی روپیہ آٹھ آنہ بچ جاتا ہے تو میں پریشان رہتا ہوں کہ کہاں رکھوں گا؟ کس طرح حفاظت کروں گا؟ کسے بانٹوں گا؟ میں حاجت مند نہیں ہوں۔ آپ واپس لے جائیں، انہوں نے کہا کہ حضرت طلباء کو تقسیم کردیں۔ فرمایا کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں طلبہ کو بانٹوں؟ آپ ہی جا کر تقسیم کردیں، غرض انہوں نے مختلف عنوانوں سے چاہا کہ قبول فرمادیں مگر حضرت نے قبول نہیں فرمایا۔

لیکن اس زمانے کے رئیس غیرت دار تھے تو یہ غیرت آئی کہ یہ مال پھر اپنے گھر کو واپس لے جاؤں تو وہاں سے اُٹھے، مسجد کی سیڑھیوں پر حضرت کی جوتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ان جوتیوں میں وہ روپیہ بھر کر روانہ ہو گئے۔(غالباً جوتیوں کے اوپر نیچے روپے ڈال دیئے ہوں گے) حضرت اُٹھے اور جوتیوں کی تلاش ہوئی، جوتے نہیں ملتے۔ اِدھر اُدھر سب جگہ دیکھا حافظ انوار الحق صاحب حضرت کے خادم تھے۔انہوں نے دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت جوتیاں تو روپوں میں دبی ہوئی یہاں پڑی ہیں۔ فرمایا:"لاحول ولا قوة الا بالله" آئے، آ کر ان جوتیوں کو جھاڑا جیسے مٹی جھاڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد جوتے پہن کر روانہ ہو گئے۔ وہ روپیہ مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا رہا۔ حافظ انوار الحق مرحوم ساتھ ساتھ تھے، تھوڑی دور آگے جا کر مسکرا کر دیکھا تو حافظ جی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، حافظ جی دیکھا آپ نے؟ دُنیا ہم بھی کماتے ہیں دُنیادار بھی کماتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ دُنیا ہماری جوتیوں میں آ کر گرتی ہے، ہم ٹھوکریں مارتے ہیں اور دُنیادار دُنیا کی جوتیوں میں جا کے سر گڑتے ہیں، وہ ان کو ٹھوکریں مارتی ہے، تو کماتے ہم بھی ہیں دُنیادار بھی۔ فرق اگر ہے تو عزت اور ذلت کا فرق ہے۔"غناء" اور "احتیاج" کا فرق ہے۔(وعظ فلسفہ علم جلد اول)

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا کمال اتباع

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بزرگوں میں سے کسی نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہزاروں کا مجمع پیچھے ہے اور بھی ہزاروں لوگ ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دیکھا گیا، وہ بھی مجمع کے ساتھ ساتھ ہیں لیکن مجمع تیزی سے جا رہا ہے کہ جلدی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں اور مولانا آہستہ آہستہ دھیمی چال، سوچ سوچ کے قدم رکھ رہے ہیں جس کی وجہ سے مجمع سے بہت پیچھے رہ

گئے ہیں، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں دوڑے جارہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگئے ہیں، جلدی پہنچیں اور کسی طرح زیارت نصیب ہو، جاتو آپ بھی رہے ہیں مگر قدم ٹٹول ٹٹول کے۔

فرمایا کہ ہاں، میں چاہتا ہوں کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم پڑا ہے، میں بھی وہاں قدم بہ قدم، قدم رکھوں۔ اس کے دیکھنے میں دیر لگتی ہے، اس لیے میں آہستہ چل رہا ہوں۔ الحمدللہ! میرا ایک قدم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان سے الگ نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی نشان پہ قدم رکھتا ہوا جارہا ہوں۔ اگرچہ دیر میں پہنچوں گا۔ گویا وہ ان کی اتباعِ سنت کی چیز تھی جو خواب میں دکھلائی گئی۔

مسلمانوں میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہو بہو نقشہ تو ہم نہیں اُتار سکتے۔ ہماری ایسی قسمت کہاں؟ مگر اپنا کام سعی اور جدوجہد کرنا ہے۔ دل میں تڑپ پیدا ہو جائے، اگر تڑپ پیدا ہوگئی تو ممکن ہے اللہ پوری پیروی نصیب کردے ورنہ جتنی بھی نصیب ہو جائے، اس جذبہ کی وجہ سے ہمیں نجات ہونے کی توقع ہے۔ (وعظ رحمۃ للعالمین جلد دوم)

نسبت کا احترام

ایک دفعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مرادآباد تشریف لے گئے اور جانا آگے تھا، مرادآباد بھی ٹھہرے، پروگرام میں حضرت نے صرف ایک دن رکھا تھا، لوگوں نے اصرار کیا مگر آپ نے انکار فرمادیا تو علماء کا طبقہ جمع ہوکر آگیا کہ ٹھہر جائیں، انکار کردیا کہ نہیں ٹھہروں گا، پھر بعض امراء جمع ہوکر آگئے۔ امراء سے کہا کہ جب علماء کی نہ سنی تو آپ کی کیسے مانوں؟ مرادآباد کے لوگوں کے دل میں ٹھن گئی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھہراؤ، تو ایک نے مشورہ دیا کہ ان کو ٹھہرانے کی ایک ہی صورت ہے۔ فلاں دفتر میں ایک کلرک لڑکا چودہ پندرہ سال کا ہے، اسے بلا لاؤ، وہ ٹھہرا سکے گا۔ جب وہ آیا، حضرت رحمتہ اللہ علیہ ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہوگئے، جھک کر

مصافحہ کیا اور اپنی جگہ پر اس کو بٹھا دیا، خود مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کہ حضرت جی چاہتا ہے کہ کچھ ٹھہر جائیں، فرمایا بہت اچھا، ٹھہر گئے اور اتنے ٹھہرے کہ ایک ہفتہ تک ٹھہر گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ حضرت اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک وہ لڑکا نہیں کہے گا، تب آکر اس نے اجازت دی۔

وہ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمہ اللہ تھے اور یہ لڑکا میاں جی مرحوم کا نواسہ لگتا تھا۔ تو شیخ کی نسبت کا اتنا ادب تھا کہ ان کے حکم کی وجہ سے وہیں رُک گئے، کسی کا حکم نہ مانا۔ یہ نسبت کا ادب تھا، شیخ کے بھی نہیں شیخ الشیخ کے نواسے تھے اور یہ ادب تب ہوتا ہے جب اصل شیخ کا ادب دل میں ہو۔ حتیٰ کہ وطن کی نسبت کی وجہ سے شیخ کے وطن کے ساتھ شریف لگاتے ہیں، دیوبند شریف، نانوتہ شریف، مکہ شریف۔ تو وہ شریف کا لفظ تعظیم کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نسبت کا ادب اور عظمت یہ کوئی غیر شرعی چیز نہیں۔ (وعظ ادب اور اختلاف رائے جلد سوم)

مقابلہ کمال میں ہوتا ہے

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جو میرے دادا بھی ہیں، ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی، جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ وہ یوپی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آکر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلہ میں مناظرہ کرنے کے لیے آئے، اور یہ بھی اعلان کیا کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔ مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ، ان سے میں مقابلہ کروں گا۔ حضرت رحمہ اللہ اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرت رحمہ اللہ یہ صورتِ حال ہے۔ اس لیے آپ ہی کو آنا ہوگا کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولبی کاسم سے مناظرہ ہوگا۔ اسی بیماری کی حالت میں حضرت رحمہ اللہ تشریف

نے گئے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں۔ جب حضرت رحمہ اللہ پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے، بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب، حضرت رحمہ اللہ کے خادمِ خاص تھے۔ یہ بڑے ذہین و ذکی تھے۔ حضرت رحمہ اللہ نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کرو کہ کن احوال اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔ کیا صورت اختیار کی جائے گی تا کہ پھر مناظرہ ہو سکے۔ منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوہ پوری، ترکاریاں اور بہت کچھ۔ غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا، وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی، انہیں خیال گزرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا، ایک آدمی آخر کتنا کھا لے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ اس لیے یہ انتظار میں کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی، وہ بالکل خالی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے، ایک آدمی اتنا تھوڑا ہی کھا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کو اندر بلایا گیا؟ دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔ یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے ہیں، ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو، لوگ کھا کے اِدھر سے نکل گئے ہوں مگر وہاں تو کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے، لوگوں نے کہا کہ نہیں اور تو کوئی شریک نہیں تھا۔ اب یہ حیران ہوئے کہ یہ آدمی ہے، یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)۔

جب واپس آئے، انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ کو شرائط بتلائیں۔ اس کا سنانا تو

مقصود نہیں ہے لیکن جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آئے اپنے ہم جولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت رحمہ اللہ کے شاگرد اور ان کے ساتھی تھے، سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہو گیا، بڑی پریشانی ہوگئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہوگا، ہمارے حضرت رحمہ اللہ ان شاء اللہ جیتیں گے، اس لیے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہوگا تو علم میں ہمارے حضرت رحمہ اللہ سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لیے حضرت رحمہ اللہ ہی غالب آئیں گے لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی، لوگ ہنس کے چپ ہو گئے۔ شدہ شدہ بات حضرت رحمہ اللہ کے پاس پہنچ گئی۔

حضرت رحمہ اللہ نے انہیں بلایا اور فرمایا، منشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ یہ بے چارے بہت گھبرائے، اس لیے کہ مذاق کی بات تھی، اپنے دوستوں میں کر دی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش، کہیں تو کیا کہیں؟ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو تم نے کہا میں سن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لیے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا، کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو ان شاء اللہ ہمارے حضرت رحمہ اللہ غالب آئیں گے لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ اس لیے کہ پنڈت تو بیس سیر کا ملبہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ کیا سارے مناظروں کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لیے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا میں تم کو آگے کر دوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کون جیتے گا؟ فرمایا کہ کھانا بہائم اور جانوروں کی علامت ہے تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے، ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو۔

اور فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ فرمایا اس کے لیے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہوگا وہ حق پر ہوگا۔ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے، جو جہالت کا سرچشمہ ہیں اور نہ کھانا، یہ فرشتوں کی عادت ہے، جو علم کا سرچشمہ ہیں اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے، جہالت میں نہیں ہوا کرتا، جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے۔ علم میں مناظرہ ہوا تو ہم مناظرہ کریں گے۔ (وعظ مقصد حیات جلد دوم)

اولیاء اللہ میں بزرگی کی دو شانیں

میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کا واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اور ان کے طبقے کے اور بہت سے بزرگ رام پور ضلع سہارن پور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، وہاں جمع ہوئے، کسی ایک جگہ دعوت میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت اور شان یہ تھی کہ زہد اور ترک دُنیا انتہا درجے کا تھا۔ میرے تو جدامجد ہی تھے، گھر میں جو واقعات میں نے سنے، وہ یہ تھے کہ حضرت رحمہ اللہ کی مِلک میں ایک جوڑا کپڑے سے زیادہ نہیں تھا جو بدن پر ہوتا، گھر بار جائیداد سب دوسروں کے حوالے کر دی تھی، ان کی مِلک میں ایک جوڑا کپڑا جو بدن پر تھا، ایک قرآن شریف، ایک صحیح بخاری کا نسخہ اور فتوحات مکیہ کی جلد جو شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ چار چیزیں کل ان کی مِلک تھیں۔

کپڑے کا جوڑا جب پھٹ پھٹا کر پرانا ہو جاتا تھا اور اس درجے پر نہ آجاتا تھا کہ پہننے کے قابل نہ رہے تب دوسرا جوڑا بنتا تھا اور وہ جوڑا بھی گاڑھے کا، کوئی اعلیٰ لباس نہیں ہوتا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ بند دارا چکن بلا کرتے کے پہنتے تھے اور ایک جوڑا پائچے کا چوڑا پاجامہ جو پرانے زمانے میں لوگ پہنتے تھے اور ایک پرانی لنگی کندھے پر رہتی تھی، کپڑوں کو دھولیا اور سکھا کر پہن لیا، وہی ایک جوڑا تھا، جب تک وہ پھٹ کر بدن سے الگ نہ ہو جائے جب تک دوسرا جوڑا نہ بنتا تھا۔

تو رام پور کی جس دعوت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں حضرت رحمہ اللہ تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے کپڑا بہت پرانا ہو گیا تھا، پگڑی میں کچھ ڈورے بھی لٹک رہے تھے۔ یہ شان تو حضرت کی تھی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس دن اتفاق سے بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً پانچ سو روپے قیمت کا لباس ہوگا، بہترین جبہ اور بہترین عمامہ...... تو لوگوں کی جیسی عادت ہوتی ہے دعوت میں بیٹھ کر انہوں نے کچھ تبصرے شروع کر دیئے۔ ایک نے کہا کہ بھئی! مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ عالم بہت بڑے ہیں، باقی بزرگی سے کیا تعلق؟ بزرگ تو مولانا محمد قاسم صاحب ہیں جو بالکل تارک الدنیا ہیں، کپڑا لباس دیکھو تو انتہائی زہد و قناعت بزرگی کی شان تو ان میں ہے اور یہ تو پانچ سو روپے کا جوڑا پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

گویا عوام الناس ان بزرگوں کو لباس سے پہچانتے ہیں، لباس اچھا ہے تو بزرگی ندارد ہے، لباس پھٹا ہوا ہے تو بزرگی موجود ہے، یہ ایک سطحی سی چیز ہے مگر بہر حال لوگوں نے یہ تبصرہ شروع کیا۔ یہ بھنک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پڑ گئی۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا چہرہ یہ چیز سن کر غصے سے سرخ ہو گیا اور اُس شخص سے فرمایا کہ: ”جاہل! تو کیا جانے کہ بزرگ کسے کہتے ہیں تو نے کپڑوں کو دیکھ کر بزرگی سمجھی ہے؟ کپڑوں کے معیار سے تو بزرگی کو پرکھتا ہے؟“ فرمایا: ”میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ پھٹا پرانا لباس نہ پہنوں، میرا نفس اپنے آپ سے

، ہر ہو جائے، اس لباس نے اسے روک رکھا ہے۔“

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”یہ شخص وہ ہے کہ اگر ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تو بھی اس شخص کے نفس میں تغیر نہیں ہوگا نہ اس کے دل میں کوئی پھول پیدا ہوگی نہ نفس پھولے گا، نہ غرور پیدا ہوگا۔ غنا کے اس درجے و مرتبے پر ان کا نفس پہنچ چکا ہے کہ بادشاہی تخت پر بٹھلا دو تب بھی یہ زاہد اور قانع ہیں، لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تب بھی ان کے قلب میں زہد و قناعت ہے۔“

تو حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں، تب بھی وہ ذاکر ہیں، ایک لاکھ کا لباس ہو تب بھی ذاکر ہیں۔ ذکر قلب کی شان ہے، قلب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، پھر اس کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کبار محدثین میں گزرے ہیں۔ امام کے رُتبے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لباس بہت فاخرہ اور ٹھاٹھ دار پہنتے تھے، لوگوں نے عرض کیا حضرت! بظاہر یہ زہد و قناعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا لباس پہنتے ہیں جیسے نوابوں کا۔ فرمایا: ”میں اس لیے پہنتا ہوں، اگر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لوں تو

”لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَتْ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ“

یہ امیر زادے اور بادشاہ زادے مجھے ناک پوچھنے کا رومال بنالیں میں اس لیے فاخرہ لباس پہنتا ہوں تاکہ بتلا دوں کہ جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہے، ہم تم سے مستغنی ہیں، کسی درجے میں تمہارے محتاج نہیں ہیں، میں اس نیت سے پہنتا ہوں۔“ تو اس نیت سے فاخرہ لباس پہننا یہ خود طاعت و عبادت ہے۔ اس لیے اہل اللہ کا کوئی قدم بھی طاعت و عبادت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ والوں میں بہت سے ایسے گزرے ہیں جو فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے لیکن بزرگی ایک قدر مشترک تھی یہاں بھی تھی وہاں بھی تھی۔ یہاں اور نیت سے تھی وہاں اور نیت سے تھی۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں لیکن بادشاہوں کی وہ شان نہیں ہوتی تھی جو ان کی شان تھی۔ مسند الگ تھی، صفائی ستھرائی الگ، خدام الگ کھڑے ہوئے ہیں، دروازوں کے اوپر دربان الگ موجود ہیں اور صفائی کا یہ عالم کہ اگر ایک تنکا بھی سامنے پڑا ہوا ہوتا تھا تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ فرماتے تھے "کوڑا کباڑ گھر کے اندر بھر رکھا ہے" بہت نزاکت تھی۔

بادشاہِ وقت نے ملنے کی آرزو کی، اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے بہت چاہا کہ مجھے اجازت مل جائے مگر اجازت نہیں تھی۔ آخر حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ کے خادمِ خاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تو ان کے دِل میں گھر کیے ہوئے ہے۔ تیرا معاملہ بہت رسوخ کا ہے، تو میرے لیے ایک پانچ منٹ کی مہلت لے لے۔

اس نے کچھ اُتار چڑھاؤ کر کے حضرت رحمہ اللہ سے عرض کیا تو پانچ منٹ کی اجازت ہوگئی کہ بادشاہ آ سکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت آئے، بہت ادب کے ساتھ دوزانو ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ نے کچھ نصائح فرمائیں۔ اس دوران میں حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ کو پیاس معلوم ہوئی تو خادم کو پانی لانے کے لیے اشارہ کیا۔ بادشاہ نے سمجھ لیا کہ پانی چاہتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا، اگر مجھے اجازت ہو؟ اجازت ہوگئی کہ اچھا تم پانی پلاؤ تو بادشاہ پانی لینے گئے تو گھڑے کے اوپر جو بڈولی ڈھکی ہوئی تھی، پانی لے کر جو اُسے رکھا وہ کچھ ٹیڑھی رکھی گئی۔ بس مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا۔

فرمایا: "تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں، تم بادشاہت کیسے کرتے ہو گے؟ ہٹو یہاں سے۔" اپنے خادمِ خاص کو حکم دیا کہ وہی پانی پلائے گا، اس شان کے بھی بزرگ گزرے ہیں، ان کی ولایت میں کوئی کمی نہیں۔ ولی کامل ہیں۔ ان کی نسبت وتصرف اور تربیت سے ہزاروں اولیاء بن گئے۔ ایک شان یہ ہے۔

اور ایک شان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے یہ بھی انہی کے ہم

عصر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مرزا مظہر جاناں رحمۃ اللہ علیہ یہ تینوں ایک قرن کے بزرگ ہیں۔

شاہ غلام علی صاحب رحمہ اللہ کا یہ حال کہ نہ گھر نہ دَر، نہ کپڑا نہ لتّا، زہد و قناعت اور فقر و فاقے اور اس پر مہمانوں کی یہ کثرت کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان ہر وقت اُن کے دسترخوان پر ہوتے تھے لیکن ظاہر میں ذریعہ معاش کچھ نہیں۔

ریاست ٹونک کے نواب، نواب میر خاں، وہ حضرت رحمہ اللہ کے مرید تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ کے ہاں تین تین سو، چار چار سو مہمان ہوتے ہیں۔

آخر یہ کہاں سے آتا ہوگا؟ بڑی تنگی اُٹھاتے ہوں گے، بڑی پریشانی ہوتی ہوگی تو ریاست ٹونک کا ایک ضلع جس کی ایک سال کی کئی لاکھ روپے آمدنی تھی، وہ پورے کا پورا حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں پیتل کے پتر پر لکھ کر بھیجا کہ میں آپ کو یہ ہدیہ کرتا ہوں تاکہ مہمانوں اور گھر والوں کا خرچ چلے، آپ اِسے خدا کے لیے قبول فرمالیں۔ شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُسی پتر پر جواب لکھا اور اس پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔ لکھا:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے، میری طرف سے انہیں کہہ دو کہ روزی مقدر ہے، تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ زہد و قناعت اور ایک طرف یہ ٹھاٹھ باٹھ جو مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے، ہیں وہ بھی ولی کامل، ولایت کے لباس مختلف ہوتے ہیں، ولایت کا تعلق کپڑوں سے نہیں وہ قلب سے ہے، قلب جب اللہ رسیدہ بن جائے، وہ ولی کامل ہے، اپنے حسن نیت سے کوئی لباس فاخرہ پہنتا ہے، اس میں بھی نیکی کی نیت مضمر ہوتی ہے، اس میں بھی مصلحت ہے، کسی پر زہد و قناعت کا غلبہ ہوتا ہے۔ (وعظ شعب الایمان جلد ۴)

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں جو دار العلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں، جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا تو مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں، فرمایا کہ:

"جب میں دار العلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دار العلوم کی بالکل ابتداء تھی، ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا، فرماتے تھے کہ طلبہ میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا، اس سے اِن کی آنکھ لڑ گئی اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا مگر چونکہ پاک دامن اور عفیف تھے، اس لیے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختگی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی، ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی، اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا۔

فرماتے تھے کہ اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى" کے اِس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا اور اِس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، میری دُنیا گئی تھی تو گئی تھی، اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔

حضرت رحمہ اللہ کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے نہیں تھے۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا، اب میری دستگیری فرمائیے۔ حضرت رحمہ اللہ نے ہنس کر فرمایا: یہ اصل میں پٹھان تھے، اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو، اتنے ہی میں تم گھبرا گئے اور یہ دھاڑ مار کر رو پڑے اور کہا، حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں، میرا تو دین بھی چلا اور میری دُنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لیے میرا علاج کریں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا، بولنا مت۔ میرے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں جو دارالعلوم دیوبند سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اُسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے جو اب تک کھڑا ہوا ہے، اُسی کے نیچے سے دارالعلوم دیوبند شروع ہوا۔ ایک اُستاذ اور ایک شاگرد سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوتی ہے۔

اُستاذ کا نام ملا محمود تھا اور شاگرد کا نام شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تھا تو چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتے کی مسجد میں اِن تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اوّل ہوئے ہیں اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، یہ چشتی تھے اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت ہی غالب ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔

گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں اور چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو، اسی میں بیعت و تلقین کی جاتی ہے تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی

ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

غرض! حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابر میں سے ہیں تو مولانا منصور علی خان رحمہ اللہ کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا مگر بولنا کچھ نہیں۔ چنانچہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے یہ ساتھ ہو لئے اور مولانا منصور علی خان رحمہ اللہ مجھ سے کہتے تھے، میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیئت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

حضرت رحمہ اللہ حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے۔ فرماتے تھے جب حضرت رحمہ اللہ جا کر بیٹھ گئے اور میں سامنے مؤدب بیٹھ گیا، میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا، فرماتے تھے، میں نے اپنا داہنا حضرت رحمہ اللہ کے ہاتھ میں دیا تو حضرت رحمہ اللہ نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا، جیسے کوئی رسّی یا بان بٹا کرتا ہے۔

مولانا منصور علی خان مجھ سے فرماتے تھے، میں تم سے حلف شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جب تک حضرت رحمہ اللہ میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے، پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں ملائکہ کی آمد و رفت مجھے نظر آ رہی تھی، چڑھ رہے ہیں اور اُتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالم غیب مجھ پر منکشف تھا۔ یہ میری کیفیت تھی، اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اُٹھ جاؤ یہاں سے۔ فرماتے تھے میں باہر آیا، باہر آ کر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی؟

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ فرماتے تھے کہ جب دارالعلوم کے اس دروازے کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر پڑا۔ اُسے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت تھی جو قلب میں گھسی ہوئی تھی، وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ وہ قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔''

تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسول اور رسول کے صحابی تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں، بہت بالاتر ہیں، ان کے غلاموں اور خدام کو یہ کیفیت دی گئی کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطا کی ہے کہ اگر انسان دل کو سنوار لے تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

(وعظ جوہر انسانیت جلد 7)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی کمال عبدیت

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ان کو میں نے دیکھا ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میرے سامنے ہے۔ ان کے یہاں معمول یہ تھا کہ بڑی سے بڑی تکلیف آتی مگر پتہ ہی نہیں دیتے تھے کہ کوئی تکلیف آئی تھی، آپ تحمل کرتے تھے، مہینوں کے بعد کبھی فرماتے کہ فلاں تکلیف آئی تھی تو معلوم ہوتا کہ بڑی شدید تکلیف تھی، ظاہر نہیں کرتے تھے اور فرمایا کہ ''ہر چہ از دوست می رسد نیکو است'' یعنی اللہ کی طرف سے جو کچھ آئے آدمی صبر و رضا سے کام لے، بیماری آئے تو صبر کرے، کوئی دوسری مصیبت آئے تو صبر کرے اور فرمایا کہ یہی ہے عبدیت۔ ان کے یہاں اظہار عبدیت کا یہ طریقہ تھا، یعنی تسلیم کہ جو کچھ اُدھر سے آئے وہی میرے لیے حکمت ہے تو یہاں ہائے ہائے نہیں تھی بلکہ رضا و تسلیم سے گردن جھکا دیتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کرامت

میں نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا واقعہ سنا ہے کہ شیخ عبدالرزاق مرحوم جو حضرت کے ہم زلف تھے انہوں نے ایک مرتبہ حضرت کی دعوت کی تو جو راستے میں ملتا اس سے فرماتے کہ چلو بھائی کے یہاں دعوت ہے، اتفاق سے تقریباً بیس پچیس آدمی جمع ہو گئے، وہ بیچارے بہت پریشان ہوئے، کبھی گھر میں آتے، باہر آتے، پھر گھر میں جاتے اور باہر آتے، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سمجھ گئے کہ یہ پریشان ہیں تو فرمایا کہ کیا پکائے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت پلاؤ پکا رکھا ہے، فرمایا کہ پردہ کراؤ میں گھر میں آنا چاہتا ہوں، پھر حضرت گھر میں تشریف لے گئے اور پوچھا کہ وہ پلاؤ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس دیگچی میں ہے۔ حضرت رحمہ اللہ نے اس میں اپنا ہاتھ ڈال کر ایک لقمہ تناول فرمایا، پھر اپنی لنگی سے ڈھانپ دیا اور فرمایا کہ کھولنا مت بس نکالتے ہی رہو، بھیجتے رہو، چنانچہ انہوں نے یہی کیا، نکالتے رہے اور بھیجتے رہے یہاں تک کہ پورا مجمع کھانے سے نمٹ گیا مگر پلاؤ بدستور باقی رہا۔ پھر شیخ عبدالرزاق مرحوم نے محلے والوں کو بھی بھیجا اور تقسیم فرمایا جب حضرت نانوتوی رحمہ اللہ واپس آنے لگے تو فرمایا، میں نے اپنی لنگی ہدیہ تھوڑے ہی کی ہے میری لنگی واپس لاؤ، جب لنگی ہٹائی گئی تو دیگچی خالی ہو گئی۔ (مجالس حکیم الاسلام جلد دوم)

عظمت واحترام اُستاذ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کو، خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی، فقہی مسئلہ میں کسی موقع پر خنزیر کا ذکر آیا تو لوگوں نے کہا یہ تو بھنگیوں سے معلوم ہو سکتا ہے، وہی خنزیر پالتے ہیں، انہی کو زیادہ معلوم ہوگا۔ تو حضرت رحمہ اللہ کے گھر میں جو بھنگی آتا تھا، ایک دن اس سے پوچھا کہ بھئی! خنزیر کے بارے میں اس بات میں تمہاری کیا تحقیق ہے؟ کیا علم ہے؟

اس نے اصلیت بتلائی کہ یہ صورت ہوتی ہے، اس دن کے بعد سے جب وہ بھنگی آتا تو اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے۔ فرماتے: ''اس کے ذریعے مجھے ایک علم حاصل ہوا ہے۔'' اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًا اِنْ شَآءَ بَاعَ وَاِنْ شَآءَ عَتَقَ"

''میں اس کا زرخرید غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا، چاہے مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کر دے۔''...... تو علم تو اس کے ساتھ آتا ہے کہ اتنا نفس پست کر لیا جائے، اتنی ذلت و تواضع اختیار کی جائے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے سارا علم سمٹ کر خود بخود ہمارے سینے میں آ جائے۔ یہ عادت اللہ کے خلاف ہے۔ (وعظ عناصر سیرت جلد ۵)

حلم کا بے مثال واقعہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں ''حضرت مولانا عبدالغنی صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت نانوتویؒ مباحثہ شاہجہان پور کے لئے روانہ ہوئے تو شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب سنیوں نے (جو مقامی شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے بے بس تھے۔ کیونکہ زمیندارہ شیعوں ہی کا تھا) حضرت کو لکھا کہ جاتے یا آتے حضرت والا اس گاؤں کو اپنے قدوم سے عزت بخشیں اور ہمیں کچھ پند و نصیحت فرما دیں۔ تاکہ ہمارے لئے اصلاح و فلاح اور تقویت کا باعث ہو۔

حضرت والا نے بخوشدلی ان کی دعوت منظور فرمالی۔ جیسا کہ غرباء کی دعوت و پیشکش بطوع و رغبت قبول فرمانے کی عادت تھی۔ اور جاتے یا آتے ہوئے اس گاؤں میں اترتے۔ شیعوں میں اس سے کھلبلی مچی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تنظیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے متوقع اثرات کی کاٹ کے لئے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر یہ چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیے گئے کہ اثنائے وعظ میں اس طرح

کئے جائیں کہ اول فلاں سمت کا مجتہد دس اعتراض کرے اس سے حضرت نمٹیں تو دوسرے کونہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں مبتلا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔

اب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سنی ہو گئے۔

مجتہدین اور مقامی شیعہ چوہدریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرت والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آ کر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔

پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ اک دم اٹھ کھڑا ہو، اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز کب ہوگی؟

شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔

حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔

نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کی۔ دو تکبریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے ''ہونھ'' کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سسکاردی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔

حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی غصے کے لہجہ میں فرمایا کہ ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔'' دیکھا گیا تو مردہ تھا۔

شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا، اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خودان کی سبکی اور سبکی ہی نہیں سب کی موت آ گئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔'' (سوانح قاسمی جلد دوم بحوالہ جواہر پارے جلد اور)

نوٹ: آئندہ صفحات کے دو اہم مضمون کتاب ''حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ حیات افکار خدمات'' سے ماخوذ ہیں جو کہ مولانا منظور قاسمی صاحب مدظلہ (مردان) کے مشورہ سے جزو کتاب بنائے جا رہے ہیں۔ (مرتب)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی●

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

بحیثیت محدث وفقیہ

اہلِ علم دو طرح کے گذرے ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے یہاں وسعت اور پھیلاؤ ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے یہاں عمق اور گہرائی ہے، یہ دونوں طرح کا مذاق کچھ فرق کے ساتھ ہر عہد میں رہا ہے، علامہ سیوطیؒ اور علامہ سخاویؒ جو معاصر بھی ہیں اور اپنے اعلیٰ علمی ذوق اور تالیفات کی وجہ سے معروف بھی، ان کے بارے میں بھی بعض مقام شناس علما کا تجزیہ یہی تھا کہ ایک کے پاس وسعت ہے اور دوسرے کے پاس عمق۔

اس لحاظ سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں علوم اسلامی میں عمق اور گہرائی پائی جاتی تھی، اخفاءِ حال کا اتنا غلبہ تھا کہ باضابطہ تصنیف و تالیف کا کام بہت کم کیا، لیکن جو کچھ لکھا اور جو کچھ ان سے سننے والوں نے محفوظ کیا وہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگاہی کا شاہد عدل ہے، وہ صرف تیراک نہ تھے بلکہ غواص تھے، ان کے یہاں یافت سے زیادہ دریافت ہے، آپ کی جو بھی تحریر دیکھی جائے اس میں نقل و حکایت کم ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے من جانب اللہ علوم و معارف کا ورود ہو رہا ہے، کتابوں کے حوالوں سے مواد کا اکٹھا کر لینا بھی مشکل کام ہے مگر نسبتاً آسان ہے، لیکن کسی موضوع کی تہہ تک پہونچ کر خود اپنی بات کہنا اور اپنی قوتِ فکر کا استعمال کر کے الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانا دشوار کام ہے۔ اور یہی کام حضرت نانوتویؒ نے کیا ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے لعل و گہر اور جواہر ریزے نکالے ہیں کہ جہاں تک بڑے بڑے اہلِ علم کی بھی رسائی نہیں ہو پاتی۔

حضرت نانوتویؒ ان گوشہ نشیں اور عزلت گزیں اہلِ علم میں نہیں تھے جو صرف علم وتحقیق کے کام میں مصروف ہوں اور امت جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذر رہی ہو، ان سے بے خبر اور بے تعلق ہوں، بلکہ وہ دقیق النظر دماغ کے ساتھ ساتھ تڑپتا ہوا بے چین اور دردمند دل بھی رکھتے تھے، امت اسلامیۂ ہند پر کفر کی جو یلغار ہورہی تھی اس نے ان کی کروٹوں کو بے سکون کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی لئے حضرت نانوتوی کے یہاں ''تحقیق برائے تحقیق'' کا ذوق نہیں تھا۔ بلکہ زبان جب بھی کھلتی، قلم جب بھی جنبش کرتا اور دل ودماغ جب بھی فکر ونظر کا سفر طے کرتا تو اس کا مقصد ومنشاء ایک ہی ہوتا تھا اور وہ مقصدِ جمیل تھا اسلام کی دعوت واشاعت اور دینِ حق کی حفاظت وحمایت۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف عیسائی اور دوسری طرف آریہ سماجی پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ زن تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رشتہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دینِ متین سے کٹ جائے اور ان کی ثروت ایمانی لوٹ لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جن عبقری شخصیتوں کو پیدا فرمایا ان میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، اس لئے فطری طور پر حضرت نانوتویؒ کا اصل موضوع علم کلام تھا، مولانا کی زیادہ تر تقریریں اور تحریریں عقلی طور پر اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے اور عیسائیت اور ہندومت کی رد میں ہیں، ان کا مواد اتنا وقیع، مخالفین کے لئے اس درجہ مؤثر اور معاندین کے لئے مسکت ہے کہ آج بھی ان کی افادیت مسلّم ہے اور اس کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کی خداداد ذہانت وذکاوت، حدیث کی تدریس اور اس کے ساتھ ساتھ رجال کار کی تیاری اور حدیث وفقہ کے میدان میں افراد سازی اور مردم گری سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان فنون میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ لیکن کچھ تو ان فتنوں کا مقابلہ جو یقیناً اس عہد میں کفر وارتداد کے فتنہ کا مقابلہ تھا۔ اور کچھ کمال اخلاص کی وجہ سے اخفاءِ حال کا غلبہ اور نام ونمود سے دوری کی وجہ سے حدیث وفقہ بلکہ علم کلام کے علاوہ دوسرے موضوعات پر تصنیف وتالیف کی طرف یا تو آپ کی توجہ نہیں ہوئی یا موقع نہیں ملا، اس لئے اس موضوع پر بھرپور اور تفصیلی تجزیہ پیش کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

تاہم اس سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی تحریر میں جو اشارات ملتے ہیں، اور ضمنی طور پر جو حدیث وفقہ

سے متعلق جو مباحث آ گئے ہیں، ان سے آپ کے فکری نہج کا اندازہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر علماء اصول لکھتے ہیں کہ احادیث میں احناف کا طریق یہ ہے کہ اگر روایتیں متعارض ہوں تو اولاً دیکھتے ہیں کہ کیا ایک روایت کے منسوخ اور دوسرے کے ناسخ ہونے پر کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر نسخ کی دلیل مل جائے تو نسخ کا فیصلہ کرتے ہیں، ورنہ پھر وجوہ ترجیح میں غور کرتے ہیں، اور کوئی وجہ ترجیح ہاتھ آ جائے تو ترجیح سے کام لیتے ہیں، اگر کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو تو پھر تطبیق وتوفیق کی کوشش کرتے ہیں، اگر تطبیق کی کوئی راہ نہ نکل سکے، جس کی شاید ہی کوئی مثال مل پائے، تو پھر دونوں دلیلوں کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہوئے: اذا تعارضا تساقطا پر عمل کرتے ہیں لیکن حضرت نانوتویؒ کا مذاق یہ ہے کہ ترجیح کے بجائے تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو کوئی حدیث عمل سے رہ نہ جائے۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلد حضرات کے رد میں جو رسائل لکھے ہیں جیسے "الحق الصریح" اور "توثیق الکلام" ان میں احادیث سے متعلق مباحث میں یہ فکر پوری طرح نمایاں ہے۔ یہی وہ مذاق قاسمی ہے جس کو عامتاً حلقۂ دیوبند کے اہلِ علم نے اختیار کیا ہے، اور یہ احادیث کے سلسلے میں دیوبند کی امتیازی فکر اور اس کی شناخت ہے۔

بلکہ حضرت نانوتویؒ کا ذوق تو یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہیں اگر فی نفسہ ان کی مشروعیت باقی ہو تو اس کو بھی مستحب کے درجہ میں رکھا جائے تا کہ ان پر بھی فی الجملہ عمل ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کی فی الجملہ اتباع ہو جائے، چنانچہ آپ کی رائے ہے کہ "گو پچاس نمازیں منسوخ ہیں لیکن استحباب کے درجہ میں ہنوز باقی ہیں"۔ پھر ایک نکتہ لکھا ہے کہ تتبع سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شب وروز میں پچاس رکعت پڑھنے کا تھا۔

نسخ کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو نسخ کم سے کم مانا جائے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ہے۔ خود حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں:

"نسخ خلاف اصل ہے تا مقدور اس سے احتراز مناسب ہے"

پھر جیسا کہ امام سرخسیؒ وغیرہ عام اصولیین احناف نے لکھا ہے کہ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید نسخ کے حکم میں ہے، یہی رائے حضرت نانوتویؒ کی بھی تھی۔ اسی طرح آپ نص کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے کو بمقابلہ اس کی تاویل وتوجیہ کے انسب خیال کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں.

''تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل نسخ ہے زیبا نہیں''۔(۱)

''قرأت فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کی اپنی مستقل توجیہ ہے اور وہ یہ کہ مقتدی کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا تعلق اصل میں اس اصل سے ہے کہ امام مقتدیوں کا نائب ہوتا ہے اور اسی کی نماز اصل ہوتی ہے، امام کی یہ حیثیت نماز میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے، ابتداء میں سلام وکلام بھی جائز تھا، اسے منسوخ کیا گیا، پھر مقتدی سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت بھی کیا کرتے تھے تو ضم سورت کا حکم منسوخ ہوا، پھر مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی منسوخ ہو گیا، تا کہ امام کی نیابت اور نماز میں اس کے ضامن ہونے کی کیفیت آہستہ آہستہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے۔

موضوع قرآن کا ہو یا حدیث کا یا علم کلام کا، حضرت نانوتویؒ کا منہج فکر اور طریقۂ استدلال زیادہ تر اصولی ہوتا ہے، اور متکلمانہ طرز واسلوب سے خالی نہیں ہوتا، مثلاً اسی قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ نماز میں اصل حیثیت امام کی ہے مقتدی کی حیثیت محض تابع کی ہے۔ خود انہی کے الفاظ ہیں:

''امام موصوف بالذات بالصلوٰۃ ہے اور مقتدی موصوف بالعرض''

اور قاعدہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصل اور حضرت نانوتویؒ کی زبان میں موصوف بالذات ہوں، اس طرح گویا مقتدی اس آیت کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ذہن رسا نے: لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کی بابت ایک اور نکتہ اخذ کیا ہے اور یقیناً وہ ان کے تفقہ پر دال ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا خیال ہے کہ صلاۃ کا اطلاق کم سے کم ایک رکعت پر ہوتا ہے گویا صلوٰۃ کا طول ایک رکعت ہے جس کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کافی ہے تو اسی طرح چونکہ مقتدی امام کا تابع ہے اس لئے امام کے ساتھ مل کر مقتدیوں کی نماز ایک نماز ہے لہٰذا چونکہ اس حدیث میں ایک صلوٰۃ کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کو کافی قرار دیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کی مجموعی نماز کے لئے ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہو جائے گی، جو امام کی قرأت سے پوری ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کتاب وسنت کے غواص ہیں اور اپنی ذہانت اور قوت اخذ و

استنباط سے الفاظ کی تہہ میں ایسے ایسے معانی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عام اہلِ علم کو شاید اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے رجال، اس کے درجہ ومقام اور جن احادیث سے استدلال کیا جارہا ہے، ان کے اطراف اور مختلف روایتوں میں الفاظ کا فرق اور احکام کے استنباط میں اس کے اثر پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اصول حدیث میں اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کے نقاطِ نظر اور طریقہ فکر کو ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے رسالہ "توثیق الکلام" اور "الدلیل المحکم" میں محمد بن اسحاق کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کا اختلاف، بعض احادیث موقوفہ کا احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہونا، موطا امام محمد کی ایک روایت کے علی شرط الشیخین ہونے کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مقتدی کے لئے تتبع سکتات یا سکتۂ طویلہ بین الفاتحہ والسورۃ پر کوئی مرفوع روایت موجود نہیں۔

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کے احادیث سے استدلال میں درایت کا پہلو غالب ہے۔ جو ایک مشکل کام ہے، کیونکہ روایت کے لئے نقل وحکایت ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس بات کی طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے:

"قوت روایت باعتبار درایت قوت سند سے بڑھ کر ہے"

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قوت درایت قوت روایت سے مقدم ہے"

اسی لئے حضرت نانوتویؒ کی رائے ہے کہ ایسے رواۃ جو تفقہ میں فائق ہوں، ان راویوں پر ترجیح رکھتے ہیں جو صرف سند اور رجال سے تعلق رکھتے ہوں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اگر روایت میں فقہا کا اعتبار نہ ہو تو اوروں کا درجہ اولیٰ نہ ہوگا"

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں:

"یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہا کا زیادہ سند میں اعتبار ہوا اور کیوں نہ ہو روایت بالمعنیٰ اکثر ہوتی ہے اور اس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے"۔

تراویح کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکتوب میں حدیث مرسل کی حجیت پر قلم اٹھایا ہے، اس میں ایک اعتراض جو غیر مقلد عالم کی طرف سے کیا گیا ہے کہ: علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین میں سنت خلفاء راشدین سے سنت نبوی ہی مراد ہے۔ کیونکہ جب تکرار معرفہ ہو تو وہ

متحد المعنی ہوتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس کا خوب مسکت جواب دیا ہے اور آیت قرآنی: ابناء نا و ابنـاء کم و انفسنا و انفسکم سے استدلال کیا ہے۔ تراویح ہی کے مسئلے میں آپ کے اس مکتوب (جو لحق الصریح کے نام سے موسوم ہے) میں کئی اہم مباحث آئے ہیں کہ احکام شرعیہ کا ثبوت صرف صحاح ستہ ہی سے نہیں ہوتا، ضعیف اور موضوع روایتوں میں فرق ہے، فضائل اعمال میں ضعیف روایتیں معتبر ہیں اور تراویح بھی فضائل اعمال میں سے ہے، اسی طرح اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خبر واحد سے اعتقادی احکام ثابت نہیں کئے جاسکتے اور عملی احکام میں واجبات وسنن اس سے ثابت ہوسکتے ہیں۔ تراویح اور تہجد کے دو علیحدہ نماز ہونے پر بھی آپ نے گفتگو کی ہے، جو اس مسئلہ میں یقیناً اصل اور بنیاد ہے۔

''فیوض قاسمیہ'' کا ایک مکتوب جو دیہات میں نماز جمعہ سے متعلق ہے، اہلِ علم کے لئے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتا ہے۔ سورۂ جمعہ کی آیت: اذا نودي للصلوٰة من يوم الجمعة الخ کی ایسی بلیغ تفسیر ہے کہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اس ایک ہی آیت سے حضرت نانوتویؒ نے جمعہ کے وجوب اور جمعہ کی صحت سے متعلق شرائط کو ثابت کیا ہے اور اس آیت سے جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں حنفیہ کی طرف سے استدلال کیا ہے۔ غرض یہ مکتوب قوت استناج اور صلاحیت استنباط کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

فقہ وحدیث سے متعلق ایک اہم فن ''اسرار شریعت'' کا ہے کہ احکام شرعیہ کی حکمتیں اور ان کے مصالح کیا ہیں؟ اس موضوع پر حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں ایسی قیمتی نکتہ سنجیاں اور حکمت آفرینیاں موجود ہیں کہ شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت نانوتویؒ متکلم اسلام تھے، لیکن علم کلام میں آپ کا نہج خالصتاً نظری اور معقولی بحثوں کا نہیں تھا بلکہ آپ محسوسات اور مشاہدات سے مابعد الطبعی امور پر ایسا استدلال کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ایک روشن صبح کی طرح یہ اَن دیکھی حقیقتیں نظر آنے لگیں، مثلاً خود نماز ہی کے احکام میں قیام، رکوع اور سجود، رات میں جہری اور دن میں سرّی قرأت، سلام، قبلہ کی شرعی حیثیت اور اس کی مصلحت وغیرہ پر ایسی گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی جگہ غالباً ایسی دل کو چھوتی اور عقل کو قائل کرتی ہوئی بات اس فن کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ و ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

حضرت نانوتویؒ کو حدیث وفقہ کے موضوع پر کوئی مستقل اور مربوط کام کرنے کا موقع تو نہیں ملا،

لیکن بخاری شریف کے آخری پانچ اجزاء پر حواشی جو حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ہیں، وہ خود آپ کی نگاہ کی وسعت کی دلیل ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری جیسے صاحب علم کے کام کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن حضرت سہارن پوریؒ نے اس نوعمر معاصر عالم کو یہ عظیم الشان کام پورے اعتماد سے حوالہ فرمایا، یہ ایک طرف حضرت نانوتویؒ کے جوہر اور دوسری طرف حضرت سہارن پوری کی جوہر شناسی کی واضح دلیل ہے۔ مولانا سہارن پوریؒ نے جب ان اجزاء کی تعلیق کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو بعض لوگوں کو اس پر تامل ہوا لیکن جب آپ نے اس کام کو مکمل فرمایا تو تمام ہی اہلِ علم نے اس پر آفریں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حواشی حدیث کے اسنادورجال اور معانی و مفاہیم دونوں پہلوؤں سے حضرت نانوتویؒ کی گہری نظر پر شاہد ہیں، ان میں کئی مواقع وہ ہیں جہاں امام بخاریؒ نے احناف کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان مواقع پر آپ نے روایت و درایت دونوں پہلوؤں سے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کو پیش فرمایا ہے اور حدیث و فقہ اور رجال کے بہت سے مراجع سے استفادہ کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس فن کی نادر و نایاب کتب ہی نہیں بلکہ آج جو متون متداول ہیں وہ بھی اہلِ علم کو دستیاب نہیں تھیں اور نگاہ شوق ان کو پانے کے لئے بے چین رہتی تھی، چنانچہ خود حضرت نانوتویؒ نے بعض مواقع پر کتابوں کی کمی اور عدم دستیابی کا رونا رویا ہے۔ ان حواشی میں بہت سی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ اہلِ علم کے لئے متاعِ گراں مایہ ثابت ہوگا۔

قضاء قاضی ظاہراً نافذ ہوگا یا باطناً؟ (ص:۱۰۳۰، ۱۰۶۵) پڑوسی کے لئے حق شفعہ ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں احناف کا نقطۂ نظر اور امام بخاری کی تنقید کا جواب (ص:۱۰۳۲) حانث ہونے سے پہلے کفارۂ قسم کی ادائیگی (ص:۱۰۱۸) قضاء علی الغائب (ص:۱۰۶۴) غلام مدبر کی بیع (ص:۱۰۶۶) صوم وصال کی ممانعت (ص:۱۰۷۵) وغیرہ پر نہایت نفیس فقیہانہ اور محدثانہ بحث ملتی ہے، اسی طرح گوہ کے گوشت کی بابت بحث کرتے ہوئے سند اور رجال پر بھی مبسوط اور چشم کشا کلام کیا گیا ہے (ص:۱۰۷۹)

فقہ و حدیث میں ہم فرزندان قاسمی کے لئے سب سے اہم بات جو ہمارے لئے یقیناً اسوہ اور

نمونے کے طور پر جس کو آج کے حالات میں خاص طور پر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے یہاں مسائل میں کمال اعتدال اور تمام سلف صالحین کا غایت درجہ ادب واحترام ہے، نیز استنباط واستدلال میں بھی عدل وانصاف کا دامن آپ کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا ہے۔ خود قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کے رجحان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترک قرأت اولیٰ ہے لیکن قرأت بھی ناجائز نہیں، فرماتے ہیں:

"ترک قرأت فاتحہ خلف الامام قرأت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے"

ایک مقام پر غیر مقلد حضرات کی بے اعتدالی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست و گریباں نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکان خطاء سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ حضرت امام شافعیؒ صحیح فرماتے ہوں گے اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں"۔

اپنے ایک مکتوب میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر نہایت ہی مدلل اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا ہے کہ چونکہ مسئلہ ظنی ہے اس لئے اگر کہیں دیہات میں جمعہ قائم کرلیا جائے تو الجھنے کی بھی ضرورت نہیں: "اگر کسے در دیہی جمعہ قائم کند دست و گریبانش نہ زنند"۔

حضرت نانوتویؒ کا یہی وہ طریقۂ فکر ہے جو دیوبند کا اصل رنگ ہے اور جو حدیث وفقہ میں دیوبند کے محقق علماء کا اصل منہاج رہا ہے، یہی بات حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ملتی ہے، احادیث میں تطبیق اور فقہی اختلافات میں توسیع اور تسامح کی یہی کیفیت حضرت تھانویؒ کے یہاں ملتی ہے، الحیلۃ الناجزۃ اس کا واضح ثبوت ہے اور یہی رنگ زیادہ وسعت اور عمق کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے سب سے بڑے محدث علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں موجود ہے، فیض الباری اور العرف الشذی کو کہیں سے دس بیس صفحہ بھی پڑھ لیا جائے تو حضرت کشمیری کا یہ رنگ کسی حقیقت پسند عالم کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے عدل واعتدال کی راہ اختیار کرنا، اعتقادی مسائل میں تصلب اور احکام فقہیہ میں دلائل کا اختلاف اور احوال زمانہ کی تبدیلیوں کے اعتبار سے توسع، اور کتب فقہ کی ظاہری عبارتوں پر جمود واصرار کے بجائے سلف صالحین کے مقصد ومنشاء اور ان کے استنباط واجتہاد کی روح کو

سمجھنا، اور اس کو اپنے لئے چراغِ راہ اور خضرِ طریق بنانا، یہ ہے بزرگانِ دیوبند کی راہ تھی، جس جماعت نے اس خانوادۂ فکری کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور فکرِ ولی اللّٰہی سے خوب جذب کیں اور نقیب و ترجمان حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے۔

اخیر میں اس سیمینار اور سیمینار منعقد کرنے والے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں حدیث وفقہ کی جو بحثیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن میں ایسے جواہر پارے موجود ہیں جو شاید کہیں نہ مل سکیں، ان کو ایک جگہ حدیثی اور فقہی افادات کے مجموعہ کی حیثیت سے جمع کر دیا جائے اور اسے حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں لکھنے کے بجائے آج کی زبان اور آج کے اسلوب میں مرتب کیا جائے تو اس طرح انشاء اللہ علوم قاسمی کا احیاء ہو سکے گا اور اہلِ علم اور اصحاب فکر و نظر کے لئے نہایت قیمتی اور عظیم الشان تحفہ ہوگا۔ وباللہ التوفیق و ھو المستعان.

☆☆☆

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز *

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر اور جدید فلسفۂ وجودیت

وجود کیا ہے؟

وجود و موجودات کی حقیقت کا مسئلہ ہمیشہ ایک اہم سوالیہ نشان بن کر فکر انسانی سے نبرد آزما رہا ہے۔ انسان نے جب بھی فکر و نظر سے زندگی و موت اور حیات و کائنات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تو اس کے سامنے وجود و موجودات کا مسئلہ متعدد زاویوں سے توجہ طلب رہا:

(۱) زندگی اور موت یا وجود و عدم کی فی نفسہ حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا اس کارخانہ حیات و کائنات کا کوئی خالق ہے یا خود بخود پیدا ہو گیا ہے اگر ہے تو اس کا اس کے پیدا کرنے سے کوئی مقصد و منصوبہ ہے یا بغیر مقصد کے اس کو پیدا کیا ہے؟

(۳) انسانی وجود کی حقیقت کیا ہے اور اس کا خالق اور دیگر مخلوقات سے کیا رشتہ و تعلق ہے؟

(۴) کیا خالق و مخلوق دونوں قدیم و لافانی ہیں یا دونوں فانی و حادث ہیں یا خالق قدیم اور مخلوقات حادث ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

وجود کی حقیقت جاننے کے سلسلہ میں جب تفلسف زیادہ گہرا ہوتا ہے تو انسان حیرت و درماندگی کا اسیر ہو جاتا ہے، اس کے تمام مشاہدے اور منطقی مفروضے شکست و ریخت اور خود تناقضی کا شکار ہونے لگتے ہیں اور وہ غالب کی زبان میں کہہ اٹھتا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
اور
کھائیو مت فریب ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

فلسفہ کی حیرت کسی حد تک اطمینان کا سانس اس وقت لیتی ہے جب اسے ایک درمیانی راہ نکلتی نظر آتی ہے کہ موجودات میں کچھ حقیقت ہے اور کچھ افسانہ، ہندو فلسفہ میں مایا کا تصور عجیب

* کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

وغریب ہے کہ ایک شئے بیک وقت موجود بھی ہے اور اسی لمحہ واہمہ وفریب بھی ہے، ایک ہندو فلسفی شاعر کہتا ہے:

بس یہ کہنے پر یاروں نے بے دین مجھے ٹھہرایا ہے
سب عین حقیقت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے سب مایا ہے

جب قدیم فلاسفہ کے یہاں یہ مسئلہ اٹھا تو پارمنی ڈس Parmenides (504-470-)۔نے پورے عالم کو ایک وجود مطلق سے تعبیر کیا جو کہ ازل سے قائم ودائم اور متصل وکامل ہے، ہرقلیطس (Heraclitus/525-475BC) نے اس وجود مطلق کو مسلسل حرکت میں اور بہتر سے مزید بہتر کی طرف متحرک بتایا۔سقراط (Socrates/469-399BC) نے کہا کہ جو ماہیات خیر ہیں مثلاً رحم سچائی، علم اور عدل وانصاف وغیرہ ان کا وجود حقیقی ہے جو ازلی ابدی اور کامل ومستقل ہے باقی ان کے اضداد بدی کی صفات کا وجود عارضی اور غیر حقیقی ہے، افلاطون (Plato/427-347BC) نے اپنے پیشرو فلاسفہ کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مفصل فکری نظام مرتب کیا اور کہا کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں، ایک عالم اعیان وامثال ہے اور دوسرا عالم محسوسات جو کہ دراصل عالم معانی وامثال کا سایہ ہے (اشباح واظلال ہے) عالم مثال دائمی اور مستقل ہے اور عالم محسوسات و اظلال مسلسل متغیر ومتحرک ہے، یہی افلوطین فلسفہ جب افلوطین (270-204AD Plotinus/plotine) کے ہاتھوں نوفلاطونی فلسفہ کی شکل میں سامنے آیا تو ہمارے متعدد عظیم اشراقی صوفیہ اس سے متاثر ہوئے۔تجلیات وتنزلات پر مبنی ان کے کشف والہام نے حسب توفیق واستطاعت انہیں مذکورہ ماہیتوں کی حقیقت کا عرفان بخشا۔افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو (Aristotle 384-322BC) نے موجودات کی تقسیم جواہر واعراض کی شکل میں پیش کرکے اپنے مابعد فلاسفہ کے لئے فکر کا ایک مستقل مقیاس ومعیار عطا کیا۔موجودات کی دس اجناس جنھیں مقولات عشر کہا جاتا ہے ان کی جنس الاجناس وجود موجود ہی ہے۔عہد اسلامی کے فلاسفہ نے ارسطوئی منہج ومنطق کو تفلسف کا معیار تسلیم کرتے ہوئے موجودات کو دو قسموں پر تقسیم کیا واجب الوجود اور ممکن الوجود ، اس طرح فارابی اور ابن سینا وغیرہ کے یہاں وجودی استدلال (Ontological argument) معرض وجود میں آیا کہ وہ ذات جس کی ماہیت ہی وجود وبقا

ہو واجب الوجود لذاتہ ہے اور چونکہ دیگر سارے وجود اس کے عطا کردہ ہیں اس لئے ممکن فی ذاتہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم یونانی فلاسفہ کے یہاں وجود کے سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس کی ماہیت میں وحدت ہے تو اصل موجودات کیا ہے؟ کسی نے کہا ہوا کسی نے کہا پانی، کسی نے ذرہ کو اصل بتایا اور کسی نے عناصر اربعہ کو اصل قرار دیا۔

وجود و وجودیت کا تصور عہد جدید میں

فکر و فلسفہ کے عہد جدید میں وجودیت (Existentialism) مغرب میں باقاعدہ ایک نظام فکر کے طور پر ابھری ہے جن مفکرین اور فلسفیوں کو وجودی کہا جاتا ہے ان کی آراء پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ان مغربی اہم فلاسفہ کے افکار پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے جن کی آراء نے وجودیت نو کی تشکیل میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes/1596-1650) کانٹ (Kant/1724-1804) ہیگل (Hegel/1770-1831) نطشے (Nietzsche/1844-1900)، برگسان (Bergson/1859-1941) جدید فلسفہ کے بانی ڈیکارٹ نے اپنے سوا ہر موجود کے وجود میں شک کیا اور فرض کیا کہ سارا عالم واہمہ ہے، میں چونکہ پریشان ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں اس لئے میں کوئی وجود یقینا رکھتا ہوں اور جب کوئی چیز ہوں تو میرے گرد و پیش کی دنیا بھی کوئی وجود رکھتی ہے چونکہ انسان کے مشاعر و حواس میں تذبذب و یقین کی کیفیتیں کارفرما رہتی ہیں اور خارجی محسوسات میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جو ایک نقص کی علامت ہے اور جب ہم نقص و ناقص کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کمال و کامل کا تصور خود بخود ابھرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی کامل ہستی بھی ہو اور وہ ذات الٰہی کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ (واضح رہے کہ ڈیکارٹ کے ان خیالات کی بنیاد امام غزالی کی بعض کتابوں میں پہلے سے موجود ہے) ڈیکارٹ کے مذکورہ بالا نظریات کے زیر اثر جدید فلسفے نے متعدد کروٹیں لیں اور موجودات کی حقیقت اور ان کی معرفت و ادراک کا مسئلہ مستقل زیر بحث رہا۔ بعض فلاسفہ نے کہا کہ ہم خارجی موجودات کا اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا ہمارے حواس و مدرکات ان کا تصور، تجربہ یا احاطہ کر سکتے ہیں، موجودات کی اصل حقیقت اور فی الواقع کنہ تک رسائی عقل انسانی کی دسترس میں نہیں ہے۔

اس گروہ کے سرخیل کانٹ ہیں جنھوں نے وجودی استدلال کی بھی نارسائی اور اس کا نقص

ثابت کیا اور کہا کہ کسی علت اولی یا منبع فیاض کا ہم تصور تو کر سکتے ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع موجود بھی ہو مثلاً اگر میں اپنی جیب میں سو ڈالر کا تصور کر دوں تو مجھے اس سے ان کا ذہنی وجود حاصل ہو جائے گا مگر کیا واقعی سو ڈالر میری جیب میں آ جائیں گے؟ اس مرحلہ پر "برگساں" ایک قدم آگے بڑھ کر قدرے مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں کہ عقل انسانی جن حقیقتوں کا ادراک یا احاطہ نہیں کر سکتی الہام اور وجدان (Intuition) سے ان کا عرفان ممکن ہے (یہ بات بھی امام غزالی اور دیگر متعدد اکابر صوفیہ کی تحریروں میں موجود ہے) کانٹ کے شاگرد ہیگل نے ایک عجیب فلسفہ پیش کیا جو کہ جدلیات (Dialectics) کے نام سے مشہور ہے جس کا مطلب ہے کہ موجود (Thesis) سے عدم (Antithesis) ٹکرا کر اسے آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے مگر اس تصادم کے بطن سے دوسرا موجود (Synthesis) جو کہ سابقہ موجود و عدم یا مثبت و منفی کا مرکب ہوتا ہے اور پہلے موجود سے افضل ہوتا ہے، جنم لیتا ہے (جیسے مرد + عورت = بچہ) اس طرح یہ کائنات جس کی سربراہی انسانی قافلہ کر رہا ہے بہتر سے مزید بہتر کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ کمال کی آخری منزل سامنے آ جائے۔ اس نظریہ کی رو سے کانٹ کی علت اولی و ذات کامل اگر آج موجود نہ ہو تو کل یقیناً وجود میں آ جائے گی فریڈرک نطشے چونکہ لاہوت اور مذہبی علوم کے طالب علم تھے انہوں نے اس کے برعکس نظریہ قائم کیا اور کہا کہ اس کائنات کا سفر ایک مافوق انسان (Superman) کی تلاش کے لئے جاری ہے اور خالق کائنات خدا کی (نعوذ باللہ) موت واقع ہو گئی ہے۔ حیات و کائنات میں مسلسل آویزش و کشمکش دراصل مافوق انسانی ہستی کو بروئے کار لانے کے لئے جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے مرد مومن کا تصور نطشے کے مرد مافوق کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوا جس کے لئے اقبال نے کہا ہے:

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

(حالانکہ نطشے کے مرد مافوق اور اقبال کے مرد مومن میں زمین آسمان کا فرق ہے، نطشے کے مرد مافوق کی شکل سپرمین، ٹارزن اور کنگ کانگ جیسے عنوانات کے تحت اہل مغرب پیش کرتے رہتے ہیں جبکہ مرد مومن کا تصور خالص اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے)۔

اہل کتاب کی لاہوتی تعلیمات کے زیر اثر حضرت عیسیٰ کی جنہیں نصاریٰ ابن اللہ کہتے ہیں

آمد از دوبارہ آمد) کے عقیدے کو نطشے نے غالباً اس فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جدید وجودی فلسفہ کا خلاصہ

انیسویں صدی عیسوی میں جن فلسفیوں نے مغربی افکار کی نمائندگی یا قیادت کی ان میں چند کافی مشہور ہیں، ہیگل کی مثالی جدلیت، کارل مارکس کی اشتراکیت اور سماجی جدلیت، بنتھام کی نفع پرستی اور لذت کوشی، ڈاروِن کا نظریہ ارتقاء اور نطشے کی ملحدانہ قوت پرستی وغیرہ انہیں کے شانہ بشانہ ایک فلسفہ اور ابھرا جسے آج ہم وجودیت کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی باقاعدہ داغ بیل ڈنمارکی فلسفی کرکے گارڈ (Kierkegaard1813-1855) نے ڈالی جو ایک مذہبی ادیب تھا جدید وجودیت کا خلاصہ یہ ہے کہ موجود کی اپنی جگہ ایک منفرد و ممتاز حیثیت ہے۔ خدا انسان اور کائنات میں انسانی وجود، خدا کے بعد تمام موجودات سے افضل و اہم ہے۔ وجودی فلسفیوں میں دو قسم کے مفکر پائے جاتے ہیں، خدا پرست اور منکر خدا، لیکن انسانی وجود کی برتری اور اہمیت کے مسئلے میں سب متفق ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مثالیت اور کلیت کے ذریعہ ہم جزئیات تک نہیں پہنچتے بلکہ ہم جسے جانتے ہیں وہ جزئی اور فرد ہے اسی طرح جزئیات و اشخاص کا وجود کلیات سے پہلے ہے۔ کلیات فرضی اشیاء ہیں جو تصورات کی حد تک موجود ہوتی ہیں ورنہ فی الواقع جزئیات و اشخاص کا وجود ہی اصل ہے اور ہمیں انہیں کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے وجودی فلسفہ میں انسانی مبدأ و معاد اور حاضر و مستقبل کے مسائل ہی زیادہ تر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ کرکیگارڈ کے بعد جن فلاسفہ نے وجودیت کو اپنا مسلک اور مطمح نظر بنایا ان میں مارٹن ہیڈیگر (Heideggar/1 89-1969)، کارل یاسپرس (Jaspers/1883-1969) اور جین پال سارترے (Sartre/1905-1980Jeanpaul) زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں ہیڈیگر اور سارترے ملحدانہ نظریات کے حامل ہیں جب کہ یاسپرس معتدل مابعد الطبیعاتی رجحان رکھتا ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت اہمیت اور وسعت سے متعلق بحث کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مادی اور روحانی تقاضے، اس کی معیشت و معاشرت، خوشی و غم، انفرادی خاندانی اور عام اجتماعی سطح پر اس کے مسائل اس کی سعادت و نکبت، آزادی و پابندی، محدودیت و لامحدودیت اس کی کنہ کے ادراک کا امکان یا عدم امکان، خدا سے اس کے رشتہ کی نوعیت و حدود، عبادت کی حقیقت وغیرہ جیسے مسائل سے وجودی فلسفہ بحث کرتا ہے۔ کرکیگارڈ اور دیگر خدا پرست وجودیوں کا کہنا ہے کہ خدا سے ہر شخص کا تعلق جداگانہ ہے،

خدا سے معروضی (Objective) تعلق ناممکن ہے بلکہ اس سے ہر شخص کا تعلق اپنی ذاتی معرفت و عقیدت اور ادراک کی عرفانی صلاحیت وقوت کے اعتبار سے موضوعی انداز میں (Subjectively) پیدا ہوتا ہے۔ انسانی وجود کا سب سے بڑا امتیاز اس کو پسند ناپسند کی آزادی حاصل ہونا ہے دیگر مخلوقات و موجودات اپنی فطرت و جبلت کے پابند ہیں جب کہ انسان کو متعدد راہوں میں سے کوئی بھی راہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ گناہ کے بارے میں وجودی فلسفیوں کا کہنا ہے کہ نیکی کا راستہ ابدی سعادت کا راستہ ہے اس پر چلنے والا جب محدودیت، تناقض، تھکن اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سے محرومی کا شکار ہوتا ہے تو گناہ کا سہارا لیتا ہے، بعض وجودی فلاسفہ کی رائے میں ارتکاب گناہ سے کبھی کبھی نیا نشاط حاصل ہوتا ہے۔ انسانی وجود کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ روحانی، عقلی اور وجدانی مشاہدات و کمالات سے بہرہ ور ہے۔ سارترے ہیڈیگر کا شاگرد اور ملحدانہ افکار کا حامل ہے، نطشے کی طرح وہ بھی انسان کو خدا کا قائم مقام سمجھتا ہے، اس کے برخلاف جبریل مارسل (Marcel/1889-1973) کیتھولک عیسائیت کا نمائندہ فلسفی تصور کیا جاتا ہے وہ بعض امور میں یاسپرس کا ہمنوا ہے، اس کا خیال ہے کہ حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونے کا راستہ اخلاص اور وفا ہے جس کی بنیاد امید ورجا ہے اس کے نزدیک خدا کا عرفان عقل وادراک کے ذریعہ ممکن نہیں اس کو اخلاص پر مبنی عبادت اور آفاقی محبت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دراصل مغربی معاشرہ میں ایک طرف مجرد مثالیت پرستی اور دوسری طرف خالص مشینی مادی زندگی کے ماحول میں انسانی وجود کی انفرادی شخصیت گم ہوتی جارہی تھی تو ان دو انتہاپسندیوں کے بیچ میں انسان کی انفرادی اہمیت وعظمت کی طرف توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں وجودی فلسفہ کا ظہور عمل میں آیا۔ اسی کے لئے اقبال نے کہا تھا:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر

وجود و وجودیت کے بارے میں جب ہم بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کی فکر کا جائزہ لیں تو یہ پیش نظر رکھیں کہ حضرت نانوتویؒ کی تمام تر فکر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن، حدیث اور ائمہ تجدید وعرفان کے اقوال وارشادات سے الگ انہوں نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی، ہاں اس کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتنسیق میں ان کی ایک انفرادی شان ہے۔ دراصل اس تعلق سے متکلمین اور

ہمارے اسلامی آراء مغربی مفکرین وفلاسفہ کی آراء سے بنیادی طور پر کئی زاویوں سے مختلف ہیں کیونکہ اگر اسلامی روشنی سے محرومی ہے تو پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ فرد اور جماعت کے درمیان توازن، فرد کے نفسیاتی مسائل مثلاً بیماری، بیروزگاری احساس تنہائی اور مایوسی وغیرہ کا حل اسلامی تعلیمات میں پہلے سے موجود ہے۔ اسلام میں انفرادیت و اجتماعیت، مادیت وروحانیت اور جبریت وحریت کے درمیان ایک لطیف امتزاج وتوازن اس انداز میں محفوظ رکھا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں بالعموم وہ مشاکل ومسائل پیدا نہیں ہوتے جن سے مغربی معاشرہ دوچار رہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں صالح ومومن انسان ہی اس کائنات کا خلیفہ وحاکم ہے۔ وہ دیگر تمام مخلوقات کا بادشاہ اور خلاصہ ہے وہی خالق کائنات کا مخاطب ہے (دوسرے نمبر پر جنات بھی پیام حق کے بالواسطہ مخاطب ہیں) مگر کائنات وانسان کی تخلیق کا کیا منشا ومقصد ہے انسانی معاشرہ کون سی بہتر منزل (Synthesis) کی طرف بڑھ رہا ہے اب تک اس کی راہ میں کتنے اہم موڑ اور سنگ میل آئے ہیں اور آئندہ پوری انسانی جمعیت اور پوری کائنات کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ اس بارے میں ملحد وجودی فلسفیوں کے پاس تو کوئی مثبت فکر ہونے سے رہی، جولاہوتی فلاسفہ ہیں ان کے پاس بھی صحیح جواب نہیں ہے۔ جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے انبیائے کرام صفوۃ الخلائق ہیں اور انبیاء میں پانچ اولوالعزم پیغمبر سب سے بڑے ہیں جن میں حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے افضل وبرتر ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء پر اللہ کی نعمتوں اور اس کے دین کا اتمام واکمال ہوگیا، یعنی انسان تمام کائنات کا حاصل انبیاء تمام انسانوں کا خلاصہ اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کا نقطۂ کمال وعروج ہیں: ۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ فکر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں بہت واضح طور پر ابھر کر آئی جب آپ نے ایک مکتوب میں لکھا کہ مقام حضرت ختم المرسلین یہ ہے کہ انسانی کمالات وامکانات اور مراتب ومعالی کا اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جاسکتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے ہیں یعنی اس سے زیادہ بلندی کسی مخلوق کے دائرہ امکان میں نہیں ہے[1] یہی بات متفرق مقامات پر حضرت شاہ ولی اللہ نے بیان کی ہے، شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے باب حقیقت نبوت اور اس کے خصائص میں فرماتے ہیں:

(۱) ملاحظہ ہو مکتوبات امام ربانی اور تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد۔

''انسانوں میں سب سے اعلیٰ طبقہ ملہم کا ہوتا...... مفہمین کی بہت سی قسمیں ہیں..... جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر ان کے ذہنوں اور قلوب کو اور ان کی تمام طاقتوں کو اللہ کے حوالے کرا دیتے ہیں انہیں پیغمبر کہا جاتا ہے.... انسانوں کی نافرمانیوں اور مفاسد پردازی کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مبعوث فرماتے رہے تھے تا آں کہ نبوت کا سلسلہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرما دیا۔(۲)

حضرت نانوتوی کی فکر میں انسانی وجود ایک عالم اصغر ہے جبکہ یہ کائنات عالم اکبر ہے۔ عالم اکبر کی حیات عالم اصغر کی صلاح و فلاح پر قائم ہے۔ اگر عالم اصغر کا نظام بگڑ جائے تو عالم اکبر کا نظام بھی درہم برہم ہونے لگتا ہے، بانیٔ آریہ سماج تحریک پنڈت دیانند سرسوتی نے جب اسلام کے عقیدۂ آخرت و قیامت پر اعتراضات کیے تو حضرت نانوتوی نے ان کے جو جوابات دیئے وہ انتصار الاسلام نامی کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں حضرت نانوتوی فرماتے ہیں:

''اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم اور کائنات چند اجزا اور اجزا کے ایک مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح جسم انسانی مختلف اعضاء و جوارح: آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ الگ الگ مقاصد اور مختلف اغراض کے کام آتے ہیں اسی طرح مجموعۂ کائنات کے اجزاء مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ اور دریا وغیرہ بھی مختلف اغراض اور الگ الگ مقاصد کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔۔۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ مجموعۂ کائنات کو انسانی جسم کے ساتھ بہت حد تک مشابہت و یکسانیت حاصل ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے اپنی خاص اصطلاح میں کائنات کو شخص اکبر یا عالم اکبر اور جسم انسانی کو اس کے مقابلے میں شخص اصغر یا عالم اصغر سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح ''شخص اصغر'' انسان کے جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے باعث اس کے مزاج اصلی اور اعتدال میں کوئی تغیر و فساد رونما ہو جائے تو اسے مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح ''شخص اکبر'' کائنات کے مزاج و ترکیب میں کسی طرح کا تغیر و فساد رونما ہو جائے اور کوئی نئی اور انوکھی کیفیت ظاہر ہو جائے تو اسے اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کے مرض یا بہ الفاظ دیگر علامت قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تغیر و فساد اور مرض میں اگر اتنی شدت پیدا ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں انسان

(۲) تلخیص حجۃ اللہ البالغۃ از سید رضی الدین احمد ص ۷۶۔۷۷

کہ روح جسم سے الگ ہو جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے اسی طرح کائنات کی ترکیب میں بھی اگر ایسا خلل پیدا ہو جائے جس کے نتیجے میں اس کی روح کو اس سے الگ ہونا پڑے تو اسے اسلامی تعلیم کی رو سے قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جیسے موت کے بعد انسانی جسم جن عناصر سے مرکب ہوتا ہے وہ الگ الگ ہو کر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں اسی طرح "عالم اکبر" اور "شخص اکبر" کائنات کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے شیرازۂ ترکیب میں شامل ہر جزہر عنصر اور ہر طبقہ بھی اپنی اصل سے جا ملے گا، چنانچہ نیکی اور نیکیوں کا عنصر وطبقہ جنت میں اور ہر برائی اور بروں کا عنصر وطبقہ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اسی عمل کو اسلام میں جزاوسزا، حساب وکتاب اور پھر جنت وجہنم میں جانے کے مرحلے سے تعبیر کیا گیا ہے"۔ (۳)

مولانا نانوتوی کے فلسفہ کی رو سے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد خالق کائنات کے نزدیک اس کی صفات کا عرفان اور اس کی عبادت کی تکمیل ہے۔ اس لئے ایک ایسی ذات کی تخلیق پر اس کا نقطۂ کمال پہنچتا ہے جو خدا کی صفات کا عکس لئے ہوئے ہو اور عبدیت کاملہ سے متصف ہو، وہ ذات رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کی جامع صفت علم ہے جو ذات علم کے بھی اعلیٰ درجے پر ہو اور عبدیت کے بھی بلند ترین مقام پر ہو وہی کائنات کا نقطۂ عروج ہے لیکن اب جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی اور دین کی تکمیل ہو گئی تو کیا باقی رہ گیا، اس کے بارے میں حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ:

"اس دین کا عام ہونا اور عبدیت کاملہ کا عام عرفان واتباع ہونا باقی رہ گیا ہے جب یہ کام پورا ہو جائے گا تو اس وقت یہ کارخانہ عالم لپیٹ دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی"۔

مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں:

"خاتم المراتب ہونے کا درجہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں وہ صفت موجود ہو جسے خاتم الصفات کہا جاتا ہے یعنی صفت علم گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جس ذات میں صفت علم بہ درجہ کمال پائی جائے گی اسی ذات کو خاتم المراتب ہونے کا شرف حاصل ہوگا اور پھر وہی عبادت کاملہ یعنی خدا کی تمام صفات کے مقابلے میں بالاجمال اظہار عجز و نیاز پر قادر ہوگی... غرض کارخانہ عالم کی تخلیق کا مقصد

(۳) انتصار الاسلام صفحہ ۵۱، بحوالہ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم مئی ۱۹۹۸

عبادت کاملہ جب پورا ہو جائے گا تو اسے ختم کر دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی... پھر جب خاتم النبیین اور عبد کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود مسعود کے نتیجے میں عبادت کاملہ وجود میں آچکی۔ اس لئے اب کائنات کے بقا کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ اب صرف ایک چیز کا انتظار ہے کہ دین خاتم النبیین پورے عالم پر ایک بار چھا جائے، اس کام کے پورا ہوتے ہی شیرازہ کائنات بکھیر دیا جائے گا اور اسلامی تعلیمات وعقائد کی رو سے قیامت قائم ہو جائے گی۔ (۴)

انسان وکائنات کے وجود کے بارے میں مذکورہ خیالات بہت واضح ہیں اور یہ منزلیں ہیں جن کا ہمارے وجودی فلسفیوں کو شاید خیال تک نہیں۔ وہ حقیقت میں جب خالق وجود تک نہیں پہنچتے تو وجود تک کیسے پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اس راہ میں اول وآخر رہنما رسول اللہ کی ذات بابرکت ہے اس کا عرفان حاصل کئے بغیر یہ گتھی سلجھ ہی نہیں سکتی۔ وجود وموجودات کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کی وجودی صفات کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کے افکار تقریر دل پذیر اور دیگر متعدد کتب ورسائل میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ کہ کوئی صفت بعض اشیاء میں اصلی ہوتی ہے اور بعض میں عطائی اور بالعرض جیسے گرمی سورج اور آگ میں بالذات ہے مگر ان کے وسیلے سے جن چیزوں میں پیدا ہوتی ہے ان میں حرارت اصلی نہیں بلکہ بخشی ہوئی ہے۔ اسی طرح وجود کی صفت اللہ تعالیٰ کے لئے اصلی ہے اور دیگر تمام اشیاء وذوات کے لئے اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اس لئے حقیقی وجود اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور باقی دیگر وجود عارضی اور عطا کئے ہوئے ہیں، مولانا نانوتوی کی رائے میں صوفیہ کے وحدت الوجود کا یہی مطلب ہے کہ حقیقت میں وجود اصلی ایک ہی ہے۔ حضرت نانوتوی کے نزدیک اس معنی میں وحدت وجود تو صحیح ہے لیکن موجودات میں کثرت ہے، ان میں وحدت سمجھنا غلط ہے، فرماتے ہیں:

وحدت موجودات ایک امر مشہور ہے مگر واقعی نہیں ہے، البتہ وحدت وجود امر واقعی ہے''(۵)

لفظ وحدت الوجود سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں مگر حضرت نانوتویؒ کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے (ابھی یہ موضوع مزید بسط وشرح چاہتا ہے مگر تطویل کے خوف سے اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے)

(۱) انتصار الاسلام بحوالہ ماہنامہ ترجمان دار العلوم نئی دہلی رجون ۱۹۹۸۔ (۱) جمال قاسمی۔ (۵) جمال قاسمی۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: إنما أنا قاسم والله يعطي

Life and Thoughts of

Ḥujjat al-Islām Imām Muḥammad Qāsim Al-Nānawtawī

Founder of Darul Uloom Deoband

By

Atif Suhail Siddiqui, (Ph. D.)

Deoband Institute of Islamic Thought, Deoband

TARIQUL ISLAM RESEARCH PROJECT

This book is published under DIIT's Tariqul Islam Project.

Tariqul Islam Research Project was launched after the name of a sincere young boy from Bangladesh, who was keen to learn the Holy Qur'ān and Islamic values. Tariqul Islam was born to a Bangladeshi business family. He had been living in Malaysia since his birth (b. 1996) until his sudden accidental death (d. 2009) that shattered his parents Mr. Shahidul Islam and Mrs. Nilima Islam. For commemorating their son's dedication to Islamic values and learning, they are supporting one of the research projects at DIIT.

© Author

2016 CE

Published by
Center for Research and Translations,
Deoband Institute of Islamic Thought
Deoband, 247554, UP, INDIA

Serial No 2014-001

Printed by
Faisal Publications
Jama Masjid, Deoband, 247554, UP, INDIA

FOREWORD

Ḥujjat al-Islām Imām Muḥammad Qāsim Al-Nānawtawī is considered as one of the most influential thinkers of all times. The Islamic seminary and the global think-tank, Dārul 'Ulūm, at Deoband, established by him, has attained today an iconic status in diverse realms of academic and intellectual thought and ideology, retaining to a great extent the erudition and glory of the Muslim scholars of the previous generations. Undoubtedly, the genius Al-Nānawtawī is a multidimensional figure, who wears many hats. A theologian, a master of ḥadīth, a philosopher, an educationist, a reformer, a political scientist, a social thinker, and a freedom fighter, Al-Nānawtawī had played remarkable roles in most of the Islamic disciplines, and social awakening in his time and exerted profound impact on the history of education and philosophy on a global scale.

Al-Nānawtawī developed in the 19th century a host of philosophical and political thoughts and ideologies that helped shape Islam better in a more consistent way in modern times. Al-Nānawtawī believed that Islam has the ability to accommodate and reorient itself in all walks of life and in all ages through interpreting the vast wealth of Islamic sources. Al-Nānawtawī asserts that Islam, due to its universality and divinely inherent flexibility, is the only religion

that can accept all challenges which many of the world religions have failed to address. Al-Nānawtawī's deep philosophical applications and doctrinal interpretations need highly investigative research papers, and serious critical studies by scholars to thoroughly explore the rich legacy transferred by him to the Deobandi School of Thought. Since this age is characterized as the age of logic and reason, philosophy and analogy, any work on Al-Nānawtawī or his legacy becomes increasingly relevant and important.

Unfortunately, the lives and works of Al-Nānawtawī and other scholars and thinkers of Deoband School were given very little significance in terms of academic research and analysis. Their thoughts and ideologies, their philosophical and analytical approaches, and their academic contribution in different fields of human endeavor were left, and still are, unanalyzed and uninvestigated, though there are a few fresh theses and research papers accomplished by a few research scholars in the Indian subcontinent and abroad in recent times.

One of the recent works accomplished in this field of Deobandi Thought is the book of Dr Atif Suhail Siddiqui titled as "Life and Thoughts of Ḥujjat al-Islām Imām Muḥammad Qāsim Al-Nānawtawī, Founder of Darul Uloom, Deoband." Dr Siddiqui, a PhD in Comparative Religion form the International Islamic University Malaysia, has been, since his early days as student,

intellectually, largely through theology *(kalām)* and philosophy *(falsafah* or *hikmah)*, against Muslim and Hindu modernism as well as Christian missionary work; three, as a Sufi master."[1]

Al-Nānawtawī's self-assertion movement and his religious philosophy redeveloped religion's importance for defining the social and political fabrics of Muslims in the Indo-Pak subcontinent.

The most important factor in the development of Al-Nānawtawī's personality is his balanced thinking. As a political leader, he was actively engaged in the war against the British imperialism and wanted to liberate his home country from external aggression and occupation. Secondly, as a social reformist, he initiated several social reform movements and thirdly as a neo-philosopher, thinker and polemicist, he served knowledge and Islamic religious sciences. Thus, Al-Nānawtawī's entire life was three dimensional. While his thoughts in religious, political and social reforms were single dimensional, they were premised upon Islam's fundamental teachings and traditions of the Holy Prophet (saws). The exceptionality of Al-Nānawtawī's thought is its functionality in the practical fields of human life. Instead of merely philosophical ambiguity and gnomic, Al-Nānawtawī's thoughts are pragmatic in social, religious and political arenas. His thoughts are erected upon the paradigms from the character *(sīrah)* of the Messenger of God (saws) and his pious companions.

In fact, Al-Nānawtawī was the last bearer of the legacy of Walī-Allāh of Delhi. Al-Nānawtawī picked the essence of Walī-Allāh's cultural, social, political and religious thoughts and believed that Muslims cannot give up their right to rule the land of God. But the module of the governance of Muslims needs appropriate strategy and it is not merely diplomatic and political. He also observed that at the time of political suppression, intellectual superiority, governed by a sublime Islamic ideology, should be maintained. At any rate, Muslims should never lose their link with their intellectual heritage; community's connection with intellectual heritage is the best fight against social, political and cultural anomalies.

According to Al-Nānawtawī's belief, political suppression is timely, while intellectual loss is more disastrous and dangerous as its impacts are long lasting. Al-Nānawtawī insisted on the changing nature of strategy and policy. He himself produced the paradigms of changes. His life may be categorized in three different phases. The first phase of his life is full of political struggle, while in the second phase, he changed his policies and engaged in polemics with Christian and Hindu missionaries and in addition, continued several revival movements and the third and most successful phase of his life is the intellectual and academic revolution, for which he became most famous. But, in all three phases of his life, Al-Nānawtawī always was struggling for a Muslim political and intellectual superiority.

Thus, the paradigms left by Al-Nānawtawī became footprints for his successors who sporadically and permanently were engaged in different political movements. But none of his successors ever differed from the main maxim, which Al-Nānawtawī had set for them in the last stage of his life. The maxim was centered on bringing back the Muslims to cling to the religio-cultural heritage, preserved for them in the intellectual legacy of Islam.

This short biography is composed by taking into account the several authentic sources. The most important among them is *Sawāneḥ Qāsmī*; this is the first official biography of Al-Nānawtawī, produced by Darul Uloom Deoband itself. The author of this voluminous biography is Mawlānā Manāẓir Aḥsan Gīlānī. This biography is written in Urdu. Also, I have used *The History of the Dar al-Ulum Deoband*, written by Sayyid Mahboob Rizvi originally in Urdu and later translated in English by Prof Murtaz Husain F Quraishi. This is the official history of Darul Uloom Deoband, and it also carries the short biography of Al-Nānawtawī. I have also benefited from a small piece, but a very important one, written by Al-Nānawtawī's contemporary Mawlānā Yā'qūb Nānawtawī (d. 1302 AH) under the title of *Ḥālāt-e Ṭayyib Janāb Mawlānā Muḥammad Qāsim Ṣaḥib*. This was the very first biography of Al-Nānawtawī, which was written immediately after his death in 1880 CE. I have also used other sources. A comprehensive bibliography is appended to the last. I have used

standard transliteration method for Arabic, Persian and Urdu terms and names. For the Seminary established by Al-Nānanwtawī in Deoband, I have used official name 'Darul Uloom Deoband' and at some places with the transliteration "Dār al-'Ulūm"

I am grateful to the librarian of Imām Muḥammad Qāsim Library of Darul Uloom Waqf Deoband for providing me with the required materials. Also, I acknowledge the moral support extended from my mother whose prayers are my sole strength, as well as the moral support from my wife. Also, I pay my gratitude to my younger brother, Haris Suhail Siddiqui, Elgin, USA. Haris provided funds for meeting the expenditures during the writing of the script of this book. I express my deep gratitude to Mufti Muhammad Anwar Khan Qasmi, Editor-in-Chief of Islamic Literature Review, *An International Journal of Islamic Revival.* Mufti Anwar Khan proofread, and revised the complete book before sending it to the press. He enormously helped me with his valuable suggestions and wrote foreword. Dr. Yasir Nadeem al-Wajidi's valuable contribution cannot be neglected. Dr. Nadeem was insistent in emphasizing the importance of this biography. I also acknowledge the support and help of my friend Naved Siddiqui, Manager, Communication and Planning at DIIT, who implemented all steps for shaping the script into the form of a book including title designing and then publication. I pay my gratitude to all those people who by any means helped me complete this small

piece, which is definitely a drop in an ocean, especially when the biography of the most eminent Islamic figure of the19th century is being tried to be covered.

Endnote

[1] Fuad Shahid Naeem, *The 'Ulumu of the Indian Subcontinent at the Rise of the Modern Age: Maulana Ashraf 'Ali Thanvi and His Response to Modernism,* (MA Thesis, George Washington University Lib., 2003). pp. 30-31.

اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے ''مقالات حجۃ الاسلام'' کی 17 ویں اور آخری جلد آج مورخہ ۱۷ ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ بمطابق ۸ اگست ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ مکمل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو محض اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور جو علم دوست احباب اس عظیم علمی کام میں معاون بنے رب العزت انہیں اپنی شایانِ شان جزا سے نوازیں اور ہمیں آخری سانس تک اپنے اکابر کی علمی خدمات کو حرزِ جاں بنائے رکھنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین

والسلام

محمد اسحٰق غفرلہٗ (مرتب وناشر مقالات حجۃ الاسلام)

مقالاتِ حجۃُ الاسلام 17 جلدوں پر ایک نظر

جلد 1

حضرت حجۃ الاسلام
رحمہ اللہ کی سوانح پر
مشتمل اہم مضامین و
مقالات

جلد 2

اسرار قرآنی
انتباہ المؤمنین
تحذیر الناس
مناظرہ عجیبہ
تصفیۃ العقائد
انتصار الاسلام

جلد 3

آب حیات

جلد 4

تحفہ لحمیہ
مصابیح التراویح
الحق الصریح
فی اثبات التراویح
توثیق الکلام
فی الانصات خلف الامام

جلد 5

الدلیل المحکم مع شرح
اسرار الطہارۃ
افادات قاسمیہ
اجوبۃ الکاملۃ
لطائفِ قاسمیہ

جلد 6

اجوبہ اربعین

جلد 7

ہدیۃ الشیعہ

جلد 8

تقریر دلپذیر

جلد 9

قصائد قاسمی
فیوض قاسمیہ
روداد چندہ بلقان
حجۃ الاسلام

جلد 10

گفتگوئے مذہبی
(میلہ خداشناسی)
مباحثہ شاہ جہاں پور
جواب ترکی بترکی
براہین قاسمیہ

جلد 11

قبلہ نما
تنویر النبراس
الحظ المقسوم
من قاسم العلوم

جلد 12

فرائد قاسمیہ
فتویٰ متعلق
دینی تعلیم پر اُجرت

جلد 13

مکتوب گرامی
مضامین ومکتوب الیہ
''انوار النجوم''
اُردو ترجمہ قاسم العلوم
مکتوب اوّل
تخلیق کائنات سے
پہلے اللہ کہاں تھا؟
یعنی مکتوب دوم

جلد 14

مکتوب سوم
مکتوب چہارم
مکتوب پنجم

جلد 15

مکتوب ششم
مکتوب ہفتم
مکتوب ہشتم

جلد 16

مکتوب نہم
مکتوب دہم
مکتوب یازدہم
مباحثہ سفر رُڑکی

جلد 17

جمال قاسمی
مکتوبات قاسمی
(متعلق اسرار الطہارۃ)
حضرت نانوتوی رحمہ اللہ
کے علم وفضل اور
حالات وواقعات پر
متفرق مضامین
حکمت قاسمیہ
سند حدیث (عربی)
علمی خدمات

Our online Islamic Bookstore:
Email Address: talefat@gmail.com
www.taleefat.com
Like us: facebook.com/taleefat

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
0322-6180738, 061-4519240